نومبر 2021 قیمت 15₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:11، نومبر 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

• اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
• ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال
اردو میں سائنسی سماجی موضوعات پر مواد کی کمی ہے — ایم جے وارثی 8

ادب: زاویے اور جہات
صنفی مساوات کا فروغ اور اردو میں معلوماتی ادب کی ضرورت و اہمیت — آمنہ تحسین 11
غزل کائنات کا آئینہ گر شائق مظفر پوری — اختر آزاد 15
امیر خسرو دہلوی کی نقد نگاری — نیلوفر حفیظ 17

ناموران نومبر
مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری پر ایک نظر — تسلیم عارف 21
اقبال پر قصیدۂ بردہ کے اثرات — سعود عالم 23
اکبر اور کمال اکبر — محمد فیصل خان 25

دانش گاہیں/ کتب خانے
خدابخش خان بہادر اوران کی لائبریری — مہتاب جہاں 28
شعبۂ اردو سیوا سدن کالج برہانپور کی ادبی و تحقیقی خدمات — مشتاق احمد گنائی 32

یاد رفتگاں
جنوبی ہند کے نابغہ روزگار سید احمد ایثار — رؤف خیر 34
کلیم عرفی — انور آفاقی 37
علم و ادب کا تابندہ آفتاب قمر سنبھلی — عاکف سنبھلی 39

شوکت حیات افسانہ 'کوبڑ' کی روشنی میں — رضیہ پروین 41
دیارِ دکن کا پروقار قلم کار پروفیسر بیگ احساس — شبیر احمد لون 43

خراج عقیدت
طنز و مزاح کا درخشاں ستارہ ہلال سیوہاروی — سالک دھامپوری 47
علامہ شبلی نعمانی کے نظریۂ تعلیم کی انفرادیت — آفتاب عالم اعظمی 49

عالمی ادبیات
جارج برنارڈ شا کا شاہکار ڈراما 'آرمس اینڈ دی مین' — محبوب حسن 51

کتاب دریچہ
جن کتابوں نے متاثر کیا — راحت علی صدیقی 53

ماحولیات/سائنس
ماحولیاتی انحطاط اور قابل بقا ترقی — شازلی حسن خان 55

فلم
بالی ووڈ فلمیں اور مشاہیر اردو — محمد عارف 57

نیا آسماں نئے ستارے
اکیسویں صدی کی شاعرات بنگالہ اور تانیثی ڈسکورس — سعدیہ صدف 61
مولانا عبدالماجد دریابادی بہ حیثیت تبصرہ نگار — محمد تنظیم عالم 64
جاپان میں اردو — معراج الاسلام 67

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 70

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 79

ہماری بات

سیاست، ثقافت، معاشرت اور معیشت کی سطح پر ترجیحات تبدیل ہو چکی ہیں۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے ماضی کے بہت سے افکار و اقدار پامال اور فرسودہ ہو چکے ہیں۔ نئے عہد میں عصری مطالبات اور تقاضوں کے اعتبار سے ترجیحات کا تعین ہو رہا ہے جس کا اثر سیاست اور معاشرت کے ساتھ ساتھ ادب و ثقافت پر بھی پڑ رہا ہے۔ ماضی کے بہت سے تصورات کی معنویتیں تبدیل ہو چکی ہیں۔ شاعری کی لفظیات/موضوعات، رموز و علائم میں بھی تبدیلیاں ہر کوئی محسوس کر سکتا ہے۔ جیسے جیسے زمانے کی قدریں تبدیل ہوتی رہتی ہیں ادب میں بھی فکری اور فنی سطح پر تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ چونکہ ادب کا براہِ راست تعلق زندگی سے ہے، اس لیے زندگی کے بدلتے طور و طرز کا اثر ادب بھی قبول کرتا ہے۔

ادب بنیادی طور پر زندگی ہی کا ترجمان ہے، عام انسانی زندگی کے مسائل ہی اس کا موضوع بنتے ہیں۔ انسانی زندگی جس نوع کی تبدیلیوں سے گزرتی ہے وہی ادب کا غالب حصہ بن جاتی ہے اسی لیے ادب میں عصریت پر خاص زور دیا جاتا ہے، چاہے شاعری ہو یا فکشن یا کوئی اور صنف، ہر ایک کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اگر ادب زمانے کے مطالبات سے ہم آہنگ نہیں ہے تو اس کی فرسودگی اور پامالی پر مہر لگ جاتی ہے۔ ادب کا مقصد محض تفریح طبع نہیں بلکہ اس کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ یہ فکری اور ذہنی تبدیلی کا سب سے موثر ترین ذریعہ ہے۔ اگر ادب کے ذریعے یہ عمل انجام نہیں دیا جاتا تو اس کی افادیت اور معتبریت مشکوک ہو جاتی ہے۔

آج کے زمانے میں جو ادب لکھا جا رہا ہے اس کے حوالے سے یہ سوال بہت اہم ہے کہ وہ عصری موضوعات و مسائل سے کس حد تک ہم آہنگ ہے اور اس کا افادی پہلو کیا ہے؟ بے معنی فلسفوں اور نظریات و تصورات کی تبلیغ و ترسیل ادب کا مقصد نہیں ہے، ادب کے مقاصد کا دائرہ وسیع تر ہے۔ اگر یہ صرف چند مخصوص حلقوں یا ذہنوں تک محدود ہے تو پھر ایسے ادب سے کیا فائدہ؟ دراصل ادب کا بنیادی مقصد عوامی ذہن کی تبدیلی اور اس کے اندر سماجی، ثقافتی، سیاسی شعور کی بیداری ہے۔ فکری تبدیلی کے بغیر ادب کی مقصدیت منہدم یا معدوم ہو جاتی ہے۔ ایسے میں یہ خیال بہت اہم ہے کہ ہمارے یہاں جو ادب لکھا جا رہا ہے اس کا دائرۂ اثر کیا ہے، اس کی رسائی کہاں کہاں تک ہے، کیا یہ ادب خاص ذہنیت، سماج یا طبقے کی نمائندگی کر رہا ہے یا اس میں معاشرے کے تمام طبقات اور ان کے مسائل شامل ہیں۔ یہیں یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ معاشرے کی ذہنی اور فکری تبدیلی کے لیے جو کتابیں ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں کیا اس طبقے تک پہنچ پاتی ہیں جسے ان کتابوں کی شدید ضرورت ہے یا وہ طبقہ ایسی کتابوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہمارے یہاں مسئلہ کتابوں کی اشاعت کا نہیں بلکہ قارئین کا ہے اور عام حلقے تک ان کتابوں کی رسائی کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کتابیں عوام تک نہیں پہنچ ہی نہیں پاتیں جس کی وجہ سے کتابوں کا افادی دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مربوط اور منظم نظام بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے کتابوں کی نارسائی ایک عام سی بات ہو گئی ہے۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ کتابوں کی عام لوگوں تک رسائی کو ممکن بنایا جائے اور اس کے لیے اردو اشاعتی اداروں کے ساتھ ساتھ تنظیموں اور اداروں کو بھی کوشش کرنی چاہیے۔ دنیا بھر میں کتاب میلوں کے انعقاد کو اسی نوع کی کوشش کے طور پر دیکھا جاتا ہے، پھر بھی متواتر اور مسلسل کتاب میلوں کے انعقاد کے باوجود کتابوں کی رسائی ہر خاص و عام تک ممکن نہیں ہو پاتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ کتاب کلچر کا احیا کیا جائے اور لوگوں میں کتابوں کے تئیں شوق اور بیداری پیدا کی جائے، ملک کے مختلف علاقوں میں لائبریریاں قائم کی جائیں، انھیں ہر ممکن تعاون دیا جائے۔ بہت سے چھوٹے علاقوں میں لائبریریاں قائم ہیں مگر ان کے پاس وسائل کی کمی ہے، جس کی وجہ سے وہ بہت سی اہم اور قیمتی کتابوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسے چھوٹے علاقوں پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہماری نئی نسل کا بھی کتابوں سے رشتہ جوڑنا ضروری ہے کیونکہ انٹرنیٹ کے تفریحی پروگرام نے شاید انھیں کتابوں سے بیزار کر دیا ہے جس کی وجہ سے مقصدی اور افادی ادب کا بہت خسارہ ہو رہا ہے، اس لیے ہماری نئی نسل کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ لازمی ہے کہ وسیع تر پیمانے پر کتاب کلچر کے احیا کی کوشش کی جائے کیونکہ اگر کتابیں نہیں رہیں تو ہمارا پورا سماج ایک شہر خموشاں یا قبرستان میں تبدیل ہو جائے گا۔

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (اداره)

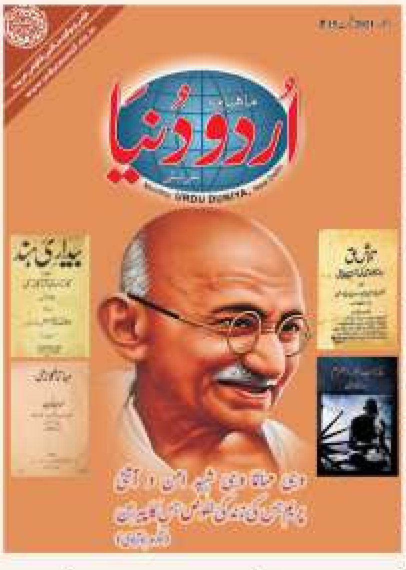

ہر مدیر کا یہ خواب ہوتا ہے کہ مجلّہ کو خوب سے خوب تر بنائے۔ مدیر اور مشیر نے اس خواب کو تعبیر دی اور اردو ادب کا یہ مینار مینارۂ نور بن گیا۔ ادب میں اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ یہ رسالہ نثری ادب کا رکھوالا ہے۔ محققین و ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ مشعل راہ ہے۔ اردو دنیا، اردو ادبی دنیا کی بے مثال پیش کش ہے۔ اس ماہ پیدا ہونے والی شخصیت مہاتما گاندھی کو بھرپور خراج ہے اور اداریہ بھی مہاتما گاندھی پر ہے۔ دو مضامین ان پر شامل ہیں مگر اس ماہ دو شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ 2 اکتوبر کو لال بہادر شاستری نے بھی جنم لیا۔ ایک مشہور نغمے کے بول ہیں۔

آج 2 اکتوبر کا دن ہے — آج کا دن ہے بڑا مہان
آج کے دن دو پھول کھلے — جس سے مہکا ہندوستان

اس ماہ میں پیدا ہونے والی شخصیتوں پر چند مضامین ہونا چاہیے۔ اس ماہ میں امتیاز علی تاج، رام پرکاش راہی، غلام السیدین، سرسید احمد خاں، یاس یگانہ چنگیزی، ملک زادہ منظور احمد، اسرارالحق مجاز، ندا فاضلی، پنڈت آنند نرائن ملا، راج نارائن راز، ڈاکٹر ابن فرید، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ احمد فاروقی، بہادر شاہ ظفر، اے پی جے عبدالکلام وغیرہ۔

ادب زاویے اور جہات کے تحت 'اردو اور ہندوستانیت' بانو سرتاج کا مضمون ہے۔ انھوں نے ہندوستانیت کیا ہے پر بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں تجزیہ کیا ہے اور ساتھ ہی ہندوستان کو مختلف مذہبوں کا سنگم کہا کیونکہ یہ قابل احترام شخصیتوں کا ہندوستان ہے۔ 'اردو میں مکتوب نگاری' میں اسلم جمشید پوری نے بعض نئے گوشے وا کیے۔ غالب سے پہلے رجب علی بیگ کے خطوط کا تذکرہ کیا۔ اڑیہ شاعر امجد نجمی پر عبدالحی پیام انصاری نے مختصر جائزہ لیا ہے۔ سائنس اور ادب کے امتیازات میں معید الرحمٰن نے ادب کے امتیاز کو بتایا ہے۔ ساحر لدھیانوی پر دو مضامین ہیں۔ عمران عراقی نے 'ساحر لدھیانوی ایک مقبول اور حقیقت پسند شاعر' پر خوب لکھا۔ بقول ساحر لدھیانوی

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں — جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

یہ شعر نہ صرف ساحر پر بلکہ ہر کسی ادیب و شاعر کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ 'ساحر لدھیانوی بطور بچوں کا شاعر' سالک جمیل براڑ نے خوب لکھا۔ بہت ہی کم ادیبوں نے بچوں کی شاعری کا جائزہ لیا۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا — انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

یادِ رفتگاں میں اسلم عمادی نے شمس الرحمٰن فاروقی پر تفصیل سے لکھا اور کئی نئے گوشے وا کیے۔ عربی ادبیات کے ذریعے اردو والوں کو ایک اچھی سوغات ہے۔ اسی طرح فارسی ادبیات پر بھی ہونا چاہیے۔ 'نیا آسماں نئے ستارے' میں محمد عارف کا 'اردو شاعری میں تلمیحات کا لفظی اور معنوی آہنگ' لاجواب ہے۔ تلمیحات پر بہت کم کام ہوا ہے۔ انھوں نے جو لکھا وہ سچ ہے، ملاحظہ ہو:

تلمیحات ادب کی جان ہیں اور بس ادب کی پہچان بھی ہیں جو بیک وقت قوم کے احوال و آثار ان کی تہذیب و ثقافت، سماجی ضروریات، معاشی ہم آہنگی اور معاشرتی رہن سہن کو پیش کرتا ہے۔'' 21 نگارشات (مضامین مقالے)، 10 تبصرے، 6 خطوط، ادبی سرگرمیاں اور آخری صفحات پر وفیات دیکھ کر اور پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کیسے

کیسے لوگ تھے جو ہم سے جدا ہو گئے... ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سے کہیں جسے۔ سو صفحات کوزہ میں سمندر بند کرنے کی کوشش کی۔

☜ **ڈاکٹر م ق سلیم**: سائبان 469-2-19، بیرون دروازہ، حیدرآباد، تلنگانہ

✍ ماہنامہ اُردو دُنیا (دہلی) کا تازہ شمارہ (اکتوبر 2021) نظر نواز ہوا سرورق پر مہاتما گاندھی کی مسکراتی ہوئی رنگین جاذب نظر تصویر اس قدر پرکشش اور فطری ہے کہ سرورق کاٹ کر فریم میں لگانے کو جی کر رہا ہے شمارہ ہذا میں شامل تمام ہی مضامین اور تبصرے حسب سابق وقیع اور معلوماتی ہیں تاہم اسلم عمادی کا مضمون 'شمس الرحمٰن فاروقی: ایک دُرِ نایاب'، عمران عراقی کا مضمون 'ساحر لدھیانوی: ایک مقبول اور حقیقت پسند شاعر'، سالک جمیل براڑ کا مضمون 'ساحر لدھیانوی: بطور بچوں کا شاعر'، درخشاں تاجور کا مضمون '1857 کی جنگ آزادی کا عظیم سپہ سالار: بخت خاں' عظیم انصاری کا مضمون 'جنگ آزادی کا ایک عظیم مجاہد: مولوی سید علاوالدین حیدر' ان مضامین نے کافی متاثر کیا محمد اکرام کی صلاح الدین پرویز پر لکھی ہوئی تحریر اس شمارے کی سب سے متاثر کن تحریر ہے محمد اکرام نے صلاح الدین پرویز کی یادوں باتوں اور ملاقاتوں کو جس خوبصورت اور دلکش انداز میں سمیٹا ہے اس کے لیے محمد اکرام قابل تعریف ہی نہیں قابل تحسین ہیں۔

☜ **منظور وقار**: یاڈاڑ کالونی گلبرگہ۔ 585104، کرناٹک

✍ 'اردو دنیا' ستمبر 2021 موصول ہوا۔ سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ سکون پرور رنگین مجلّہ کوئی 13 اصنافِ سخن اور زائد از 27 ذیلی اصناف کے دعوتِ مطالعہ دیتا ہے جو سنجیدہ مسائل، ان کے حل اور تفننِ طبع جیسے موضوعات سے معمور ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ دیگر زبانوں یعنی ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں خصوصاً انگریزی میں اردو زبان و ادب کے محاسن و معائب پر بھرپور تبصرے بھی شائع ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اکثر اردو والے ان سے لاعلم ہیں کیونکہ سوائے اردو کے دیگر جرائد ہمارے زیر مطالعہ نہیں رہتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس جانب سنجیدگی سے اپنی توجہ مبذول کریں اور ہر لسانی صوبے میں ایسے ادبا ضرور ہوں جو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہوں۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ہم اپنا قیمتی اثاثہ دوسری زبانوں میں منتقل کریں لیکن یہ ذرا دشوار مرحلہ ہے۔ مثلاً انگریزی یا کسی اور زبان سے اردو میں ترجمہ کرنا آسان ہے، پر اردو سے انگریزی یا کسی اور زبان میں ترجمہ کی خاطر دونوں زبانوں پر کامل قدرت ہونا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ پھر بھی جہاں چاہ وہاں راہ۔ (ص 4)

'ربط و التفات' (ص 5 تا ص 7) کے ذیل میں کوئی چھ مراسلے دیے گئے ہیں۔ دیکھیے ان میں کون کون سے مشورے یا تجاویز قابل اعتنا ہیں۔ 'ادب: زاویے اور جہات' (ص 9 تا ص 33) میں قابل قدر آٹھ مقالہ جات درج ہیں۔ ان میں مقالہ بعنوان 'اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی پیش رفت' (ریاست اوڈیشہ کے حوالے سے) از جناب سعید رحمانی صاحب (ص 12 تا ص 15) قابل توجہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تنقید میں آمرانہ فیصلہ صادر کرنے کے بجائے کسی تخلیق کے محاسن و معائب کو معروضیت سے مدلل انداز میں پیش کیا جانا چاہیے اور یہ بھی کہ اردو ادب میں جو تحریکیں یا رجحانات وارد ہوئے ہیں اس مضمون میں ان کے حدود کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور بھی ایسے کئی نکات ہیں جو پڑھنے سے بالضرور تعلق رکھتے ہیں۔ یہ درحقیقت اساتذہ اور طلبا کے لیے نہایت ہی اہم اور فائدہ مند سبق ہے اور حاصل شمارہ کہلانے کا مستحق ہے۔ 'لعل و گہر' (ص 34 تا ص 45) میں چار مشاہیر کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ غیر معروف قابل ادیبوں کی روداد کہیں پڑھی بھی جائے تو محض کچھ عرصے تک یاد رہتی ہے کیوں کہ ایسے نوشتوں میں پیشکش اور انداز بیان اور بیانیہ کی ہیئت نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ جتنے پر زور ہوں گے ویسے ہی از بر رہیں گے۔ لعل و گہر میں بھی چاروں مضامین اپنے انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ زخ ش (زاہدہ خاتون شروانیہ) از ڈاکٹر افشاں ملک اس مقالے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس کی عبارت بڑی ہی دل پذیر ہے اور حالات و واقعات و کلام کو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لیے زخ ش عرصہ دراز تک فراموش نہ ہو سکیں گی۔ 'یاد رفتگان' (ص 46 تا ص 52) میں دو مرحومین کے کلام اور دلیپ کمار (مرحوم) کی روداد پیش کی گئی ہے۔ یہ تینوں اچھے مشمولات ہیں۔ ان میں دلیپ کمار کے حالات حیات کو دلپذیر انداز میں قلم سنبھال کر پیش کیا گیا ہے۔ 'تہذیب و ثقافت' (ص 53 تا ص 56) میں اُردو لوک گیتوں کے امتیازات بتائے گئے ہیں۔ یعنی لوک گیت جو مٹی کے گھروں سے غم اور خوشی کے سُروں سے ابھرتے ہیں۔ اچھا مضمون ہے ضرور پڑھیے۔ 'سلسلۂ صحافت' (ص 57 تا ص 61) میں دو صحیفے ہیں۔ ایک تو 'اُردو میں کالم نگاری' کہ کالم نویسی کا آغاز و ارتقا بہ تفصیل پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مشہور زمانہ نمائندہ کالموں کا 25 سرخیوں پر مشتمل ایک جدول (Table) بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس کی مدد سے کالم نویسی کا تسلسل بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ دوسرے مضمون میں ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد (تلنگانہ) کے ماہنامہ 'سب رس' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ طویل مقالہ ہے جو معلومات سے لبریز ہے۔ خود ہی مطالعہ فرمالیں۔ 'کتاب دریچہ' (ص 62 تا ص 63) میں جناب خطاب عالم شاد نے لکھا ہے کہ 'جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا'، اس روداد کی ابتدا انھوں نے اپنے بچپن سے کی۔ ان کتب میں ہدیٰ ڈائجسٹ، داستان یوسف، کئی افسانے، فیض احمد فیض کے اشعار وغیرہ شامل ہیں۔ 'تجارت و معیشت' (ص 64 اور ص 65) میں عہد وسطیٰ کے دیہی بازار اور زرعی پیداوار پر بات کی گئی ہے۔ جن لوگوں کو قدیم معیشت سے دلچسپی ہو ان کے لیے یہ ایک دلچسپ مضمون ثابت ہوگا۔ 'گفتگو' (ص 66 تا ص 68) میں 'انس مسرور انصاری سے ایک ملاقات' ایک انٹرویو ہے اور اچھا ہے۔ اس کے مطالعے سے قارئین کے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ پڑھ لیں، کیا مضائقہ ہے۔ 'تشریح و تجزیہ' (ص 69 تا ص 75) میں غالب کے تین غیر متداول اشعار کی تشریح اور سلطان حیدر جوش علیگ کے افسانہ 'اتفاقات زمانہ' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غالب کے اشعار میں الفاظ و معنی کی اطمینان بخش صراحت کی گئی ہے۔ تحقیقی مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ افسانہ 'اتفاق زمانہ' میں افسانہ کے محور/نقطۂ نظر، اس کے پلاٹ، منظر و کردار نگاری، رومانیت، طنز کے عنصر مکالمہ، زبان و بیان اور نقطۂ عروج پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ 'کتابوں کی دنیا'

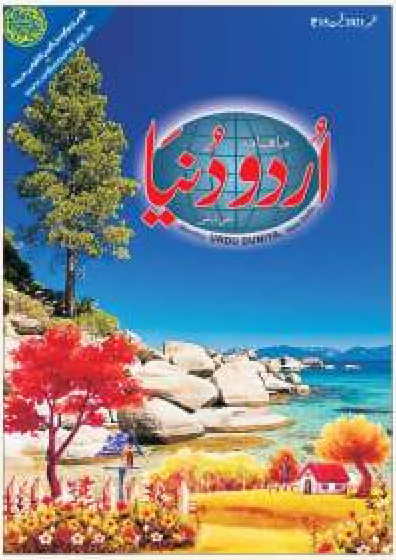

(ص 76 تا ص 84) کے تحت کوئی درجن بھر کتب کے تبصرے شامل ہیں تاکہ ان میں سے آپ تبصروں کی روشنی میں مفید مطلب کتاب یا کتب کا انتخاب کر کے واجبی قیمت پر حاصل کرسکیں۔ 'خبرنامہ' (ص 85 تا ص 98) کے ذیل میں قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں، آزادی کے موقع پر تقریب پرچم کشائی، اردو تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں درج کی گئی ہیں۔ اتنا قیمتی خزانہ مہینہ بھر کے لیے کافی ہے۔

❖ **مصطفیٰ ندیم خان غوری**: بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ 'اردو دنیا' اگست 2021 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ آپ کے رسالے نے اردو ادبی صحافت کے لیے ایک نئی سمت متعین کی ہے، ایک خاص معیار مقرر کیا ہے، سنجیدہ ادب کو مقبول بنانے کا پیمانہ عطا کیا ہے۔ ایک عام قاری کے لیے بھی تحقیق وتنقید کے خشک موضوعات کو دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کا سامان فراہم کیا ہے۔ اتنی ساری صفات کا مجموعہ ہی 'اردو دنیا' ہے۔ ایک سو صفحات کے رسالہ میں اتنا سارا مواد یکجا کردیا جاتا ہے کہ دریا کی بجائے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ اختراع کرنا ہوگا اور یہ فن اور ہنر کوئی آپ لوگوں سے سیکھے۔ اس کے لیے مجلس ادارت کے تمام اراکین لائق ستائش اور قابل مبارکباد ہیں۔

مذکورہ شمارے میں تحقیق کی مبادیات کو غضنفر صاحب نے عام فہم انداز میں بیان کردیا ہے۔ میرابائی اور چکبست کی نظم پر مضامین ہندوستان کی روح کو پیش کرتے ہیں۔ یادرفتگاں کے تحت سہیل اختر، رتن سنگھ اور نسیم انہونوی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ دراصل محسنانِ اردو ہیں۔ درس وتدریس کے جدید طریقۂ کار پر مضامین آپ کے رسالہ کا خاصہ ہے۔ تنقیدی مضامین میں مختلف علاقوں کی نمائندہ تخلیقات کا جائزہ بھی خوب ہے۔ مشتاق رفیقی نے اپنے مضمون 'تمل ناڈو میں اردو افسانہ' میں اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہاں کے اکثر افسانوں میں وعظ ونصیحت اور اصلاح کا پہلو غالب ہے جس سے افسانے کا فن مجروح ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کا یہ رسالہ صحیح معنوں میں اسم بامسمیٰ ہے کہ اردو دنیا کی اکثر و بیشتر خبریں اس کے ذریعے ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو زبان ادب کا قاری اگر کوئی دوسرا رسالہ نہ بھی پڑھے۔ صرف اس رسالے پر اکتفا کرلے تو بھی وہ اردو دنیا سے بے خبر نہیں کہلائے گا۔

❖ **ڈاکٹر حیات افتخار**: سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، قائد ملت کالج، میڈاوا کم چنئی

✍ جولائی 2021 کا شمارہ آن لائن ہی مطالعہ کیا۔ اردو کی جید شخصیتوں کی رحلت پر اظہارِ تعزیت وتاسف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ گذشتہ چند مہینوں میں جن شخصیات کی وفات ہوئی وہ ہمارے معاشرے کے لیے بیش قیمت اثاثہ تھیں۔ نقد ونگاہ کے تحت 'چیخ تنتر تہذیب وتاریخ کے آئینے میں' شاذیہ عمیر نے لکھا ہے کہ پنچ تنتر کی کہانیوں نے انسان کو یہ درس دینے کی کوشش کی ہے کہ سیاسی مسائل ہوں یا معاشی الجھنیں سماجی رشتوں کی گتھیاں ہوں یا نظام حکومت کی پیچیدگیاں ان کے حل کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ صابر علی سیوانی نے اپنے مضمون 'فلسفہ موت کی شعری تشریحات' میں جن اشعار میں موت کے تصور کا ذکر ہے ان کی تشریح صراحت سے کی اور مختصر جائزہ لیا ہے۔ غالب، میر، فانی وغیرہ کے یہاں موت کا تصور ملتا ہے۔ قدوس جاوید نے 'کشمیری درد آشنا ترنم ریاض' کے فکر وفن شاعری اور شعریت پر اظہار کیا ہے۔ ناصرالدین انصار نے 'شگفتہ مزاج نقاد ڈاکٹر صفدر' میں ان کی شخصیت کے بارے میں اچھا لکھا۔ میگزین میں بقیہ مضامین بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔

✍ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد،

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' بہت خوبصورت انداز سے شائع ہورہا ہے۔ اس میگزین میں اردو زبان سے متعلق بہت سے مضامین شائع کیے جاتے ہیں جو کہ بہت اچھی اور خوشی کی بات ہے۔ رنگین صفحات پر مشتمل ماہنامہ اردو دنیا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ماہنامہ اردو دنیا اردو کی ایک آواز ہے۔ میں ایڈیٹر صاحب سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ نئے قلمکاروں کو بھی اردو دنیا میں لکھنے کا موقع دیں، آپ ہی پہل کریں، عین نوازش ہوگی۔

* نئے قلمکاروں کے لیے 'نیا آسماں نئے ستارے' کے عنوان سے ایک کالم مختص ہے۔ اس کے تحت جامعات کے طلبا، ریسرچ اسکالر کے مضامین شائع کیے جاتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ (ادارہ)

✍ **سیف الاسلام خان**: سماجی کارکن، مال پور، ضلع دربھنگہ، بہار

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت ومعنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم وہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی ومعروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو میں سائنسی سماجی موضوعات پر مواد کی کمی ہے

ایم جے وارثی

پروفیسر محمد جہانگیر وارثی ایک معروف محقق اور ماہر لسانیات ہیں- علمی تحقیقی اور لسانی سرگرمیوں سے وہ حددرجہ شغف رکھتے ہیں- ان کے درجنوں علمی مقالات عالمی سطح کے رسائل وجرائد میں شائع ہوئے- اردو اورانگریزی میں ان کی کئی تصانیف کو پسندیدگی سے نظر سے دیکھا گیا-ان کی چند اہم کتابیں یہ ہیں: مینٹیلی اردو' زبان وترسیل'ڈپلومہ ان کمپوٹر ایلی کیشنز اینڈ ملٹی لنگول'لنگویج اینڈ کمیونیکنس'ایوی لیوشن آف میڈیا ریچ اینڈ افکٹیونیس وغیرہ- ان کی اہم کتاب 'مینٹیلی اردو' کوبین الاقوامی سطح پر ایک دل کش بازیافت کے طور پر دیکھا جارہا ہے-اس انکشاف نے پروفیسر وارثی کو جہاں ایک جید ماہرلسانیات ثابت کیاوہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ ہمہ دم نرم گرم جستجو میں محو رہتے ہیں- اس کے علاوہ انہوں نے قابل ذکر سیمینار وں اور کانفرنسوں میں ماہر لسانیات کی حیثیت سے شرکت کی- علمی وتحقیقی کارناموں کے لیے انہیں کئی عالمی اور قومی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے-

پروفیسر وارثی فی الوقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ لسانیات ہیں-اس سے قبل انہوں نے واشنگٹن یونیورسٹی'کیلی فورنیا یونیورسٹی' مینس گن یونیورسٹی (امریکہ) جیسے مؤقر اداروں میں تدریس کا فریضہ انجام دیا ہے- درس وتدریس کے علاوہ وہ انگریزی'ہندی اور اردواخبارات میں پابندی سے کالم بھی لکھتے ہیں- ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی کمیٹی کے بھی ممبر ہیں- الغرض درس وتدریس' تحریر وتقریر اور تنظیم وتدبیر کے انسلاکات پر ہمیشہ وہ کام کرتے رہتے ہیں-

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

جواب: زبانوں کو زندہ رکھنے کے بہت سے طریقے ہوسکتے ہیں۔ تاہم اختصار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان کو سماج اور بازار سے جوڑنے کی کوشش کی جائے۔ سماجی تقاضوں اور بازار کی نفسیات کے مطابق زبان پر گاہے گاہے محنت کرنی چاہیے۔ سماجی تقاضے میں ادبی معاملات بھی شامل ہوسکتے ہیں۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق ادب تخلیق کیا جائے تو ادب کو مقبولیت حاصل ہوگی اور از خود زبان کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اردو کی تاریخ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ صوفیا، فوج اور بازار نتیوں نے فروغ اردو میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

س: زبان کا تہذیب سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: یہ رشتہ انتہائی مضبوط ہے۔ کیوں کہ کوئی زبان خود معرض وجود میں نہیں آتی ہے بلکہ سماجی تقاضوں اور حالات کے مدنظر کوئی بولی فروغ پاتی ہے اور اس طرح زبان کی تشکیل کا مرحلہ آتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف زبان کے فروغ میں سماج کا کردار ہے بلکہ زبان کی تشکیل میں بھی تہذیب کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ایک پہلو ہے کہ کسی زبان کے ادب میں تہذیب وثقافت کے معاملات پیش کیے جاتے ہیں تو زبان کی دل کشی میں اضافہ ہوتا ہے اور زبان لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ موجودہ دور میں ادب اور تہذیب کا مطالعہ تو گہرائی سے کیا جانے لگا ہے جو کہ خوش آئند ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: جی ہاں! فروغ زبان میں فقط ادب ہی کردار نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے جس زبان میں سماجی اور سائنسی مواد ہوتے ہیں تو اس کا دائرہ یقیناً وسیع ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیبوں کا وجود معاشرے کے لیے سودمند ہے، تاہم فقط ادیبوں کے وجود سے ہی زبان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا ہے۔ اردو میں ادبی مواد بہت زیادہ ہے، مگر سائنسی اور سماجی موضوعات پر مواد کی کمی ہے۔ اس لیے جب بھی اردو کی بات کی جاتی ہے تو ہمارا ذہن ہمیشہ ادب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ حالانکہ ادبی سرمایوں کے علاوہ دیگر مضامین وموضوعات پر مواد کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ زبان ایک محدود دائرے میں پرورش پائے گی۔ سماجی اور سائنسی مواد کی بات ہو تو اسکول کی بات ہوگی ہے۔ اگر اردو میں سماجی اور سائنسی مواد بہت زیادہ نہیں ہے تو اس کی وجوہات یہ ہیں کہ ہندوستانی سطح پر اردو میڈیم اسکول کی تعداد قابل ذکر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ادب فروغ پاتا ہے، تاہم دیگر مضامین کے مواد اردو میں کثرت سے منتقل نہیں ہوتے ہیں۔

س: موجودہ دور میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: یوں تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ البتہ جب غور وفکر کرتے ہیں تو گلابلائزیشن کا اثر ہر جگہ نظر آرہا ہے۔ اس کے اثر سے ظاہر ہے بہت سی زبانیں متاثر ہورہی ہیں اور اردو بھی۔ اس صورت حال میں اگر اردو ٹکنالوجی سے اپنے آپ کو نہ جوڑے تو ظاہر ہے کہ زبان کا دائرہ محدود ہوگا۔ اگر ہندوستانی سطح پر بات کریں تو اردو زبان کو فقط حکومت کی طرف سے ہی خطرات لاحق نہیں، بلکہ اہل اردو خود اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھا رہے ہیں۔

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے، کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

ج: اردو کا چہرہ نہ مسخ ہو رہا ہے اور نہ ہی اردو کی شکل بگڑ رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اردو ضرور متاثر ہوئی ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آج اردو کی طرح دنیا کی ہر زبان متاثر ہوئی ہے۔ کیوں کہ گلوبلائزیشن کے اثرات تہذیب وثقافت اور زبان وبیان پر بھی بہت ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمیں ہر محاذ پر معمولی اصلاحات سے کام کرنا پڑے گا۔ غلط اردو لکھنے والوں کی ہلکی پھلکی تربیت بھی کرنی ہوگی۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

ج: زبان کی موت کی بہت سی وجوہات ہیں۔ اول، یہ کہ جب زبان کا رشتہ عوام سے کٹتا ہے تو زبان کی موت واقع ہونے لگتی ہے۔ عوام سے زبان کے کٹنے کا مطلب کچھ یوں ہے کہ یا تو زبان اتنی مشکل یا نفیس ہوجائے کہ عام لوگ سمجھ ہی نہ پائیں۔ جب زبان حد درجہ مشکل ہونے لگتی ہے تو افہام وتفہیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور عام افراد سمجھ نہ پانے کی وجہ سے اس زبان سے الگ ہونے لگتے ہیں۔

دوم: جب زبان کا دائرہ سکڑنے لگے، یعنی معاشرے میں رائج چیزوں کے ناموں کے متعلق غور وفکر نہ کیا جائے اور لغوی سطح پر زبان کو ثروت مند نہ کیا جائے تو زبان سکڑنے لگتی ہے اور آہستہ آہستہ ایسی زبان محدود ہوجاتی ہے۔

سوم، جب زبان کا رشتہ روزی روٹی سے ختم ہونے لگے تو لوگ زبان سے الگ ہونے لگتے ہیں۔ روزی روٹی اور اردو کا معاملہ انتہائی نزاعی ہے۔ کیوں کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے روزی روٹی کا سہارا لینا ضروری ہے، زبانوں کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روزی روٹی سے جو زبان جڑتی ہے، اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کے فروغ کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ میرا نظریہ ہے، بقیہ لوگ اور بھی نظریہ قائم کر سکتے ہیں۔

س: اردو کے مستقبل کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج: اردو کے مستقبل کے تئیں بہت کچھ کہنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ جہاں یہ حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر چند لوگ اردو کی طرف مائل ہو رہے ہیں، وہیں دوسری طرف تعلیمی اداروں میں اردو طلبا کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی اردو قاری کم ہو رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ آج بھی ادب کی پرورش ہو رہی ہے، تاہم قاری کا المیہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس لیے اس گومگوں کی صورت حال میں اردو کے مستقبل کے تئیں بہت کچھ کہنا آسان نہیں ہے۔ فروغ اردو اور اردو کے خوشنما مستقبل کے لیے دو سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اول، اردو میڈیم اسکولوں کا قیام اور سوشل سائنس سے قریبی تعلق۔ کیونکہ میرے خیال سے ان دونوں طریقوں سے اردو کا مستقبل روشن ہوگا۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: اس پر زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے بس بیدار مغزی کا ثبوت دیتے ہوئے روک ٹوک اور اصلاحی رویوں سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی اردو کی تعلیم کے لیے چھوٹے چھوٹے مراکز قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اردو سے جن کا جو بھی رشتہ ہو، اگر وہ اہل ثروت ہیں تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنے مکان پر ہی اردو تعلیم کا انتظام کریں۔ گھنٹے دو گھنٹے کی تعلیم کا نظم کریں۔ اس طرح بچے اردو سیکھیں گے اور اردو کے معلم کی تھوڑی مدد بھی ہوجایا کرے گی۔ ظاہر ہے جب چھوٹے چھوٹے مراکز پر نئی نسل اردو سیکھے گی تو زبان، بگاڑ سے محفوظ رہے گی۔

> اردو کا چہرہ نہ مسخ ہو رہا ہے اور نہ ہی اردو کی شکل بگڑ رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس پر اردو ضرور متاثر ہوئی ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ آج اردو کی طرح دنیا کی ہر زبان متاثر ہوئی ہے۔ کیوں کہ گلوبلائزیشن کے اثرات تہذیب وثقافت اور زبان وبیان پر بھی بہت ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمیں ہر محاذ پر معمولی اصلاحات سے کام کرنا پڑے گا۔ غلط اردو لکھنے والوں کی ہلکی پھلکی تربیت بھی کرنی ہوگی۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک گئی ہے؟

ج: جی بالکل، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا کہ ادب کے فروغ سے فقط زبان زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔ اردو کے موجودہ تناظر میں زبان سے کہیں زیادہ ادب فروغ پا رہا ہے۔ اردو کے لیے کام کرنے والے ادارے بھی اکثر ادب کے فروغ کے لیے فنڈ مختص کر رہے ہیں۔ زبان کی سطح پر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اردو پڑھنے والوں کی نئی کھیپ تیار کرنے کی ترکیبیں نہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ فقط سیمینار سے اردو کا فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ غیر اردو داں میں اردو کی لہر پھونک دی جائے، اس کے لیے مخلص کوشش کرنا لازمی ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت، وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: ہاں، بہت حد تک۔ کیوں کہ جب کلاسیکیت کی بات ہوتی ہے یا پھر کسی تحریک کی تو زبان وبیان اور ارسال وترسیل کے معاملات زیر بحث آتے ہیں۔ کسی نہ کسی سطح پر اردو زبان کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ اس لیے تحریکات پر گفتگو کے فوائد ضرور حاصل ہوتے ہیں، مگر یہ بات ہے کہ تحریکات پر کس حد تک گفتگو ہو، اس پہلو کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: سچی بات یہ ہے کہ میرے علاقے میں کوئی بھی اردو میڈیم اسکول نہیں ہے۔ میرے علاقے میں کیا، حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند میں اردو میڈیم اسکولوں کا سلسلہ ہی نہیں۔ مہاراشٹر اور جنوب کی دیگر ریاستوں میں اردو میڈیم اسکول ہیں اور وہاں ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی اردو میں مواد پیش کیا جاتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

ج: سچ بتاؤں تو میرے گاؤں میں باضابطہ کوئی لائبریری نہیں ہے۔ اردو اخبارات بھی پابندی سے نہیں پہنچتے ہیں۔ رہی بات رسائل کی تو اس کا بھی کوئی منظم نظام نہیں ہے۔ البتہ اردو پڑھنے والے جب شہر جاتے ہیں تو کبھی کبھی کوئی نہ کوئی رسالہ خرید لاتے ہیں۔ لیکن ہمارے مدارس اور مکاتب میں اردو دنیا کے شمارے مل جاتے ہیں کیونکہ این سی پی یو ایل سے بہت سے اداروں میں رسائل اور کتابیں بھیج دی جاتی ہیں۔ اس لیے وہاں چھوٹے چھوٹے مدارس اور مکاتب میں رسالہ اردو دنیا نظر آتا ہے۔

س: آپ علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

ج: حقیقت یہ ہے کہ اردو کے لیے کام کرنے والا کوئی ادارہ نہیں ہے۔ البتہ اکبری بیگم ٹرسٹ اور دیگر ٹرسٹوں کے تحت کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے اردو پروگراموں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بتادوں کہ ان پروگراموں میں نہ کسی سرکاری ادارے کا کوئی کردار ہوتا ہے اور نہ ہی اردو تدریس سے جڑے کسی فرد کا، بلکہ مدارس ومکاتب سے

جڑے ہوئے علما ایسے چھوٹے چھوٹے پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ جن میں اردو زبان میں اسلامی معاملات پر غور وفکر کیا جاتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

ج: سچی بات یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں اردو عام ہے۔ اردو پڑھنے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ بچے بچے اردو پڑھتے ہیں۔ اردو سمجھتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہوگا کہ آخر جب اردو میڈیم اسکول نہیں اور اردو تنظیمیں کام نہیں کررہی ہیں تو اردو کا یہ سماں کیسے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اس میں ہمارے علاقے کے چھوٹے چھوٹے مکاتب کا اہم کردار ہے۔ آپ ہی بھلا بتایئے، بڑی بڑی ڈگریوں کی غیر موجودگی میں ان چھوٹے چھوٹے اردو کے جیالوں کو کوئی قومی سطح پر نوازے گا؟ آپ ہی بتائیں کہ اردو کے ان اصل خادموں کو کوئی اردو کا اصل خادم گردانے گا؟ اگر آپ ان کو اردو کے خادم مانتے ہیں اور اردو کے ماضی، حال اور مستقبل ان کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم یہ کہیں گے کہ ان کو قومی سطح پر ان کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے قومی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جارہا ہے۔ ہمارے علاقے میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو اردو کے خاموش خادم ہیں۔ ان کی خدمات کی وجہ سے پورے علاقے میں اردو پڑھنے والے موجود ہیں۔ میں یہاں لسٹ تو تیار نہیں کررہا ہوں، تاہم چند ناموں کا ذکر ضروری ہے، مثلاً، الحاج ماسٹر اظہار الحق، مولانا نظام الدین قاسمی، مولانا عارف حسین قاسمی، مولانا کبیر قاسمی، ماسٹر اویس وغیرہ، ان میں سے کئی ایک تصنیف وتالیف سے بھی جڑے ہیں اور بچوں کو اردو سے قریب کررہے ہیں۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کررہے ہیں؟

ج: اردو کے فروغ کے لیے سرکاری ادارے اور اکادمیاں گاؤں کا بھی رخ کرے اور اردو کے ان خاموش خادموں سے ملے۔ ہو سکے تو دور دراز علاقوں کے مکاتب میں ہی اردو سینٹر قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے جب پرائیویٹ مکاتب میں اردو پڑھانے والوں کو اکادمیوں کی طرف سے کچھ تعاون دیا جائے گا تو ان کی ہمت افزائی ہوگی اور ان خادموں کا تعارف قومی وریاستی سطح پر بھی ہوگا۔ اس طرح اردو کے ان خادموں سے دوسرے کے اندر خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: میرے ذہن میں فقط یہی خاکہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اردو میڈیم اسکولوں کا قیام عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ ساتھ ہی پرائیویٹ اسکولوں کے پرنسپل سے مطالبہ کریں کہ ہمارے بچے اسی وقت آپ کے اسکول میں داخلہ لیں گے، جب آپ کسی اردو ٹیچر کو رکھ کر ہمارے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پرائیویٹ اسکولوں سے یہ مطالبات شروع کردیں تو یقیناً بہت سے مسائل حل ہوں گے۔ اس کے لیے سوشل میڈیا سے اردو کو بھگانے یا پھر اس پر اردو لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کریں۔ اگر کوئی غلط اردو لکھ رہا ہے تو اس کی ہمت افزائی کریں اور ان کی اصلاح کی کوشش کریں، زبان کے مٹنے کا فقط مرثیہ نہ پڑھیں۔

"زیادہ سے زیادہ اردو میڈیم اسکولوں کا قیام عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔ ساتھ ہی پرائیویٹ اسکولوں کے پرنسپل سے مطالبہ کریں کہ ہمارے بچے اسی وقت آپ کے اسکول میں داخلہ لیں گے، جب آپ کسی اردو ٹیچر کو رکھ کر ہمارے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پرائیویٹ اسکولوں سے یہ مطالبات شروع کردیں تو یقیناً بہت سے مسائل حل ہوں گے۔ اس کے لیے سوشل میڈیا سے اردو کو بھگانے یا پھر اس پر اردو لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کریں۔"

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کیلی گرافی اور خوش خط کے لیے بھی مہم چلائیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہماری تحریر اچھی ہوگی تو ہم لکھنے کی کوشش کریں گے۔ اچھی تحریروں کی نمائش کریں گے۔ اس طرح رسم الخط کی حفاظت میں مدد ملے گی۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: اس کی صورت یہ ہے کہ ہم اردو مواد کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش کریں۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ دیگر زبانوں سے اردو میں مواد منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، تاہم اردو تخلیقات کو دوسری علاقائی زبانوں میں منتقل کرنے کا رجحان نہیں ہے۔ جس دن ہم سنجیدگی سے دوسری زبانوں میں اردو کے مواد پیش کرنے لگیں گے تو اردو کی طرف لوگوں کا میلان ہوگا۔ اس کے علاوہ ہم دوسری زبان جاننے والوں کو اپنی محفلوں میں کثرت سے بلائیں۔ اس طرح اختلاط ہوگا۔ وہ اردو کی تقاریر سنیں گے۔ اردو تہذیب سے قریب ہوں گے۔ اس قربت سے دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے منتقل ہونے کی صورت ازخود نظر آئے گی۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: ہاں، جانتے ہیں۔ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

ج: ہاں بالکل، میرے گھرانے میں مجھ سے پہلی نسل میں بھی اردو جاننے والے تھے، اور آج بھی ہیں، امید ہے کہ آئندہ بھی ہوں گے، لیکن یہ میں بتا دوں کہ میرے گھرانے کا اردو سے روزگار کا رشتہ ہے اور نہ ہی کوئی پیشہ ورانہ تعلق، تاہم تہذیبی طور پر ہم اردو سیکھتے ہیں اور اردو کے فروغ کی بھی مسلسل کوشش کرتے ہیں۔ میں کوئی پیشین گوئی تو نہیں کررہا، البتہ حالات ایسے ہیں کہ اردو ضرور زندہ رہے گی۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: دربھنگہ شہر سے تقریباً 68 کلو میٹر پر واقع کوشیشور استھان میں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ ساتھ ہی ہمارے علاقے کے اطراف میں (تقریباً چالیس کلومیٹر کے اندر) کوئی ایسا کالج نہیں ہے جس میں اردو ہو۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: یہ انتہائی مشکل سوال ہے۔ کیوں کہ فقط ادب کی بنیاد پر کوئی غیر سرکاری تنظیم اردو کے فروغ کے لیے غور وفکر کرے۔ ظاہر ہے اس کے لیے پوری ٹیم کو سوچنا ہوگا کہ کیسے غیر سرکاری تنظیم اردو کے فروغ کے لیے غور وفکر کرے۔

■

Prof. M. J. Warsi
Chairman, Department of Linguistics
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9068771999
Email.: warsimj@gmail.com

صنفی مساوات کا فروغ اور اردو میں معلوماتی ادب کی ضرورت و اہمیت

آمنہ تحسین

دنیا کے بیشتر ممالک بشمول ہندوستان' اگرچہ سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کے ساتھ معاشی طور پر بڑی حد تک اپنا موقف بدل رہے ہیں لیکن سماجی انصاف اور صنفی مساوات کے مکمل طور پر دعویدار نہیں بن پائے ہیں۔ان ممالک کی اپنی قدیم سماجی و ثقافتی روایات اور نظریات ہیں جو مردمرکوز ہیں۔ایسے مرداساس سماجوں میں خواتین آج بھی مختلف طرح کے صنفی مسائل اور جبر واستحصال سے دوچار ہیں نیز پست وحاشیائی حیثیت کے ساتھ دوسرے درجے پر ہیں۔تعلیم،صحت کی نگہداشت، منظّم معاشی شعبوں میں شمولیت اور معلومات کے ذرائع تک ان کی مکمل رسائی ممکن نہیں ہو پائی ہے۔سماجی تحفظ اور بااختیاری کے لیے بنائے گئے قوانین اور پالیسی سازی کے باوجود خواتین عدم تحفظ، جبر واستحصال کا شکار ہیں اور باوقار زندگی سے محروم ہیں۔ دراصل مرداساس معاشروں میں عورت ومرد کے درمیاں انسانی حیثیت سے بنیادی حقوق اور ترقی کے مواقع کی مساویانہ فراہمی میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

مختلف ممالک کی شائع شدہ رپورٹس میں تعلیم، صحت، معاشیات اور سیاسی وسماجی شمولیت کے اعتبار سے' صنفی فرق یا عدم مساوات' کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ان شواہد کا ثبوت ہمیں Gender Parity Index report -2020 سے بھی مل جاتا ہے۔ یہ رپورٹ 153 ممالک کے سروے پر مبنی ہے۔اس چشم کشا رپورٹ میں عالمی سطح پر موجود صنفی عدم مساوات اور عورتوں کے موقف کی حقیقی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ مذکورہ رپورٹ میں صنفی عدم مساوات کی شماریات کی بنیاد پر خود ہندوستان کا شمار 112 نمبر پر ہوا ہے۔ جبکہ ہندوستان میں صنفی عدم مساوات کو ایک کثیر جہتی مسئلہ بتایا گیا ہے۔گر چہ کہ ہندوستان میں صنفی عدم مساوات کے خاتمے کو پالیسی سازی کا حصہ بنایا گیا اور مختلف النوع اقدامات اپنائے گئے لیکن خاطرخواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔اس ضمن میں کیے گئے تحقیقی مطالعات سے ہندوستان کے کثیر مذہبی اور پیچیدہ ثقافتی سماج کی کئی تصویریں واضح ہوتی ہیں جو عدم مساوات کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ان رپورٹس سے وجوہات کا بھی پتہ چلتا ہے' لیکن ان سب میں جو بنیادی وجہ سامنے آتی ہے وہ ہے صنفی مسائل اور تدارک کے متعلق افراد کی کم واقفیت۔ دراصل کسی بھی سماج کی ذہنی وفکری تبدیلی کے لیے عصری مسائل سے اس سماج کے افراد کی واقفیت اور اس کے منفی اثرات کا شعور پیدا ہونا ضروری ہوتا ہے۔لہٰذا مختلف موضوعات پر مادری یا مقامی زبانوں میں معلومات کی تیاری اور عام وخاص افراد تک ان کی رسائی سماجی تبدیلی کے لیے ناگزیر ہوجاتی ہے۔

پچھلی چند دہائیوں کے دوران عالم کاری کے نتیجے میں ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی اور اس سے وجود میں آنے والی جدید معلومات نے گذری صدیوں کے مقابلے میں انسانی زندگی سے جڑے تمام شعبوں پر اپنے بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ فی زمانہ جدید ٹکنالوجی کی ترقی نے معلومات کی ترسیل اور اشتراک کے مختلف النوع ایسے ذریعے پیدا کردیے' جس کی وجہ سے جغرافیائی حدود کا تصوّر ختم ہو کر رہ گیا اور معلومات کی ترسیل نے تمام دنیا کے افراد کو ایک ہی گلوب میں مقید کردیا ہے۔ترقی کی اس تیز رفتاری کے ساتھ قدم ملا کر چلنے اور آگے بڑھنے کے لیے افراد کو حسبِ ضرورت اور ہمہ وقت معلومات کا حصول اور اس کی تفہیم ناگزیر ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف موضوعات پر معلوماتی ادب کی تیاری اور ترسیل کے جدید ذرائع نہایت اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے انقلاب کے نتیجے میں عالمی سطح پر ملک، مذہب،ذات پات، طبقہ یا صنف کی بنیاد پر صدیوں سے چلے آرہے امتیازات اور عدم مساوات کا کسی حد تک خاتمہ ہوا ہے۔انسان اور انسانی حقوق کی اہمیت اجاگر ہوئی ہے' نیز انسانی زندگی کی بقا اور ترقی کے لیے صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ ہنر مندی کے ساتھ ساتھ

زیادہ سے زیادہ معلومات کو اہمیت دی جانے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کو پہلے "Age of knowledge" پھر Age of information'' کہا جانے لگا ہے' اور موجودہ سماج کو'' نالج سوسائٹی'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس نالج سوسائٹی میں دھیرے دھیرے عدم مساوات کے فرسودہ نظریات کا خاتمہ ہو رہا ہے اور مساوات کا تصور عام ہو رہا ہے۔ UNESCO Global report-2018 میں 'مساوات پر مبنی نالج سوسائٹی' کے متعلق بڑی اچھی وضاحت کی گئی ہے۔

یونیسکو کے مطابق نالج سوسائٹی انسانی حقوق اور مساوات کو فروغ دیتی ہے۔ تب یہ جاننا ناگزیر ہو جاتا ہے کہ 'کیا عصرِ حاضر کی نالج سوسائٹی میں عورت کو مردوں کے برابر انسانی حقوق حاصل ہیں؟ کیا اس ترقی یافتہ سماج میں وہ انسان کی حیثیت سے باوقار مقام حاصل کر پائی ہے؟ کیا صنفی عدم مساوات اور عورت کے حقوق کی بھرپور معلومات اس نالج سوسائٹی کی تمام سطحوں پر علمی ڈسکورس کا حصہ بن پائی ہے؟ کیا صنفی مساوات کے ڈسکورس اور سماجی تبدیلی میں 'معلوماتی ادب' کوئی اہم رول ادا کر پایا ہے؟ کیا انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں بشمول اردو زبان میں ان موضوعات پر معلوماتی ادب دستیاب ہے؟

صنفی مساوات کے حوالے سے عالمی سماج کا جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ بیشتر ممالک بشمول ہندوستان میں سماج کی مختلف سطح پر صنفی عدم مساوات موجود ہے۔ عورت و مرد کے تعلیمی، معاشی، سماجی و تہذیبی اور سیاسی موقف میں عدم توازن پایا جاتا ہے نیز خواتین جبر و استحصال اور تشدد کا شکار ہیں۔ مختلف النوع کوششوں کے باوجود دنیا کے بیشتر ممالک صنفی مساوات کو فروغ دینے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائے ہیں۔ اس بات کا ثبوت ہمیں اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکریٹری' Mr. António Guterres کے اس بیان سے ملتا ہے جس میں انھوں نے عالمی سطح پر صنفی عدم مساوات کی موجودہ صورتِ حال کے خاتمہ اور مساوات کے فروغ کو 'انسانی حقوق' کے لیے ایک بڑا چیلنج قرار دیا۔ انھوں نے لکھا:

" Achieving gender equality and empowering women and girls is the unfinished business of our time, and the greatest human rights challenge in our world"

یہی وجہ ہے کہ اقوامِ متحدہ نے صنفی مساوات کے حصول کو'' Sustainable development goals-2030 '' کا حصہ بنایا ہے اور 'گول نمبر 5' کو اسی مقصد کی حکمت عملی کے لیے مختص کیا ہے۔ دراصل عصرِ حاضر میں خواتین کی بااختیاری دنیا کے تقریباً تمام ممالک کی پالیسی سازی کا حصہ بنادی گئی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے پہلا ہدف سماج میں صنفی مساوات کا فروغ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں اقوامِ متحدہ کے علاوہ تقریباً تمام ممالک کی جانب سے صنفی مساوات کو فروغ دینے کے مختلف النوع اقدامات اپنائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف تانیثی تحریکات کے نتیجے میں سماجی سطح پر خواتین کی حیثیت اور صنفی مساوات کو لے کر شعور بھی بیدار ہوا ہے۔ چنانچہ ان کی پست حیثیت کے اسباب اور وجوہات کو جاننے کے متعلق رجحان بھی بڑھا ہے۔ لہٰذا مختلف شعبہ علوم کے حوالے سے نئے نئے نظریات اور خواتین کی زبوں حالی کو دیکھنے اور سمجھنے کے مختلف زاویے سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں 1960 کے بعد سے ایک بڑی واضح تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ تانیثی تحریکات اور اس سے جڑے تمام تصورات و نظریات کو علم کے ساتھ جوڑ دیا گیا اور ایک بین الکلیاتی مضمون 'مطالعاتِ نسواں' تعلیمی نظام میں متعارف کروایا گیا۔ جس کے نتیجے میں عورت کی تاریخی، سماجی و ثقافتی اور معاشی حیثیت مطالعہ و تحقیق کا حصہ بننے لگی۔ 'مطالعاتِ نسواں' میں جہاں مختلف تاریخی، سماجی و تہذیبی پس منظر میں عورت کی پست حیثیت و محکومیت نیز پدرسریت یا اس مرد اساس نظام کی مختلف نوعیتوں کو زیرِ بحث لایا گیا وہیں 'صنفی عدم مساوات' کے اسباب و عوامل کی جانچ پرکھ اور تشریح و تفہیم کے لیے 'صنفی عدسہ (Gender lens)' کو تدریس، تحقیق و تجزیہ کا اہم پیمانہ بنایا گیا۔ تاکہ پدری سماج میں عورت و مرد کے غیر متوازی مقام و مرتبے کی وجوہات نیز ان کے رویّوں کو وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکے۔ مختلف اقدامات کے ذریعے سماج میں صدیوں سے رائج صنفی تصورات و نظریات کو بدلا جا سکے اور صنفی مسائل کا خاتمہ کیا جا سکے۔ 'مطالعاتِ نسواں' کے تناظر میں تدریس اور تحقیق کے حوالے سے سماج میں خواتین کی حیثیت اور صنفی مسائل کے متعلق بہت سا مواد تیار ہوتا گیا۔ جس کا مطالعہ کسی بھی سماج کی صحیح صورتِ حال کو سمجھنے، پالیسی سازی کا حصہ بنانے اور سماج میں شعور بیدار کرنے میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گذرے برسوں میں صنفی مساوات کے متعلق سماج کی ذہن سازی اور شعور بیداری کی مختلف کوششوں میں 'معلوماتی ادب' کا اہم اور موثر رول رہا ہے۔ دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ زیرِ بحث موضوعات پر انگریزی زبان میں خاصا معلوماتی ادب موجود ہے اور ترسیل کے مختلف جدید ذرائع سے افراد تک پہنچ رہا ہے نیز ہمہ وقت بہ آسانی دستیاب ہے۔ جبکہ اس طرح کا مواد دیگر زبانوں میں کم ہی دستیاب ہے۔ گرچہ انگریزی زبان بین الاقوامی سطح پر رابطے کی زبان ہونے کے باوجود اس زبان کے بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ اس زبان سے کم واقفیت رکھنے والے افراد کی تعداد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معلومات کی ترسیل انگریزی زبان سے واقف ایک مخصوص گروپ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں صنفی مساوات کو فروغ دینے کے لیے مقامی زبان میں مواد کی تیاری اور ترویج پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ مختلف ممالک کی شائع شدہ تحقیقی رپورٹس میں خواتین سے متعلق سماج کی سوچ اور خود خواتین میں اپنے حقوق اور مسائل سے متعلق عدم واقفیت کے رجحان کی بارہا نشاندہی کی گئی ہے اور ان کی ذہن سازی کے لیے انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں' بالخصوص مادری اور مقامی زبانوں میں معلوماتی ادب کی ضرورت اور اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی تاکہ افراد کو ان کی اپنی مادری زبان میں 'صنفی مسائل اور خواتین کے حقوق' کے متعلق حسیت پذیر بنایا جا سکے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر سے ہی چند ایک مغربی ممالک میں باقاعدہ عورت کی پست حیثیت کے خاتمے اور ان کے لیے مردوں کے برابر حقوق کی حصول یابی کی سرگرم کوششیں شروع ہوگئی تھیں جو آگے چل کر مختلف ممالک میں تانیثی تحریکات کی شکل اختیار کر گئیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے جو سعی کی گئی وہ تھی سماج کی ذہن سازی۔ لہٰذا خواتین کے سماجی، سیاسی حقوق اور ان کے مسائل پر مختصر تحریریں، ورقیے، مضامین لکھے جانے لگے۔ جو اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے یا پھر مستقل کتاب کی شکل میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ وہ تحریریں سماج بالخصوص خواتین کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے متحرک کرنے، ترغیب دلانے، ان کی معلومات میں اضافہ اور شعور بیداری کا باعث بننے لگیں بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہی معلومات اور اطلاعات پر مبنی تحریریں عالمی سطح پر صنفی مساوات پر 'سنجیدہ علمی مکالمہ یا مباحثہ' کی بنیاد بھی بنیں۔ جس کے نتیجے میں صنفی تصورات پر سنجیدگی سے غور و فکر کا آغاز ہوا' اور پھر ایسی اہم تحریریں منصۂ شہود پر آتی رہیں اور ان کا سلسلہ چل پڑا۔ اس طرح کی تحریروں کے نتیجے میں سماج میں عورت کی ثانوی حیثیت کے اسباب کے متعلق کئی اہم نظریات وجود میں آئے جو مختلف ممالک میں تانیثی تحریکات کا حصہ بنتے رہے۔ انگریزی زبان

میں خواتین کے متعلق لکھے گئے ابتدائی دور کے معلوماتی ادب کی نشاندہی پندرہویں صدی سے ہوتی ہے' لیکن Marry Wolston Craft کی تصنیف 'A vindication of rights of Women' کو خواتین کے حقوق پر لکھی گئی پہلی باقاعدہ تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ 1792 میں شائع شدہ اس کتاب میں مصنفہ نے صنفی عدم مساوات پر بہت سے سوال اٹھائے تھے۔ بعد میں اس کے تسلسل میں سیکڑوں تحریریں منصۂ شہود پر آئیں۔ دراصل گذرے برسوں میں تانیثی تحریکات کے حوالے سے صنفی مساوات کو فروغ دینے کی کوششوں میں جو معلوماتی ادب منصۂ شہود پر آیا ہے اسے معلومات کی ایک نئی دنیا کا علم کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ 'روایتی نالج ڈومین' سے بالکل الگ اور منفرد علم بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس علم کے فروغ نے سماج کی پیچیدگیوں کو جاننے اور صنفی نظریات کو پرکھنے کے لیے ایک خاص زاویہ نظر دیا ہے۔ اس زاویہ نظر سے مطالعے کے نتیجے میں عورت کے متعلق سماجی نظریات کے علاوہ تہذیب وتمدن کے ارتقا میں عورت کی اہم حصے داریوں سے بھی دنیا متعارف ہو پائی ہے۔ یہ معلومات دراصل کسی بھی سماج کے نصف حصہ کے متعلق ایسے اہم حقائق ہیں جو اب انسانی زندگی کی فلاح و بہبود اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ناگزیر تصور کیے جانے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے برسوں میں عالمی سطح پر صنفی مساوات کے مختلف پہلوؤں پر مختلف زاویوں سے خوب لکھا گیا اور ترسیل کے جدید ذرائع کی مدد سے اس کی تشہیر بھی خوب ہوتی رہی۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ صنفی مساوات کی بابت جو تصورات ونظریات واضح ہوئے' ان کی تشریح، تفہیم، تحقیق یا تنقید یا مطبوعہ کتابوں کے ترجمے بھی مختلف زبانوں کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ ان مطبوعات کے تناظر میں بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ' گذری صدیوں میں ایسی سیکڑوں تحریریں منظر عام پر آئیں جو تاریخ وتہذیب کا رخ موڑنے والی ثابت ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں صنفی مساوات اور خواتین کے حقوق کی بابت عالمی سطح پر معلومات کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی جس کی مختلف شقوں پر علمی ڈسکورس بھی شروع ہوا۔ جس کا سلسلہ فی زمانہ بہت تیزی سے جاری ہے۔ پرنٹ ورلڈ ہو یا ڈیجیٹل ورلڈ' صنفی مساوات کے متعلق مختلف قسم کا معلوماتی ادب پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ جو قاری کی معلومات میں بے پناہ اضافے کے ساتھ ساتھ ذہن سازی کا باعث بھی بنتا ہے۔ عصر حاضر میں صنفی مساوات کا فروغ اور اس کے متعلق معلوماتی ادب کی اہمیت یوں بھی مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ یہ فکر یا نظریہ صرف محدود دائروں میں قید نہیں ہے بلکہ یہ فکر اب تمام شعبہ ہائے حیات سے جڑ گئی ہے۔

ہندوستان میں حقوقِ نسواں یا صنفی مساوات کے فروغ کی کوششیں انیسویں صدی میں اصلاح معاشرہ کی تحریک کے پس منظر میں شروع ہوئیں۔ اس دور کے صنفی مسائل جیسے، کم عمری کی شادی، جہیز کی رسم، ستی کی رسم، دیوداسی نظام، بیوگی کا نظام، ناخواندگی اور دیگر سماجی رسوم ورواج کے خلاف ہندوستانی زبانوں بشمول اردو زبان کے خوب لکھا گیا۔ بالخصوص 1857 کے بعد ہندوستان

صنفی مساوات کے فروغ میں معلوماتی ادب کے اہم رول کے تناظر میں اردو زبان کے موجودہ منظر نامے کا جائزہ لیا جا ئے توسخت مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ اردو زبان میں 'صنفی مساوات' کے موضوع پر کوئی باضابطہ علمی ڈسکورس شروع نہیں ہوا ہے۔ صنفی مساوات کے موضوعات کو چند ایک قلم کاروں نے کسی حد تک 'تخلیقی ادب' کا حصّہ بنایا لیکن اس موضوع پر خالص 'معلوماتی ادب' کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔

میں تاریخ، تہذیب، مذہب، تعلیم، سماجی مسائل، معاشرتی اصلاح اور سیاسی تبدیلیوں کو لے کر زبردست مباحثے کا آغاز ہوا۔ رسائل واخبارات کی اشاعت نے اس مباحثے کو' پبلک ڈومین' میں پہنچا دیا، جس کے نتیجے میں بے شمار تحریریں منظرِ عام پر آتی گئیں اور ذہن سازی کا حصہ بنیں۔ اس دور میں منظرِ عام پر آئی تحریروں میں 'تخلیقی ادب' کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا 'معلوماتی ادب' بھی شامل تھا۔ جو کہیں نہ کہیں صنفی مسائل پر مباحث سے لے کر عورت ومرد کے لیے مساویانہ حقوق کی مانگ سے متعلق تھا۔ اس دور میں لکھے گئے ادب نے ہندوستانی سماج کی ذہنی وفکری تبدیلی میں نمایاں رول ادا کیا۔ اگر چہ کہ صنفی مساوات کے مختلف پہلوؤں کو لے کر مغربی ممالک یا انگریزی زبان میں لکھے گئے علمی و تحقیقی مضامین اور کتابوں کی طرح کا رجحان ہندوستان میں بڑی دیر بعد پیدا ہوا۔ لیکن ابتدائی دور میں لکھی گئی تحریروں میں چند ایک اہمیت کی حامل رہیں۔ جن میں ہم' تارابائی شنڈے کی تصنیف '' استری پرش تلنا (1881)، رقیہ سخاوت حسین کی تصنیف 'سلطانا ز ڈریم' (1905)، مولوی ممتاز علی کی کتاب 'حقوقِ نسواں' (1887) وغیرہ کے نام لے سکتے ہیں۔ یہ کتابیں دراصل ہندوستاں میں 'صنفی مسائل پر فیمینسٹ ڈسکورس' کا آغاز ثابت ہوئیں۔ بعد کے دور میں مزید کتابیں لکھی گئیں۔

ملک کی آزادی کے بعد دستور میں نہ صرف مساوات اور سماجی انصاف کو اہمیت دی گئی' بلکہ خواتین کے حقوق اور تحفظ کے ضمن میں کئی قوانین بنائے گئے۔ مختلف پالیسیز اور پروگرامس کے ذریعے خواتین کی ترقی و بااختیاری کی کوششیں کی جانے لگیں۔ صنفی مساوات کے تصور کو 'قومی تعلیمی پالیسی 1986' کا حصہ بنایا گیا۔ ہندوستان میں پہلی دفعہ صنفی مساوات کو عام کرنے میں تعلیم کے رول پر توجہ دی گئی اور تعلیم کو سماجی تبدیلی نیز صنفی مساوات کے فروغ کا اہم آلہ قرار دیا گیا۔ نصابِ تعلیم میں تبدیلی اور خواتین سے جڑے موضوعات کو شامل کرنے پر زور دیا گیا۔ اس ضمن میں' این سی ای آر ٹی اور یو جی سی' کی مختلف کوششوں کے نتیجے میں ایک طرف اسکول کے نصاب تعلیم میں 'صنفی حسیت پذیری' (Gender Sensitization) کو جگہ دی گئی تو دوسری طرف یہ فکر' مطالعاتِ نسواں یا جینڈر اسٹڈیز' کے نام سے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی نظام کا حصہ بنی۔ اس حوالے سے تقریباً پچھلے چالیس برسوں میں کی گئی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستانی سماج کے تناظر میں صنفی مسائل سے کما حقہ واقفیت حاصل ہوئی ہے اور اس کے متعلق خاطر خواہ مواد بھی تیار ہوا ہے، جو وقت وقت سے پالیسی سازی میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

صنفی مساوات کے فروغ میں معلوماتی ادب کے اہم رول کے تناظر میں اردو زبان کے موجودہ منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ اردو زبان میں 'صنفی مساوات' کے موضوع پر کوئی باضابطہ علمی ڈسکورس شروع نہیں ہوا ہے۔ صنفی مساوات کے موضوعات کو چند ایک قلم کاروں نے کسی حد تک 'تخلیقی ادب' کا حصہ بنایا لیکن اس موضوع پر خالص 'معلوماتی ادب' کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو زبان میں 'حقوقِ نسواں اور صنفی مساوات' کے متعلق تخلیقی ادب کی ایک توانا روایت موجود ہے۔ اصلاح معاشرہ کی تحریک کے زیرِ اثر اردو میں جو ادب تحریر ہوا' اس کے موضوعات میں خواتین کے حقوق اور مسائل شامل رہے۔ عورت کی خاندانی، تعلیمی، سماجی اور مذہبی حیثیت کو لے کر خوب مباحثے شروع ہوئے، جس پر مرد تخلیق کاروں نے پہلے قلم اٹھایا۔ پھر قلم کار خواتین ادب کے میدان میں آئیں اور اپنے مسائل کو لے کر ایک علمی وادبی مکالمہ شروع کیا۔ ملک کی آزادی سے قبل تخلیقی ادب کے حوالے سے جو' صنفی مکالمہ' شروع ہوا وہ ملک کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد بھی جاری رہا بلکہ مابعد جدید دور میں بھی چند ایک مرد

قلم کاروں کے علاوہ بیشتر خاتون قلم کاروں نے اپنی تحریروں میں صنفی مسائل اور نظریات پر بہت سے سوال اٹھائے۔ مابعد جدید دور میں 'تانیثی تنقید' کا رجحان پیدا ہونے لگا تو اس حوالے سے مجموعی طور پر ادب کو جانچنے پرکھنے کی طرف چند ایک افراد نے قدم بڑھائے اور بین السطور میں پوشیدہ صنفی تصورات اور پدرسری نظریات کی نشاندہی کی۔ لیکن یہ سب کچھ معدودِ چند قلم کاروں اور ان کے تخلیقی ادب تک ہی محدود رہا۔ اس پر توجہ بھی مرکوز نہیں کی گئی بلکہ ان تصورات کو مغربی نظریات کہہ کر رد کردیا گیا، انھیں مطالعے کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی تانیثی تنقید کا رجحان اردو میں زور نہیں پکڑ پایا۔

تخلیقی ادب سے ہٹ کر خواتین کے حقوق پر اردو زبان میں اگر لکھا بھی گیا تو وہ زیادہ تر مذہب کے حوالے سے لکھا گیا جبکہ ان کی 'سماجی حیثیت اور مسائل' پر کم ہی غور وفکر کیا گیا اور نہ زیرِ بحث لایا گیا۔ صنفی مساوات کو فروغ دینے کے لیے معاشرے کی تمام سطحوں پر واقفیت عام کرنے اور صنفی عدم مساوات کو ختم کرنے کے لیے معلوماتی ادب اور علمی ڈسکورس یا مباحثے ومکالمے کی اردو زبان میں بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں رہی ہے۔ جبکہ دیگر زبانوں کے سرمایہ ادب میں تخلیقی ادب یا معلوماتی ادب میں خواتین کی پسماندگی کو لے کر مختلف نقطۂ نظر سے تحریریں منظرِ عام پر آرہی ہیں۔ جبکہ اردو زبان تخلیقی ادب اور اس کی تحقیق وتنقید اور کسی حد تک صحافتی ذمے داریوں تک محدود ہوکر رہ گئی ہے اور اس کا سماجی سروکار گویا ختم ہوکر رہ گیا ہے۔ جب کہ اردو زبان کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو ابتدا ہی سے سماجی رابطوں کی زبان رہی اور سماجی وسیاسی تبدیلیوں نیز تحریکات میں افراد کی ذہن سازی، شعور بیداری اور حوصلہ افزائی کے اہم فرائض انجام دیئے جبکہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں اردو زبان کے رول کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ماضی میں اردو کے علمی وادبی اداروں کی جانب سے انگریزی کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں کے معلوماتی ادب کا اردو میں ترجمہ کروایا گیا جس کے نتیجے میں زبان کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی بے پناہ وسعت ہوئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دارالترجمہ (عثمانیہ یونیورسٹی) سے اردو میں مختلف مضامین اور اہم موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ ترجمہ ہوئیں اور شائع ہوئیں۔ ماضی میں ہوئی اردو کی علمی وسعت کے باوجود وہ سلسلہ کہیں تھم سا گیا ہے۔

عصرِ حاضر میں اردو جدید ٹکنالوجی سے جڑ گئی ہے اور کئی آن لائن ذرائع وجود میں آگئے ہیں۔ لیکن ان پر تخلیقی ادب کے علاوہ معلوماتی ادب کا کوئی خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہے۔ چونکہ ادب سے ہٹ کر دیگر موضوعات پر توجہ ہی نہیں دی جاتی اسی لیے تعلیمی، معاشی، صحتی، سائنسی، سیاسی، سماجی وتہذیبی معاملات پر معلوماتی ادب کم ہی لکھا جاتا ہے۔ فی زمانہ چند ایک استثنائی مثالیں نظر آتی ہیں۔ لیکن اسے عمومی طور پر نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ جبکہ دوسری حقیقت یہ بھی ہے کہ اردو صرف برصغیر تک محدود نہیں رہ گئی ہے بلکہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی اردو کی نئی بستیاں بس گئی ہیں۔ اردو کی وسعت کے باوجود علمی ومعلوماتی تحریروں میں کمی آتی گئی اور اس کی جگہ پر انگریزی زبان کے غلبہ نے لے لی۔ اردو معاشرے پر اس کا منفی اثر پڑا اور ایک بڑا طبقہ دھیرے دھیرے جدید تبدیلیوں سے عدم واقفیت کی بنا پر ترقی کے مرکزی دھارے سے دور ہوتا چلا گیا۔ حالانکہ ہر دور میں ایسے ماہرین موجود رہے ہیں جو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان، مختلف مضامین اور جدید ٹکنالوجی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ باوجود اس کے ایسے افراد نے اپنی مادری زبان میں علمی سرمایے کے اضافے کی کوششیں نہیں کیں بلکہ 'ریڈرشپ' کو پیشِ نظر رکھ کر انگریزی میں ہی تحریر کیا اور کتابیں شائع کیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف اردو کے سرمایے کو نقصان پہنچا بلکہ اردو معاشرے کی نوجوان نسل بھی اپنی مادری زبان میں علمی اکتساب سے محروم ہوگئی۔ نئی نسل کو اردو زبان میں کسی بھی موضوع پر معلوماتی ادب آسانی سے پڑھنے کو نہیں ملتا جس سے کہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرسکیں اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو فروغ دے کر با آسانی ترقی کے دھارے میں شامل ہوسکیں۔ یہ معاملہ اس وقت اور بھی سنگین ہوجاتا ہے جب بات خواتین کی پسماندگی اور صنفی مسائل کے متعلق معلومات کی آتی ہے۔

اردو زبان میں ان موضوعات پر تحریروں کی کمی کی بنا پر معاشرے کے ایک بڑے طبقے تک مکمل معلومات پہنچ نہیں پاتیں اور نہ وہ عورت ومرد کے درمیاں غیر مساویانہ مقام و مرتبے کے منفی اثرات کو سمجھ پاتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو معاشرے سے وابستہ خواتین پر جو تحقیقی رپورٹس شائع ہوئی ہیں ان میں بھی واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ خواتین اپنے دستوری وشرعی حقوق کے علاوہ اپنے عصری مسائل سے بالکل ناواقف ہیں۔ معلومات کی کمی اور ناواقفیت ہی دراصل ان کی تعلیمی، معاشی اور سماجی پسماندگی کی بنیادی وجہ ہے۔

ہندوستان کی آبادی کا ایک خاطر خواہ حصہ اردو بولتا ہے لکھتا پڑھتا ہے' جبکہ عربی مدارس کے علاوہ اردو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ وطالبات کی بھی کثیر تعداد ہے۔ لہٰذا صنف اور سماجی تصورات ونظریات اور خواتین کے حقوق کے متعلق موضوعات پر مختلف ذہنی سطح کے مطابق موزوں 'معلوماتی ادب' تیار کرنے کی طرف فوری توجہ دینا ناگزیر ہے۔ اردو معاشرے میں 'صنفی مساوات' کو فروغ دینے کے لیے نہ صرف اسکولی سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیمی نظام تک کوششیں کرنے کی ضرورت ہے بلکہ عام افراد کو بھی اس ضمن میں حسیت پذیر بنانے کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گذرے برسوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے خواتین کی بااختیاری اور قوانین کے علاوہ تانیثیت جیسے اہم موضوعات پر دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ قابلِ ستائش اقدام ہے، لیکن اس طرح کی زیادہ سے زیادہ کتابیں اردو میں تحریر کرنے یا ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں نہ صرف نظریاتی مواد تیار کیا جائے بلکہ سماج بالخصوص خواتین کی شعور بیداری کے لیے عام فہم زبان میں شرعی و دستوری حقوق، تعلیم کی اہمیت، صحتی مسائل، سماجی وسیاسی بااختیاری، معاشی ترقی کے لیے دستیاب سہولتیں اور صنفی مسائل جیسے موضوعات پر کتابچے بھی تیار کیے جائیں اور تعلیمی وسماجی اداروں کے علاوہ زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچانے کا نظم بھی کیا جائے۔ اس طرح کا معلوماتی ادب اردو کی تمام ویب سائٹ پر بھی دستیاب رہے۔ جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں۔ اس مقصد کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے زبان وکلچر کے مرکزی وریاستی شعبہ جات، اردو کے فروغ کے ادارے، اکادمیاں، اردو کے تعلیمی اداروں کے علاوہ ماہرینِ زبان وعلم کی توجہ ناگزیر ہوگئی ہے۔ یہ کام انفرادی طور پر کرنے کے علاوہ اجتماعی سطح پر بھی کیا جائے تو بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ ان کوششوں کے ذریعے اردو میں صنفی مساوات کے ڈسکورس کو موجودہ 'نالج سوسائٹی' کا حصہ بنایا جاسکتا ہے اور سماجی انصاف، مساوات اور انسانی حقوق کی بنیاد پر 'سسٹینیبل ڈیولپمنٹ گول 2030' کو بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تمام بحث کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں صنفی مساوات کو فروغ دینے کے لیے جہاں دیگر زبانوں میں معلوماتی ادب کی تیاری اور ان کی ترسیل کی ضرورت ہے وہیں اردو زبان میں معلوماتی ادب کی ضرورت اور اہمیت سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

■

Dr. Ameena Tahseen
Faculty, Dept of Women Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad - 32 (Telangana)
Mob.:9885017580

اختر آزاد

غزل کائنات کا آئینہ گر
شائق مظفرپوری

نیا سورج کا تحفہ دے رہا ہوں
زمانہ خواب سے بیدار بھی ہے

شائق مظفر پوری نے 1983 میں اپنے پہلے شعری مجموعے 'نیا سورج' کے انتساب میں 'بیدار آنکھوں کے نام' یہ شعر لکھ کر نہ صرف اپنے ہونے کا احساس کرایا بلکہ ادبی پارکھوں کے روبرو یہ اعلان بھی کیا کہ میں اردو شاعری کے آسمان میں قوس وقزح رنگوں کے حسین امتزاج سے ایک نیا سورج طلوع کر رہا ہوں۔ یہ میری طرف سے نئے زمانے کے لیے تحفہ ہے۔ جو خواب غفلت میں ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔ اپنے شعور کی کھڑکیاں کھول لیں تا کہ میرے اشعار کی کرنوں سے اندرون منور ہو سکے۔

کاسۂ ظلمت میں دے گا کون پھر کرنوں کی بھیک
وقت سے پہلے اگر سورج کو ڈھل جانا پڑا

ان کا نام سید معین احمد تھا۔ تعلیم میٹرک تک حاصل کی۔ ٹسکو کمپنی (جمشید پور) جوائن کیا اور ریٹائرڈ بھی یہیں سے ہوئے۔ 1958 سے شاعری کا آغاز کیا۔ سروش مچھلی شہری کی شاگردی اختیار کی۔ آج شائق مظفر پوری اردو شاعری کا وہ معتبر نام ہے جن کی شناخت بحیثیت استاد شاعر کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے غزل کائنات کے بال و پر ہی نہیں سنوارے، بلکہ پچاسوں شاگردوں کو بھی اس لائق بنایا کہ وہ ان کی زلفیں سنوار سکیں۔ آج اس میں کوئی شک نہیں کہ شہر سنگ و آہن جمشید پور اور جمشید پور سے باہر بھی کچھ ایسے شعرا ہیں جو شائق مظفر پوری کی غیر موجودگی میں اپنے ہونے کا احساس کرا رہے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ شائق مظفر پوری کی شعری روح، شاگردوں کی روشنائی میں تحلیل ہو کر ہمیشہ ان کی تحریروں میں زندہ رہے گی کیونکہ سوچ کبھی نہیں مرتی۔ خیالات منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے شائق بھی صدیوں باقی رہیں گے۔

شائق مظفر پوری کی پوری شاعری ایک ایسا نگار خانہ ہے جس کی دیواریں شیشے کی لیکن فرش چاک کی ہے۔ اس چاک پر شاعری کی گوندھی مٹی رکھی ہوئی ہے جسے شائق وقت کے ہاتھوں گھما کر غزل پیکر میں ڈھالا کرتے تھے۔ وہ خوبصورت شعر دیکھیے جس میں انھوں نے کائنات کا فلسفہ خالق اور مخلوق کے حوالے سے نئے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ہم جو کچھ بھی ہیں وہ کسی کی مرہون منت ہے۔ کل کیا ہو جاؤں گا یہ بھی نہیں جانتا۔ پیدائش سے موت تک انسان کو زندگی کے کتنے اسرار و رموز سے گزرنا پڑتا ہے اسے جس طرح شائق نے دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں پرویا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ شعر دیکھیے۔

میں پھر ایک چاک پر رکھا گیا ہوں
نہ جانے کیا بنایا جا رہا ہوں

مجھے لگتا ہے کہ یہ وہ شعر ہے جسے کسی بھی بڑے شاعر کے اہم شعر کے مدمقابل رکھا جا سکتا ہے۔ شائق مظفر پوری کی شعری کائنات چار شعری مجموعوں پر مشتمل ہے۔ 'نیا سورج' (1983) 'سفر لہجے کا' (2003) آئینہ احساس کا (2007) اور 'نقطہ اور زاویہ' (2016)۔ آخری مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ان مجموعوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شائق مظفر پوری کوئی عام شاعر نہیں تھے۔ پچاسوں شاگرد یوں ہی نہیں ہوئے۔ بحیثیت انسان وہ سراپا سادگی کا پیکر تھے۔ خلوص ومحبت کا ایسا پیکر جو ایک بار ان سے مل لیتا، اسی سانچے میں ڈھل کر ہمیشہ کے لیے ان کی اپنائیت کا اسیر ہو جاتا تھا۔ کم گو لیکن بلا کے ذہین۔ سبھوں کو ساتھ لے کر چلنے والے۔ جب تک زندہ رہے 'حلقہ شائق' کے لیے 'سائبان' بنے رہے۔

چاہیے منزل تو شائق دھوپ کی چادر سنبھال
وقت کا اصرار ہے اب سائباں سر پر نہ رکھ

وہ جانتے تھے کہ جو لوگ دوران سفر دھوپ سے بچ کر چھاؤں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، منزل ان سے دور ہوتی چلی جاتی ہے اور ایسے لوگ جو اپنی منزل نہیں پا سکتے وہ اوروں کے لیے منزل نہیں بن سکتے۔ لیکن جن کے اندر دوسروں کے لیے کچھ کر گزرنے کا جنون ہے انھیں آگ اگلتی سڑک پر چلنے اور گہرے ساگر میں اترنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن اس لیے شرط ہے کہ اسے چلنا اور ساگر کی گہرائی ناپنے کا تجربہ ہونا چاہیے۔

آگ اگلتی راہ پر چلنا کچھ اتنا آسان نہیں ہے
ہم سے پوچھو کیا ملتا ہے اوروں کا دکھ اپنانے میں

جس ساگر میں سیپی چنتے عمر ہماری گزری ہے
وہ ساگر کتنا گہرا ہے ہم کو ہے معلوم میاں

آنکھوں کے سمندر کی تہہ میں ہر خواب سہانا لگتا ہے
تعبیر کے موتی چننے میں اے دوست زمانہ لگتا ہے

نئی امید لے کر جنوری آتی تو ہے لیکن
گزرتے سال میں ہم تا دسمبر ٹوٹ جاتے ہیں

نقطہ ہی میں سہی تو کوئی زاویہ بنا
تیرے لیے ہے کام یہ دشوار تو نہیں

غزل کائنات کی سڑک پر انھیں ہر لمحہ اس بات کا احساس تھا کہ وہ 'نقطہ' سے 'دائرہ' کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ ذات سے کائنات میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ اور یہ تبدیلی تب واقع ہوتی ہے جب انسان کی زندگی 'آئینہ' ہو جائے۔ جس میں وہ خود کو دیکھ سکیں۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ لیکن یہ مشکل امر ہے۔ اس کے باوجود شائق مظفر پوری نے اپنی سہل پسندی سے اسے آسان بنا دیا ہے۔ لفظوں کو برتنے کا ہنر بھی انھیں خوب آتا ہے۔ وقت، روشنی، عشق، زندگی، پرندہ، دنیا، زمین، آسمان، سمندر، صحرا، جنگل، سورج، آگ، قطرہ، آنکھ، پتھر، شیشہ اور آئینہ بار بار اشعار میں استعمال ہوئے ہیں۔ جن سے انہوں نے اپنی شاعری میں مفاہیم کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔ جذبۂ حب الوطنی، قوم پرستی، عشق دنیاداری، حوصلہ مندی، کچھ کر گزرنے کی تمنا، حقوق کی خاطر مر مٹنے کی آرزو جہاں

اشعار میں جا بہ جا دکھائی دیتے ہیں وہیں انسان کو اس کے حرکات وسکنات دیکھ کر پہچاننے کا ہنر بھی شائق مظفر پوری کے یہاں بدرجہ اتم موجود تھا۔ شعر دیکھیے اور ساتھ ہی تخیل کی اڑان بھی۔ بالکل عام فہم زبان میں کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ آپ سنیں گے عش عش کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

پرند وقت سے پہلے اڑان چاہتا ہے
زمیں کا اہل نہیں آسمان چاہتا ہے

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سارے مضامین ان کے یہاں بالکل نئے نہیں ہیں۔ لیکن جس طرح سے انہوں نے اپنے اشعار میں پرانے مضامین کو برتا ہے اس سے نیا پن ضرور پیدا ہوا ہے۔ اور یہی ایک فنکار کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ کچھ ویسے ہی مضامین جو انہوں نے اپنے اشعار میں باندھے ہیں ان پر بھی ایک نظر...... جیسے شکستہ پا ہونے کے باوجود زمانے کا اس کی چال پر رشک کرنا۔ خود کو بھولنے کے لیے بھی کسی بہانے کی تلاش کرنا، بے معنی ہونے کے باوجود کسی کتاب میں لفظ بن کر محفوظ ہونے کی خواہش کا پیدا ہونا، خون سے تاریخ کا لکھا جانا اور اخبار میں اپنی ہی موت کی خبر شائع ہونے پر اخبار کا ممنون ہونا وغیرہ میں انہوں نے نہایت ہی فنی مہارت دکھاتے ہوئے خوبصورت اشعار نکالے ہیں: چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

چلو تو یوں کہ زمانے کو رشک آ جائے
یقیں نہ آئے کسی کو شکستہ پا تم ہو

میں خود کو بھول جانا چاہتا ہوں
مگر کوئی بہانا چاہتا ہوں

میں حرف حرف بکھرنے لگا ہوں بے معنی
تو کوئی لفظ بنا کر مجھے کتاب میں رکھ

دنیا نے میرے خون سے تاریخ لکھی ہے
ممنون میرا کون سا اخبار نہیں ہے

شائق مظفر پوری کی شاعری کو ایک لفظ میں کوئی نام دینا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ یک زباں ہو کر سب کہیں گے 'آئینہ'...... کیونکہ ان کے چاروں مجموعے میں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جس میں انھوں نے آئینہ کو نہ جانے کتنے روپ میں دیکھا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک لفظ 'آئینہ' اور اشعار میں موضوع کی مناسبت سے اس کی تصویریں، معنی الگ۔ ایسا لگتا ہے کہ ہر شعر کو لکھنے کے بعد وہ آئینے میں اس کا عکس دیکھتے ہوں، یا آئینے کو دیکھ کر وہ بحرو اوزان کے سمندر میں غوطہ لگاتے ہوں۔ ہر کسی کی تحریر میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کی آواز بن کر سامنے آتے ہیں اور یہی وہ آواز ان کے اسلوب کو زندگی عطا کرتی ہے۔ لاشعوری طور پر بھی ایک لفظ کا بار بار آنا کسی کے اسٹائل کا حصہ بن سکتا ہے۔ لیکن شائق مظفر پوری کے یہاں یہ ایک شعوری عمل ہے، کیوں کہ انہوں نے اپنے آخری مجموعے کو ترتیب دیتے وقت ایسے نوے اشعار شامل کیے ہیں جس میں لفظ 'آئینہ' کا خوبصورت استعمال ہوا ہے۔

میرے محبوب کی تصویر آنکھوں نے اتاری ہے
اٹھا کر آئینہ کو آئینہ کہنے کو جی چاہے

وہ پتھر پھینکتے ہیں آئینوں پر
مگر شوق خود آرائی بہت ہے

تم تو خود کو مجھ میں پا کر ہو چکے ہو مطمئن
میں بھی خود کو دیکھ لوں وہ آئینہ دینا مجھے

اپنی آنکھوں میں برا تو بھی نہیں میں بھی نہیں
ہر نظر میں آئینہ تو بھی نہیں میں بھی نہیں

اب آئینے میں سنورنے لگا ہے وہ شائق
تری پسند پہ کتنا دھیان رکھتا ہے

آئینے کو روبرو کرتا چلوں
خود سے بھی کچھ گفتگو کرتا چلوں

وقت احساس کا آئینہ دکھائے مجھ کو
اپنے ہونے کا یقین پھر بھی نہ آئے مجھ کو

مجھ سے ملنا ہو جسے آئینہ لے کر آئے
میں بھی دیکھوں تو ذرا کون چھپا ہے مجھ میں

نظر پہلے ملاؤ آئینے سے
پھر اس کے بعد تم پتھر چلانا

ایسے بے شمار اشعار بکھرے پڑے ہیں جس میں لفظ 'آئینہ' اپنے نئے مفاہیم کے پیکر میں آپ کو ملیں گے۔

کہیں آئینہ محبوب کی آنکھ ہے۔ کہیں آئینہ چہرہ کتاب ہے۔ کہیں آئینہ روشنی کا منبع ہے۔ کہیں آئینہ خانۂ دل ہے۔ کہیں آئینہ زندگی کا استعارہ ہے۔ کہیں آئینہ حسن مجسم ہے........

کہیں گفتگو آئینہ ہے، کہیں سادگی آئینہ ہے، کہیں تحریر آئینہ ہے، کہیں تصویر آئینہ ہے، کہیں لمس آئینہ ہے، کہیں احساس آئینہ ہے۔

کبھی عشق آئینہ، کبھی فرار آئینہ، کبھی وقت آئینہ، کبھی دوست آئینہ، کبھی شناخت آئینہ، کبھی شعور آئینہ، کبھی نور آئینہ۔

کہیں شوق خود آرائی سے عبارت، تو کہیں صداقت کا نام آئینہ

کہیں سچ کی علامت، تو کہیں دنیا کی تعبیر آئینہ

کہیں ٹوٹتی بکھرتی زندگی کا نوحہ، تو کہیں خوشیوں کا گہوارہ آئینہ

یعنی اپنے اشعار میں شائق مظفر پوری نے زندگی کے تمام جذبات واحساسات کو آئینے کے سامنے رکھ کر ہر زاویے سے دیکھنے اور رنگ بھرنے کا کام کیا ہے۔ اور جب کبھی آئینے پر گرد جمی ہے۔ تصویر دھندلی ہوئی ہے۔ اسے وقت کے ہاتھوں صاف کیا ہے۔ اس لیے ان کی غزل کائنات کا آئینہ ہمیشہ صاف وشفاف اور چمچماتا ہوا نظر آیا ہے۔ آئینہ ان کی شاعری کا محور ہے۔

شائق مظفر پوری کی شاعری میں ہمیں ایک وژن نظر آتا ہے۔ ان کی زبان چست درست اور کلاسیکی آہنگ سے لبریز دکھائی دیتی ہے۔ جس میں جدت طرازی بھی ہے۔ کہیں کہیں صوفیانہ رنگ صاف جھلکتا ہے۔ کہیں عاجزی وانکساری، فقیرانہ انداز بیان اس طرح غالب ہے کہ پڑھتے وقت روحانی طمانیت کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔ تشبیہ واستعارے کے برمحل استعمال نے ان کے یہاں ایک ایسی تخلیقی فضا قائم کی ہے جس سے ان کا شعری نظام، عہد حاضر کی المنا کی، عصری حقائق، زمانے کی شکست وریخت کا تجربہ ومشاہدہ، صرف ان کا نہیں رہ جاتا بلکہ دوران مطالعہ قاری بھی اس میں برابر کا شریک نظر آتا ہے۔ جس کے باعث شعر کی ترسیل آسان ہو جاتی ہے اور قاری ذہنی کسرت سے بچ جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے ان کی شاعری کی۔

یوں تو 'نیا سورج' کے جنم کے ساتھ ہی شائق مظفر پوری کے اسلوب کی روشنی چہار سو پھیلنے لگی تھی۔ 'سفر لہجے کا' جب آہستہ آہستہ اپنی منزل کے آخری پڑاؤ پر پہنچا تو انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ 'آئینہ احساس کا' کے اندر 'نقطہ اور زاویہ' کا عکس جھلک رہا ہے۔ بار بار آئینے کے بیچ ایک 'نقطہ' ابھرتا ہے جو الگ الگ 'زاویہ' بناتا ہے۔ کبھی 90 ڈگری کا، کبھی 180 اور کبھی...... وہ مستقبل کی آنکھوں سے یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آگے بھی 'نقطہ' ابھرے گا اور اسی طرح 'زاویہ' بھی بڑھتا جائے گا۔ 17/ مئی 1939 کو خواجہ چاند چھپرہ میں جو ایک 'نقطہ' بن کر ابھرا تھا وہ 'غزل کائنات کا آئینہ' کر اپنی زندگی کی سترویں بہار میں مختلف شعری زاویے بناتا ہوا آخر کار 2/ اکتوبر 2008 کو عید کے دن دائرے میں تبدیل ہو کر اپنے مکمل ہونے کا ثبوت فراہم کر گیا۔

شائق ہمارے بعد بھی روشن رہے ڈگر
ایسا کوئی چراغ سر رہگزر جلے

کاش اس حقیقت سے لوگ آشنا ہوتے
اک چراغ سے شائق سو چراغ جلتے ہیں

اور چراغ سے چراغ جلانے کا کام اب شروع ہو گیا ہے اور امید ہے یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

■

Dr. Akhtar Azad
House No.: 38, Road No.: 1
Azad Nagar
Jamshedpur - 832110
Mob.: 9572683122
Email.: dr.akhtarazad@gmail.com

نیلوفر حفیظ

امیر خسرو دہلوی کی نقد نگاری

(دیباچہ غرۃ الکمال کے حوالے سے)

ابوالحسن یمین الدین بن سیف الدین محمود معروف بہ امیر خسرو دہلوی کشور ہند کی ان عظیم اور عبقری شخصیات میں سے ایک ہیں جن کی علمی وادبی خدمات کی شہرت، آفاقیت اور ہمہ گیریت نے از روز اول تا عصر حاضر ہزاروں اذہان وقلوب کو اپنے سحر وسرور میں گرفتار کر کے انھیں اپنا شیفتہ و دیوانہ بنا رکھا ہے۔ خالق کائنات نے اس بزرگ شخصیت کی ذات گرامی میں بیک وقت متعدد اعلیٰ خصوصیات کو ودیعت کر دیا تھا انھوں نے اپنے پر افادی اور آفاقی، ادبی وعلمی کارناموں سے نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کی فکر کو بے پناہ متاثر کیا تھا بلکہ آئندہ ادوار کے دانشوروں کے لیے بھی بیش قیمت سرمایہ فکر چھوڑ گئے تاکہ آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کے افکار وخیالات سے مستفیض ہوتی رہیں اور اپنے لیے آگے کی راہیں استوار کرتی رہیں، ان کا استدلالی طرز بیان، محققانہ چابک دستی، فلسفیانہ انداز فکر، انتقادی گہرائی، انشا پردازانہ سلیس بیانی اور شاعرانہ طرز کلامی میں حد درجہ جاذبیت، دلکشی اور سحر انگیزی کی کیفیت پائی جاتی ہے ان کی متنوع اور رنگا رنگ شخصیت کی جامعیت، معنویت اور عظمت کا اعتراف صرف ہندو ایران کے دانشوروں ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ دنیا بھر کے بڑے بڑے مورخین، منتقدین، مفکرین اور محققین کی جانب سے بھی ان کو ان کے آفاقی کارناموں کے سبب ہمیشہ خراج تحسین پیش کیا جاتا رہا ہے۔

امیر خسرو دہلوی ہندوستان کی تاریخ میں فارسی ادب کے ایک عظیم اور قد آور شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور اور مقبول رہے ہیں اور انھیں فارسی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے محققین، مورخین اور تذکرہ نویسندگان نے خصوصی طور پر فارسی ادب کے ایک برجستہ اور عالی مرتبہ شاعر ہی کے حوالے سے متعارف وروشناس کرانے پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اس کے علاوہ انھیں ہندی یا ہندوی زبان کے الفاظ، محاورے اور کہاوتوں کو اجاگر کر کے انھیں اردو زبان وادب کا اولین معمار اور ہندوی زبان کا نقاش اول ثابت کرنے کے سلسلے میں بھی دانشوروں نے کما حقہ توجہ صرف کی ہے اور اس صداقت کا اعتراف کرنے میں بھی کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کے کلام میں ہندوستانی رنگ وآہنگ کا بڑا حسین اور دلکش امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے اور ان کے فارسی کلام کے مجموعوں میں مخلوط ہندوی کلام بھی بڑی وافر تعداد میں تاریخ کی کتابوں کی زینت بنا ہوا ہے، اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امیر خسرو کے شعری کارنامے ان کے منثور کارناموں کے مقابلے میں زیادہ آب وتاب اور وقعت وقیمت رکھتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے منظوم آثار کی بازیافت کی طرف اکثر مصنفین اور محققین کی توجہ زیادہ مبذول رہی ہے، مگر یہاں اس حقیقت سے بھی چشم پوشی اختیار نہیں کی جانی چاہیے کہ امیر خسرو نے ایک نثر نویس کی حیثیت سے بھی کچھ کم وقیع اور گراں قدر کارنامے انجام نہیں دیے ہیں۔ ان کی شاعری ہی کی طرح ان کی منثور تصانیف بھی ان کے انفرادی رنگ اور جداگانہ آہنگ کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ نثر میں ان کی تین کتابیں بیدون کسی اختلاف کے امیر خسرو کی بہترین اور معرکۃ الآرا تصانیف قرار دی جاتی ہیں۔ ان منثور کتابوں میں ان کی سب سے اہم اور پہلی کتاب کا نام 'خزائن الفتوح' ہے ان کی بقیہ دو کتابیں 'اعجاز خسروی' یا 'رسائل الاعجاز' اور 'افضل الفوائد' ہیں۔ ان نثری کتابوں کے علاوہ انھوں نے اپنے شعری مجموعوں کے منثور دیباچے بھی تحریر کیے ہیں جو ان کے ایک بہترین نثر نویس ہونے کی دلیل ہیں۔

اس بات سے بھی شاید کم ہی لوگ واقف ہیں کہ خسرو ایک بہترین شاعر، موسیقی دان، تاریخ نویس، سیاست داں اور انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کے ایک بہترین ناقد بھی رہے ہیں۔ گو کہ ان کی شخصیت کی ہمہ گیری کے سبب ان کو فارسی ادب کے ناقد کی حیثیت سے بہت زیادہ شہرت اور قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔ ان کی ذات عالی کے لازوال ہنر وکمالات کے سحر میں گرفتار ہونے کے سبب دانشوران ادب ان کے ناقدانہ رنگ اور انتقادی رجحانات کی طرف اپنی بہت زیادہ توجہ مبذول نہیں کر سکے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے بے پناہ افادی انتقادی نکات جو فارسی شعر وادب سے خس وخاشاک کو دور کرنے میں نہایت اہم اور ضروری تصور کیے جاتے ہیں، ان کو وہ قدر ومنزلت حاصل نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے جب کہ سچ تو یہ ہے کہ خسرو سے قبل کسی بھی مفکر یا دانشور نے اپنی تحریروں میں فن شعر سے متعلق اتنے جالب اور عمدہ نکات دنیا کے سامنے پیش نہیں کیے تھے۔ ان کے بے پناہ افادی اور پرارزش انتقادی نکات وجہات اور اصول وضوابط کو ان کی منثور تحریروں بالخصوص ان کی شاعری کے مجموعوں کے منثور دیباچوں میں بآسانی دیکھا جا سکتا ہے خاص طور پر ان کی شاعری کا دیباچہ 'غرۃ الکمال'

میں ان کی ناقدانہ بصیرت وادراک تو اپنی پوری آب وتاب اور حدت وشدت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس دیباچے میں انھوں نے شعر وشاعری اور شاعر کے متعلق جو معیار ومیزان لازم قرار دیے ہیں وہ نہ صرف ان کے دور میں اہم اور لائق تقلید رہے ہیں بلکہ عصر حاضر کے جدید ناقدین ادب کے لیے بھی کچھ کم اہمیت وارزش کے حامل قرار نہیں دیے جاسکتے ہیں امیر خسرو کی بے پناہ انتقادی صلاحیتوں کا اعتراف بھلے ہی عہد وسطیٰ کے مفکرین کی طرف نہ کیا جاسکا ہو لیکن جدید محققین اور ناقدین نے امیر خسرو کے اس پہلو پر کماحقہ توجہ صرف کرنے کی اپنی پوری کوشش کی ہے اور یہ ثابت کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے کہ بحیثیت ادبی ناقد کے بھی خسرو کا مقام ومرتبہ بہت بلندوارفع ہے۔

'غرۃ الکمال' امیر خسرو دہلوی کے اشعار کا تیسرا سب سے بڑا اور پرارزش شعری مجموعہ ہے اس سے قبل وہ 'تحفۃ الصغر' اور 'وسط الحیات' کے نام سے اپنے اشعار کے دو بہترین دیوان ترتیب دے چکے تھے۔ اپنے اس تیسرے شعری مجموعے یعنی 'غرۃ الکمال' میں انھوں نے اپنی عمر کے چونتیسویں سال سے لے کر تینتالیسویں سال تک کے کلام کو مدون ومنظم کر کے پیش کیا ہے۔ اس شعری مجموعے میں کم وبیش ان کے نوے سے زائد قصائد اور ترجیعات ہیں اور تقریباً نو چھوٹی بڑی مثنویاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس دیوان میں متعدد رباعیات اور قطعات وغیرہ کو بھی یکجا کیا گیا ہے لیکن اس مضمون مختصر میں ان کی شاعری سے متعلق گفتگو کرنا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ اس دیوان کا منثور دیباچہ مورد بحث ہے جو انھوں نے اپنے اس دیوان کو ترتیب دینے کے بعد تحریر کیا تھا 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں خسرو نے عربی اور فارسی شاعری کے اضافی محاسن ومعائب، خوب وبد اور حسن وقبح کلام کے متعلق بڑی دلچسپ اور جالب بحث شامل کی ہے جو ادبی نقد کے نقطہ نظر سے خصوصی اہمیت وافادیت کی حامل قرار دی جاتی ہے۔ خسرو ہندوایران کے پہلے ایسے دانشور اعظم ہیں جس نے پہلی بار ادبی نقد کے متعلق باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اپنی آرا کو واضح انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اور ادبی نقد سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے۔ یہ بات بھی حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ خسرو سے قبل نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی کوئی اور کتاب، رسالہ یا باضابطہ تحریر نظر نہیں آتی ہے جس میں خالص فن شعر کے متعلق آزادانہ اور بے باکانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہو یہ افتخار اور انفرادیت صرف اور صرف امیر خسرو کو ہی حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے فارسی زبان کے اولین ادبی ناقد کی حیثیت سے فارسی شعروشاعری میں پائے جانے والے بہت ہی قیمتی اور پرافادی ادبی نکات اور فکر کن جہات کو اہل نظر کے سامنے باقاعدہ اور باضابطہ طور پر پیش کیا اور دیگر ادبی اصناف کی طرح اس صنف میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ان کے بیان کردہ یہ انتقادی نکات ان کے زمانے سے لے کر عصر حاضر تک یکساں اہمیت وافادیت کے حامل قرار دیے جاتے رہے ہیں۔

امیر خسرو کو نہ صرف کشور ہندوستان میں بلکہ خود ایران میں بھی فارسی زبان کے فن نقد کے پہلے اور سب سے بڑے فارسی زبان کے ادبی ناقد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے انھوں نے اپنے اس معروف دیوان یعنی 'غرۃ الکمال' کے دیباچے میں شعروشاعری کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اس کو شعروادب کا ایک بیش قیمت اور گرانقدر خزانہ قرار دیا ہے مصنف نے اس دیباچے میں شعر کی مختلف اقسام کے بارے میں بھی تفصیلی طور پر بتایا ہے اور بہت سے علمی نکات سے متعلق بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اس دیباچے کی بے پناہ افادیت اور اہمیت کے سبب یہ ابتدائی دور ہی سے دانشوروں کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز رہا ہے اور خسرو کے پیش کردہ تنقیدی نکات بھلے ہی ابتدائی دور میں لوگوں کے لیے بہت زیادہ دلچسپی اور کشش کا باعث نہ رہے ہوں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ان کے اس تنقیدی سرمایے کی اہمیت اور ضرورت کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا اور باریک بینی کے ساتھ ان نکات کا نہ صرف مطالعہ ومحاسبہ کیا گیا بلکہ ان کو تراجم کی مدد سے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ نہ صرف فارسی بلکہ دیگر زبانوں کے ادب کی نوک پلک کو مزید سنوار کر اس کو رعنائی وتابندگی عطا کی جاسکے اور دانشوروں کی جانب سے ان تنقیدی نکات کی افادیت وارزش کا جس جوش وخروش کے ساتھ استقبال کیا گیا ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خسرو نے ایک ایسا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جو ہمیشہ ادب کے لیے نافع اور بیش قیمت ثابت ہوگا۔ مولوی حافظ سید نظامی اس کلیات کے دیباچے کی گوناگوں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''دیباچہ خود حضرت سلطان الشعرا امیر خسرو طوطی ہند علیہ الرحمتہ نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کا نثر فارسی تحریر کیا ہے فارسی علم وادب کا عجیب وغریب گنجینہ اور علمی رموز ونکات کا نادرونایاب خزینہ ہے۔''

(دیباچہ غرۃ الکمال، امیر خسرو مرتب مولوی حافظ سید سین علی نظامی، مطبع قیصریہ دہلی، ص ۱)

'غرۃ الکمال' کا دیباچہ حمد باری تعالیٰ سے شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد نعت رسول سے صفحات کو زیب زینت دی گئی ہے اس کے بعد انھوں نے شعر وشاعری سے متعلق اپنے بیش قیمت اور پرارزش نظریات وافکار کو بیان کیا ہے۔ دیوان کے اس دیباچے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر خسرو نظم اور نثر دونوں ہی کی افادیت اور اہمیت کے قائل ہیں اور منظوم ومنثور دونوں ہی میں ادبی آثار کے پیش کرنے کو سماج ومعاشرے کی فلاح کا وسیلہ تصور کرتے ہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ وہ اثر آفرینی، زیبائی اور دلپذیری کے اعتبار سے نثر کے مقابلے نظم کو زیادہ فوقیت اور ترجیح دیتے ہیں اور نظم کی موزونیت اور سحر انگیزی پر وہ ہزاروں منثور جملے قربان کر دینے کو تیار نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نثر کتنی ہی بہترین اور اعلیٰ درجے کی کیوں نہ ہو لیکن نظم کے ہم مرتبہ قرار نہیں دی جاسکتی ہے۔ اب میں یہاں 'غرۃ الکمال' سے ایک اقتباس نقل کر رہی ہوں جس میں اس دانشور اعظم نے بتایا ہے کہ نظم حکمت کے میزان کے لیے خالص سونے کی مانند ہوتی ہے اگر نظم کو توڑا جائے تو وہ نثر ہو جاتی ہے لیکن اگر نثر کو توڑا جائے تو وہ بے معنی، بے ہنگم اور بے وقعت ہو جاتی ہے۔ خوانندہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت وارزش باقی نہیں رہتی ہے اور وہ سامع کے ذوق پر سخت گراں گزرتی ہے البتہ نظم کو اگر ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جائے تو اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم رہتی ہے یعنی وہ قابل فہم ہوتی ہے۔

اس دیوان کے دیباچے کے مطالعے سے ایک اور اہم بات جو نگاہ وفکر کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خسرو کے مطابق عربی زبان، فارسی زبان کی بہ نسبت زیادہ وسعت اور کشادگی رکھتی ہے اس میں اپنے خیالات واحساسات کے اظہار کے لیے الفاظ کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے جبکہ فارسی زبان الفاظ کے اس خزانے کا

براہ راست مقابلہ کرنے سے قاصر ہے کیونکہ عربی کے مقابلے اس زبان میں ذخیرۂ الفاظ بہت کم نظر آتا ہے لیکن اگر فارسی شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو خسرو عربی کے مقابلے فارسی زبان کی شاعری کو زیادہ ترجیح وتوفق دیتے نظر آتے ہیں اوراس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اس زبان کے اہل زبان نے اپنے کلام میں وزن اور بحور کا خصوصی طور پر اہتمام والتزام کیا ہے جبکہ اس کے برعکس اہل عرب کے یہاں زحافات کی اجازت کے سبب شعر کا وزن درست نہیں رہ پاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات عربی زبان کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ ترین شعر بھی پست اور ناموزوں محسوس ہونے لگتا ہے وہ مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ ایرانیوں نے شعروشاعری میں محض قافیے پر اکتفا نہ کرتے ہوئے قافیہ کے ساتھ ساتھ ردیف کو بھی ایجاد کیا ہے جس کے سبب فارسی شعر کی اثر آفرینی، دلکشی اور دلپذیری میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے اور اتنا طول وطویل وقت گزر جانے کے بعد عربی زبان کو یہ بات ابھی تک میسر نہیں ہوسکی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں فارسی اشعار کی سی حلاوت وعذوبت پیدا کرسکے، یہاں یہ بات بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ امیر خسرو مذہبی اعتبار سے عربی زبان کو بڑا اعلیٰ، معتبر اور پاکیزہ تصور کرتے ہیں اوراس کو اس دنیا کی بہترین زبان قرار دیتے ہیں لیکن اگر شعری نقطہ نظر سے بات کی جائے تو وہ فارسی زبان کا مرتبہ عربی زبان سے کہیں زیادہ بلند اوراعلیٰ تصور کرتے ہیں اور اس کی حمایت میں مختلف تاویلات بھی پیش کرتے ہیں۔

امیر خسرو نے اپنے اس دیوان کے دیباچے میں اس اہم اور بے حد ضروری نکتے پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے کہ شعرگوئی معمولی اور عام سا فن نہیں ہے شعرگوئی میں ملکہ حاصل کرنے کے لیے شاعر کو بہت سے سخت اصول وضوابط اور قواعد وبندشوں کے التزام کی ضرورت ہوتی ہے، شعری آئین وضوابط کی پاسداری کے عوض ہی کسی شاعر کے کلام کو ہمہ گیری، شہرت اور آفاقیت حاصل ہوسکتی ہے، ان کے نزدیک ہر کس وناکس شعر کہنے پر قادر نہیں ہوسکتا ہے اس فن کی تنگیوں، گہرائیوں اور مشکلوں سے وہی لوگ عہدہ برآ ہوسکتے ہیں جو غیر معمولی فہم وفراست اور ذہانت ولیاقت کے مالک ہوں اور جن کا ذہن اردگرد کی اشیا کی حقیقت تک رسائی پانے میں ذرا بھی دیر نہ لگائے وہ دوررس نگاہ کے مالک ہوں اوران کی فکر ونظر دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ واضح اور دقیق ہو اور یہ خصوصیات ہر فن کار کو حاصل نہیں ہوسکتی ہیں۔

امیر خسرو نے اپنے اس دیباچے میں شاعروں کے متعلق درجات بھی قائم کیے ہیں انھوں نے تین درجوں کا ذکر کیا ہے جن کی مدد سے شاعر کے درست مرتبے اور مقام کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے ان کے مطابق عام طور پر ہمارے اطراف وجوانب میں تین قسم کے شاعروں کو دیکھا جاسکتا ہے یا ان کے تین درجے کیے جاسکتے ہیں اس میں سب سے پہلا درجہ 'استاد تمام' دوسرا 'استاد نیم تمام' تیسرا اور آخری درجہ 'سارق' کا ہوتا ہے۔

1 استاد تمام: یعنی وہ شاعر جو کسی خاص طرز یا صنف کا بنیاد گزار ہو یعنی جس نے شاعری کی دنیا میں اپنا کوئی مخصوص طرز یا روش ایجاد کی ہو اس پہلے درجے میں حکیم سنائی، انوری، ظہیر فاریابی اور نظامی گنجوی وغیرہ جیسے بزرگ فارسی شاعروں کا نام لیا جاسکتا ہے جن کا اپنا جداگانہ رنگ اور انفرادی آہنگ ہے۔

2 استاد نیم تمام: یہ شاعر کا دوسرا درجہ ہوتا ہے اس میں شاعر خود تو کسی طرز تازہ کا موجد نہیں ہوتا ہے لیکن وہ کسی مخصوص طرز اور روش کی تقلید وپیروی کرتا ہے اوراسی تقلید میں اپنا ایک خصوصی مقام اور انفرادی مرتبہ حاصل کر لیتا ہے اور مقلد ہوتے ہوئے بھی فن شعر میں شہرت وناموری حاصل کر لیتا ہے۔

3 سارق: اس درجے میں خسرو ان شعرا کو رکھتے ہیں جو نہ تو براہ راست کسی طرز تازہ کے موجد ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی شاعر کی تقلید اختیار کرتے ہوئے کمال حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس تیسرے درجے میں نااہل شاعر دوسرے شاعروں کے مضامین کو چرا کر اپنا بنا لیتے ہیں سرقہ وتوارد پر ان کی شاعری کی تمام تر بنیاد ہوتی ہے، امیر خسرو سارق شعرا کو سخت ناپسندیدہ تصور کرتے ہیں اوران کو لائق مذمت قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنے اس منثور دیباچے میں ایک عالی اور استاد شاعر بننے کے سلسلے میں بھی کئی ضروری بلکہ لازمی شرائط کو بیان کیا ہے اور شاعر کے لیے ان کا التزام بے حد ضروری قرار دیا ہے ان کے مطابق کوئی بھی شاعر اس وقت تک ایک بہترین اور برجستہ شاعر نہیں بن سکتا ہے جب تک کہ اس میں مندرجہ ذیل چار خصوصیات نہ پائی جاتی ہوں:

1 ایک عالی مرتبہ اور آفاقی شاعر ہونے کے لیے پہلی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ شاعر اپنی شاعری کا پرچم ایسے طرز پر نصب کرے جو اس کی اپنی ایجاد کردہ ہو یعنی وہ صرف اندھی تقلید وپیروی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنا ایک انفرادی رنگ اختیار کرے اور طرز تازہ کے ذریعے عوام وخواص کو اپنا گرویدہ بنا لے اور جہان شاعری میں اپنی مخصوص روش قائم کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کرے تاکہ لوگوں پر اس کی کہی ہوئی باتوں کا خاطر خواہ اثر ہو اور قاری شاعر کی عنایت کردہ عینک کی مدد سے گردوپیش کا معائنہ ومحاسبہ کرنے پر مجبور ہوجائے۔

2 ایک استاد اور بزرگ شاعر ہونے کے سلسلے میں انھوں نے دوسری لازمی شرط یہ بتائی ہے کہ شاعر کا ہمہ کلام شیریں، سہل اور سلیس ہو شاعر نے شعر کو واعظوں اور ناصحوں کی طرز پر نہ کہا ہو یعنی شاعر کا کلام شاعروں کی نہج وروش ہی کے مطابق ہونا چاہیے ایسا نہ ہو کہ خالق شعر پند ونصائح کے دفتر قارئین کے سامنے کھول کر رکھ دے جو اذہان کو لطف وانبساط سے ہمکنار کرنے کے بجائے انتشار اور بیزاری کی کیفیت پیدا کردے اوران کے قلوب کو مشوش اور ملول بنا دے اس قسم کے شاعر بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوپاتے ہیں اور نہ ہی ایک شاعر کی حیثیت سے ان کو معاشرے میں کوئی شناخت حاصل ہوپاتی ہے۔

3 امیر خسرو کے مطابق ایک بہترین شاعر ہونے کے لیے تیسری اہم اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی شاعری زبان وبیان کی لغزشوں اور اغلاط سے پاک ہو یعنی شاعر اس بات کی شعوری کوشش کرے کہ زبان وبیان کی اغلاط اس کے سخن کی رنگینی اور رعنائی کو ضائع نہ کردیں اور نہ ہی وہ سخن کے لفظی ومعنوی حسن کو نظرانداز کرتے ہوئے شعر کہے کیونکہ اگر وہ محتاط نہیں رہے گا تو اس کی کہی ہوئی بات کو عوام وخواص کے درمیان میں کوئی خاص اعتبار واہمیت حاصل نہیں کرسکے گی۔

4 آفاقی شاعر کے لیے چوتھی اور آخری شرط جو امیر خسرو کی طرف سے ضروری قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر ادبی خیانت کرنے والا ہرگز بھی نہ ہو یعنی ایک عظیم المرتبت اور قدآور شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ایسے درزی کی طرح ہرگز بھی کام کرنے کی کوشش نہ کرے جو دیگر لوگوں کا کپڑا چوری کرکے اپنے لیے ایک قبا تیار کر لیتا ہے یعنی اگر شاعر دیگر شعرا کے مضمون چرا کر اپنے کلام کی پیوندکاری کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کبھی بھی ایک اچھا شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے شاعری میں دوسرے شاعر کے مضامین کی چوری کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور غیر اخلاقی فعل ہے جس سے بچنے کی خصوصی کوشش کرنا چاہیے۔

خسرو دہلوی نے صرف ایک استاد شاعر ہی کی خصوصیات پر روشنی نہیں ڈالی ہے بلکہ ایک شاگرد دیانت دار کے لیے بھی کچھ ضروری شرائط اور حدبندیاں قائم کی ہیں ان کے مطابق جس طرح ایک شاعر میں کچھ خصوصیات کا ہونا لازم ہے اسی طرح ایک شاگرد میں بھی کچھ صفات کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر ایک اچھا شاگرد نہیں بنا جا سکتا اور جب کوئی اچھا شاگرد ہی نہ بن سکے تو پھر اس کے اچھا شاعر ہونے کی امید بھی نہیں کی جاسکتی ہے وہ خصوصی

طور پر اس بات کی ہدایت کرتے ہیں کہ وہ شخص جو اپنے شعری سفر کا آغاز کر رہا ہے وہ مندرجہ بالا نکات پر اپنی پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ غور وفکر کرے اور ان پر عمل پیرا بھی ہو، تاکہ شاعر اور اس کے کلام کو مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہو سکے، خسرو نے شاگرد کے بھی تین درجے بیان کیے ہیں جن کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے۔

1 شاگرد اشارت: خسرو کے مطابق ایک شاگرد کے لیے سب سے پہلی اور اہم چیز یہ ہے کہ وہ اپنے استاد کی اصلاح کو بغور سنے اور اس کے بتائے ہوئے نکات کی روشنی میں اپنے کلام کو اغلاط، لغزشوں اور خامیوں سے پاک کرنے کی طرف پوری ادبی سنجیدگی کے ساتھ متوجہ اور راغب ہو اس کے علاوہ شاگرد کلام کی دشواریوں اور مشکلوں سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو یعنی وہ یہ نہ سمجھے کہ شعر گوئی کوئی سہل یا آسان کام ہے اور اس کو جیسے مرضی چاہے انجام دیا جا سکتا ہے۔

2 شاگرد عبارت: خسرو کا کہنا ہے کہ ایک شاگرد کو اپنی کامیابی اور کامرانی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کسی صاحب ہنر وکمال کی پیروی اور تقلید اختیار کرنے کی کوشش تو کرے لیکن اپنی انفرادیت کو بھی نظر انداز نہ کرے کیونکہ بغیر کسی استاد شاعر کی روش کی پیروی اور تقلید کے اس میں عمدہ شاعرانہ خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتی ہیں ایک ہوش مند شاعر ہمیشہ کسی ماہر فن سے اصلاح لینا ضروری سمجھتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ ایسا کیے بغیر کوئی شاگرد کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

3 شاگرد غارت گر: خسرو کا ماننا ہے کہ ایک اچھے اور ذی فہم شاگرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے استاد کے اشعار کی نقب زنی کرے یعنی شاگرد کو چاہیے کہ وہ سیندھ لگا کر بیٹھا رہے اور جیسے ہی کوئی مناسب موقع پائے اپنے استاد کے سرمایے کو، مراد اس کے کلام کو چرا کر اپنا بنا لینے کا کوئی موقع ضائع نہ کرے کیونکہ یہ اس کا حق ہے اور وہ اس طرف سے غفلت اختیار نہ کرے تاکہ اس کو شعر گوئی میں نمایاں اور انفرادی مقام حاصل ہو سکے۔

امیر خسرو صرف دوسرے شاعروں کے کلام کے متعلق ہی شعر وشاعری کے اصول وضوابط متعین نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ ایک ہوش مند، دیانتدار اور ذی فہم ادبی ناقد کی حیثیت سے اپنے کلام کے متعلق بھی اپنی بیش قیمت آرا رقم کرتے ہیں ان کو اپنی فارسی دانی اور شعر گوئی میں اپنے اعلیٰ درجے اور بلند مرتبے کا بخوبی احساس تھا وہ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ معاصرین میں کوئی ان کا مد مقابل نہیں ہے اور یہی وہ احساس ہے جو کہ ایران کے بزرگ ترین شاعر نظامی گنجوی سے براہ راست نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے حالانکہ خسرو نے اکثر وبیشتر مقامات پر خود کو نظامی کے مقلدین میں شمار کیا ہے با این ہمہ وہ اپنے کلام کی عظمت واہمیت کو نظامی کے کلام پر ترجیح وتفوق دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

کوکبہ خسرویم شد بلند   زلزلہ در گور نظامی فکند

نظامی سے ہم سری کرنے والا ہمارا یہ شاعر اپنی تمام تر شعری عظمت کے باوجود بھی خود کو مرتبہ استادی کے اہل نہیں پاتا اور اپنے کلام میں موجود اغلاط ولغزشوں کا اعتراف کرتا ہے اور اپنے آپ کو شاگرد یا طالب علم کے مرتبے پر رکھنا زیادہ پسند کرتا ہے اور خود کو غزل گوئی میں سعدی شیرازی، مثنوی نگاری میں نظامی گنجوی، قصائد میں کمال اسماعیل اصفہانی، پند وموعظت میں حکیم سنائی اور خاقانی شیروانی وغیرہ جیسے عظیم ایرانی شاعروں کا مقلد تصور کرتا ہے یہ ان کی ادبی دیانت داری اور حقیقت پسندی ہی ہے، جس کی وجہ سے وہ ببانگ دہل اپنی شاعری میں موجود لغزشوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں اور خود کو اس زبان وادب کا ایک بہت ہی معمولی اور ادنیٰ سا طالب علم سمجھتے ہیں اور بار ہا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ سخن وری کے میدان میں ان کو کبھی بھی دعوی یکتائی نہیں رہا ہے بلکہ وہ تو اس مرحلے میں خود کو ہر مقام پر ناتمام اور نامکمل پاتے ہیں ملاحظہ کیجیے ان کا ایک شعر جس میں وہ اپنی ناتمامی کا اقرار بڑے ہی پرشکوہ انداز میں کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ دھم از انصاف خود اینجا تمام
نا تمام   ناتمام   نا تمام

یہ امیر خسرو کی بے پناہ ادبی دیانت اور صداقت ہی تو ہے کہ جس کے سبب وہ اپنے کلام کے متعلق بھی بے لاگ رائے دیتے ہیں حالانکہ خود اپنے کلام کے متعلق غیر جانبدارانہ رائے پیش کرنا ایک دشوار ترین امر ہے لیکن خسرو ایک ناقد صادق کی طرح اپنے کلام پر اظہار نظر کرتے ہیں اور اپنے مخالفین یا معترضین کو اس بات کا موقع نہیں دیتے کہ وہ ان کے کلام پر ایراد وگرفت کر کے انھیں بدنام کرنے کی کوشش کریں اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی جیسے بڑے ناقد ان کی اس ناقدانہ صداقت ودیانت داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امیر کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ رائے نہیں دے سکتا۔''

(شعر العجم حصہ دوم، علامہ شبلی نعمانی، معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2010، ص 119)

امیر خسرو نے اپنے اس دیباچے میں نقد شعر کے ساتھ ساتھ فہم شعر کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور فہم شعر کے لیے بھی کئی اہم اور ضروری اصول وقواعد مقرر کیے ہیں جن کے بغیر سامع ایک اچھے شعر کی نہ تو داد وتحسین دے سکتا ہے اور نہ ہی کسی عمدہ شعر سے لطف وانبساط حاصل کر سکتا ہے کیونکہ شعر وشاعری کے تقاضوں کو پورا کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے انھوں نے دیباچے میں 'صاحب طبع' اور 'طبع وقاد' کی صفت شاعر اور قاری دونوں ہی کے لیے استعمال کی ہے یعنی خسرو کی نظر میں شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں کے لیے طبع موزوں اور مناسبت مزاج کو ضروری قرار دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ شاعر اور قاری دونوں ہی کا اعلیٰ صلاحیتوں اور نیک صفات کا حامل ہونا ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر شعر وشاعری کا اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا ہے، انھوں نے نا اہلوں کی شدید مذمت کی ہے اور ان کو شعر وادب کی خوبصورت سلطنت کے لیے رہزن کی مانند قرار دیا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو کا فن نقد سے متعلق جو گہرا شعور اور ادراک ہمیں ان کی اس کلیات کے اس منثور دیباچے میں نظر آتا ہے وہ عصر حاضر میں اس فن کے اتنا زیادہ ترقی کر لینے کے باوجود بھی ناقدین ادب کے لیے مورد استفادہ اور قابل تقلید ہے ان کی تحریروں کے مطالعے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نظریہ نقد فن اپنے ابتدائی مراحل میں بھی بہت زیادہ روشن، واضح اور پختہ تھا، ان کے ذہن میں شعر وشاعری کی نقد وتنقید سے متعلق جو بھی نکات وجہات تھے وہ بہت مستحکم اور بالیدہ تھے، جن کا ان کی طرف سے برملا اظہار بھی کیا گیا ہے ان کا نظریہ نقد فنی تقاضوں اور مطالبات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور اعلیٰ حکمت وحقائق سے لے کر اپنے گرد وپیش کے سیاسی وتہذیبی وقائع تک کو بھی کائناتی اور تقدیری معاملات کے پس منظر میں اپنے نازک اور باریک خیالات وعمدہ احساسات کا جزو بنا لیتا ہے ان کی یہ ناقدانہ قابلیت اور انتقادی بصیرت بلا شبہ ان کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو ہے، جس کی نمو وپرداخت اس شخصیت عالی نے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے خون جگر سے کی ہے اور یہی سبب ہے کہ آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کے افکار ونکات میں کسی قسم کی کوئی کہنگی وفرسودگی کا معمولی سا شائبہ بھی نہیں گزرتا ہے اور دور حاضر کے فارسی ادب کے ناقدین کے لیے بھی ان کے یہ انتقادی نکات اتنے ہی مورد تفکر اور سزاوار تقلید ہیں جتنے کہ خود ان کے اپنے عہد میں رہے تھے۔

■

Dr. Neelofar Hafeez
Asst Pfoessor, Depf of Persian
and Arabic,Allahabad University
Allahabad - 211002 (UP)
Mob.:7500984444

مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری پر ایک نظر

تسلیم عارف

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ہندوستان کی جلیل القدر ہستیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ولادت مکہ میں ہوئی لیکن اہلِ کلکتہ کے لیے یہ افتخار کی بات ہے کہ 48 برس کا طویل عرصہ مولانا نے یہاں گزارا۔ ان کے تعلیمی مراحل یہیں طے ہوئے، یہیں صحافت کو انھوں نے ایک نئی طرح دی۔ شہر کلکتہ اہلِ بصیرت، اہلِ نظر اور دانشوروں کا مرکز رہا ہے۔ ظاہر ہے اس ماحول سے اور یہاں کی فضا سے مولانا آزاد جیسی شخصیت خود کو نہیں بچا سکتی تھی، لہٰذا انھوں نے بھی اس شہر کے ماحول اور فضا سے متاثر ہوتے ہوئے اپنے دل و دماغ میں ادیب بننے کی تمنا کی۔ گویا کلکتہ مولانا کا دوسرا وطن ثابت ہوا۔ مولانا کی شخصیت چوں کہ شش جہات تھی، لہٰذا وہ عالم، فاضل، شاعر، صحافی، سیاست داں اور ماہر تعلیم بنے۔ مولانا آزاد کو عوام و خواص میں بہ حیثیت سیاست داں، صحافی اور ادیب خوب شہرت ملی لیکن ان کی طبیعت کا ایک خاص وصف ان کی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری سرمایہ قلیل ہے یا یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا کی مصروفیت چوں کہ مختلف میدانوں میں رہی ہے اور شاعری وقت کا تقاضا کرتی ہے، جو مولانا جیسی عبقری شخصیت کے یہاں نظر نہیں آتی۔ باوجود اس کے مولانا نے شاعری کرتے ہوئے مقدار کا نہیں بلکہ معیار کا خیال رکھا۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا کو سیاست اور صحافت سے خاص دلچسپی تھی لیکن ان کا طبعی میلان شاعری کی جانب بھی تھا۔ ابتدائی عمر میں ہی انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ مولانا نے نعت، غزل، رباعی اور قطعہ جیسی مروجہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی اور قابلِ قدر اشعار بھی کہے۔ ان کے نام کے ساتھ 'آزاد' بھی شاعری کی ہی دین ہے۔ یہ تخلص انھوں نے عبدالواحد خاں ادیب کے مشورے پر رکھا تھا، جن سے مولانا کے گہرے مراسم تھے۔ مولانا آزاد کو شاعر بنانے میں عبدالواحد خاں ادیب سہسرامی نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اُن کی شخصیت سے مولانا بہت متاثر تھے۔ عبدالواحد اکثر مولانا کو مشاعروں کی روداد سناتے، اپنے اشعار سنا کر مولانا آزاد کے ذہن و دل کو شعر فہمی اور شعر گوئی کی جانب متوجہ کرتے۔ اس ضمن میں عبدالقوی دسنوی رقم طراز ہیں:

''مولوی عبدالواحد صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی، وہ مختلف انداز سے اردو شعرا کا تذکرہ کرتے، اشعار سناتے اور ان کے پیچھے اگر کوئی واقعہ ہوتا تو اس سے بھی آگاہ کرتے۔ وہ شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کے معرکوں کی تفصیل بیان کرتے اور ان ملاقاتوں کو ادبی لطائف سنا کر اور زیادہ دلچسپ بنا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی دلچسپی شاعری سے روز بروز بڑھتی گئی۔ انھوں نے مرزا رفیع سودا، میر تقی میر وغیرہ کے دیوان خریدے، جن کا وہ فرصت کے اوقات میں مطالعہ کرنے لگے۔ شعر و شاعری سے رغبت اور دواوین کے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد خود شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے ..... شعر و شاعری سے دلچسپی ہی کی وجہ سے انھوں نے 'آبِ حیات'، 'حیاتِ سعدی' اور 'یادگارِ غالب' خریدیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ یہ وہی زمانہ ہے، جب بمبئی سے ایک گلدستہ 'ارمغان فرخ' نیا نیا نکلا تھا۔ کلکتہ کے شعرا بھی اس کی 'طرح' پر ہر ماہ مشاعرہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ 'ارمغان فرخ' میں مصرع طرح تھا۔

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

عبدالواحد خاں سہسرامی نے چند شعر اس 'طرح' میں کہے اور مولانا آزاد کو سنائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مولانا آزاد کے دل میں شعر کہنے کی خواہش جاگ اٹھی۔''

(حیات ابوالکلام آزاد، عبدالقوی دسنوی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2000، ص 108)

ابوالکلام آزاد ایک دینی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے آبا و اجداد شریعت اور دین کے احکام کے پابند تھے۔ بچپن سے ہی مولانا کو دینی ماحول ملا تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب انھوں نے شاعری شروع کی تو صنف نعت پر خصوصی طبع آزمائی کی۔ ان کی نعتیں 'صحن چمن' اور 'سفینۂ نجات' جیسے جرائد میں شائع ہوئیں۔ مولانا نبی اکرمؐ کی ذات بابرکات اور شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ حضرت مصطفیٰؐ کے قدم مبارک جہاں بھی پڑے، وہاں سے ظلمت چھٹتی گئی۔ اللہ کے نبی انسانیت کے علمبردار تھے۔ سرور کونینؐ کی شان میں کہے گئے آزاد کے اشعار نہ صرف دلوں میں حرارت پیدا کرتے ہیں بلکہ حضور اکرمؐ سے شاعر کی گہری عقیدت اور محبت کی غمازی بھی کرتے ہیں۔ آزاد کا دل حضورؐ کی محبت سے لبالب ہے۔ وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ رسول اکرمؐ کی نگاہِ التفات ان پر پڑے۔ شاعر کو اس بات کا تیقن ہے کہ اس کی شاعری میں تاثیر کا سبب بس یہی ہے کہ اس نے اوصافِ نبی کو اپنے اشعار میں رقم کیا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

معمور دل ہے یادِ شہِ مشرقین سے
اس گھر میں دو جہاں کی ہے دولت بھری ہوئی

ہر بیت میں جو وصفِ پیمبر کیے رقم
کاشانۂ سخن میں مرے روشنی ہوئی

آزاد پر بھی ہو نگہِ لطف یا رسول
ہے دل میں آرزوئے شفاعت بھری ہوئی

مولانا نے نعت کے ساتھ ساتھ رباعی اور قطعہ بھی کہے ہیں۔ ان اصناف میں انھوں نے اپنی ذات اور طبیعت کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ اپنی ایک رباعی میں انھوں نے اپنی ڈھلتی عمر اور مرض کا شکوہ کیا ہے۔ مولانا کو قلق ہے کہ ان کے بچپن کے دن نہ رہے، عیش کی جوانی بھی نہ رہی۔ ایک بڑھاپا ہی بچا تھا، سو وہ بھی بیماری کی نذر ہو گیا۔ اس رباعی میں گویا مولانا نے اپنی پوری عمر کی روداد بیان کر دی ہے۔ یہ شاعرانہ کمال نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک انسان اپنی پوری عمر کا قصہ چار مصرعوں میں سنا دے۔ رباعی ملاحظہ ہو۔

افسوس وہ بے غمی کی طفلی نہ رہی
افسوس وہ عیش کی جوانی نہ رہی
لے دے کے رہی تھی ایک پیری اے مرگ
تو کیا آئی کہ ہائے وہ بھی نہ رہی

ایک رباعی میں آزاد قاصد پر برس پڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب قاصد آزاد کو ان کے محبوب کی حرکتوں سے باور کراتا ہے تو وہ برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ ان کو اپنا محبوب اس قدر پیارا ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ ملاحظہ ہو۔

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
صحبت دن رات ہے، مداراتیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو
عاشق سے وہ منہ لگائے یہ باتیں ہیں

اپنے ایک قطعہ میں آزاد نے ایک ایسے شخص کے حالِ زار کو بیان کیا ہے جو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر بناتا ہے اور زار و قطار روتا ہے۔ اس کی کیفیت پر لوگ اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں لیکن آزاد نے اسے ایک ہوشیار شخص سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک علامتی قطعہ ہے جس میں آزاد یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں اپنے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا کون سا عمل درست ہے اور کون سا نہیں؟ قطعہ ملاحظہ ہو۔

آزاد کل جو سیر کو صحرا کی میں گیا
دیکھا کہ ایک شخص وہاں بے قرار تھا
اپنی بنا کے قبر اسے دیکھتا تھا وہ
پھر دیکھ کر اسے وہ بہت زار زار تھا
کہتی تھی اس کو خلق کہ دیوانہ ہو گیا
دیکھا جو میں نے، ایک ہی وہ ہوشیار تھا

مولانا آزاد نے صنفِ غزل پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شعری زنبیل میں ایک ایسی غزل ملتی ہے جو 59 اشعار پر مبنی ہے اور جس میں روایت کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ اتنی طویل غزل اردو کے شعری سرمائے میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس میں مولانا نے اپنی شاعرانہ فنکاری کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے کسی بھی شعر کو بے بحر نہیں ہونے دیا ہے۔ اس غزل میں عشقیہ جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے ساتھ ہی شاعر اپنے حالِ دل اور داستانِ عشق کو شعری لبادہ عطا کر رہا ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس غزل کے 27 اشعار ماہنامہ 'سخن چمن' کے ستمبر 1902 کے شمارے میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ غزل مصرع طرح 'توبہ کا نام لیں مرے دشمن بہار میں' پر کہی گئی ہے جو بر وزن ''مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن' ہے اور اس کی بحر 'مضارع مثمن مکفوف محذوف مقصور' ہے۔

غزل کا مطلع بڑ چونکانے والا جس میں مولانا آزاد خود کو ایک معصوم اور ناتواں عاشق گردانتے ہوئے اپنی ذات کا کل سرمایہ یعنی اپنی 'جان' کو اپنے محبوب کے بس میں بتاتے ہیں۔ بعض حکیموں اور فلاسفروں کا کہنا ہے کہ عشق ایک لاعلاج اور ساتھ ہی ایک خطرناک مرض ہے۔ عشق دنیا کا واحد ایسا مکتب ہے جس کے متعلم کو سبق یاد کرنے پر چھٹی نہیں ملتی۔ جب انسان کو پریم کا روگ شدت سے جکڑتا ہے تو اس کا ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے اور دماغ کے بعد اس کا جسم ناتواں ہونے لگتا ہے۔ دریائے عشق میں ڈوبا انسان غم و اندوہ سے لبالب ہوتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت مطلع میں ہمیں مولانا کی بھی نظر آتی ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

چھوڑا نہ غم نے کچھ بھی مرے جسمِ زار میں
اک جان ہے سو وہ بھی ترے اختیار میں

عاشق کو اپنے محبوب میں کبھی کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ حالانکہ انسان کی سرشت میں خوبی اور خامی دونوں موجود ہے لیکن معشوق تو گویا اپنے چاہنے والے کے لیے فقط خوبیوں کا مجسمہ ہوتا ہے۔ اُس کی ادا، اس کے عادات و اطوار، اس کی شوخی و رعنائی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ مولانا بھی اس غزل میں اپنے پیارے صنم کی تصویر یوں کھینچتے ہیں کہ محبوب کا سراپا ہمارے سامنے رقص کرنے لگتا ہے لیکن یہاں بھی آزاد نے کسی ایسے لفظ کا استعمال نہیں کیا کہ ان کا محبوب سرِ عام ذلیل و خوار ہو۔ اشعار پیش کر رہا ہوں۔

وہ پیاری پیاری شکل وہ انداز دل فریب
رہتا نہیں ہے دیکھ کے دل اختیار میں
پیدا ہے رنگ حسن جوانی سے یار میں
جوبن پہ جس طرح سے ہو گلشن بہار میں
بجلی سی کوند جاتی ہے گھونگھٹ کے آڑ میں
کیا شوخیاں ہیں اس نگہِ شرمسار میں

انسان کی موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ابدی نیند ہمیں لحد کی گود میں ہی سونا ہے۔ کیا امیر کیا غریب، افسر شاہی ہو یا عام انسان، عاشق صادق ہو یا ظالم و جابر، سبھوں کو ایک دن موت کی چادر تاننی ہے۔ قبر میں دفن ہو جانے کے بعد مرحوم کے چاہنے والے یا اُس سے عقیدت رکھنے والے مزار بنا دیتے ہیں۔ مولانا نے مزار کے شب و روز، اپنی حسرت اور بے کسی و بے بسی، افسردگی، تڑپ اور بے چینی و بے قراری کو تغزل کی زبان عطا کر دی ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

چپکے سے جب رقیب کو بیدار واں کیا
اللہ رے جذب! چونک گئے ہم مزار میں
تیرے خیال دید نے بیدار کر دیا
جب آنکھ لگ گئی مری دم بھر مزار میں
پوچھا کسی عزیز نے آ کر نہ بعدِ دفن
بتلا کہ کیا گزرتی ہے تجھ پر مزار میں
ہے عکسِ روئے یار، دلِ داغ دار میں
کچھ تیرگی نہیں ہے ہمارے مزار میں
نکلی ہے جان حسرتِ دیدارِ یار میں
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ابھی تک مزار میں
لے نکلے گا تڑپ کے وہ مجھ کو بھی قبر سے
میں دل کے ساتھ رہ نہ سکوں گا مزار میں
ٹھہری نہ خاکِ قیس بھی دم بھر مزار میں
پیدا ہوئے ہیں لاکھ بگولے غبار میں
افسردگی عاشق بے کس کی حد نہیں
سینے میں دل ہے یا کوئی مردہ مزار میں

اس طویل غزل کے مقطع میں آزاد نے زیست کی حقیقت کو درشایا ہے۔ ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے اور ہمیں ایک روز یہاں اپنی ساری پونجی چھوڑ کر چلے جانا ہے لیکن پھر بھی ہم جوڑ توڑ سے باز نہیں آتے۔ اپنی آسائش کے لیے ہم کیا کچھ نہیں کرتے۔ انسان اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو زک پہنچانے سے بھی باز نہیں آتا۔ لیکن اس دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں، جو خود کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ اپنی ذات کا نقصان کر کے دوسروں کو فیض پہنچاتے ہیں۔ جن کے دل میں خدا بستا ہے، انھیں سود و زیاں اور اپنی پائمالی کی پروا نہیں ہوتی۔ مولانا کی شخصیت بھی ایسی ہی ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ہندوستانی تعلیمی ترقی اور ان کی خوشحالی کے لیے وقف کر دی۔ شعر حاضر ہے۔

آزاد کو ہو اپنی تباہی کا کیا ملال
کس کو قیام، ہستیِ ناپائیدار میں

آزاد کی دیگر غزلیں بھی خوب صورت ہیں۔ مولانا غزل کی قدیم روایتوں اور اشعار کی باریکیوں سے خوب واقف تھے۔ غزلوں کے اکثر اشعار میں رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا کی نثر ہو یا شاعری، اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال برملا ملتا ہے۔ اس کی وجہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن یہ بات نشانِ خاطر رہے کہ آزاد کے اشعار نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کے ذہن تک مفہوم کی رسائی بآسانی ہو جاتی ہے اور اُن کا کمال ہے۔ آزاد کے اشعار تغزل کے رنگ میں رنگے ہیں۔ اُن کی شاعری آہ اور واہ دونوں کی ترجمانی کرتی ہے۔ شعری نزاکتوں اور غزل کی دل نشینی کے راز سے آزاد آشنا تھے۔ اگر ان کی سیاسی اور صحافتی مصروفیات نہ ہوتیں تو یقیناً ان کا شعری سرمایہ بھی قابلِ لحاظ و قیع ہوتا لیکن پھر بھی انھوں نے جتنی توجہ اشعار کہنے پر صرف کی، اس سے اردو کی شعری روایت ہمیشہ شانہ کشی کرتی رہے گی۔

■

Dr. Tasleem Arif
Asst. Prof. & Coordinator, Dept. of Urdu
West Bengal State University, Berunanpukuria
Malikapur, Barasat, North 24 Parganas
Kolkata-700126 (West Bengal)
Mob.:7003350449/9339116285
e-mail : tasleemdtp@rerdiffmail.com

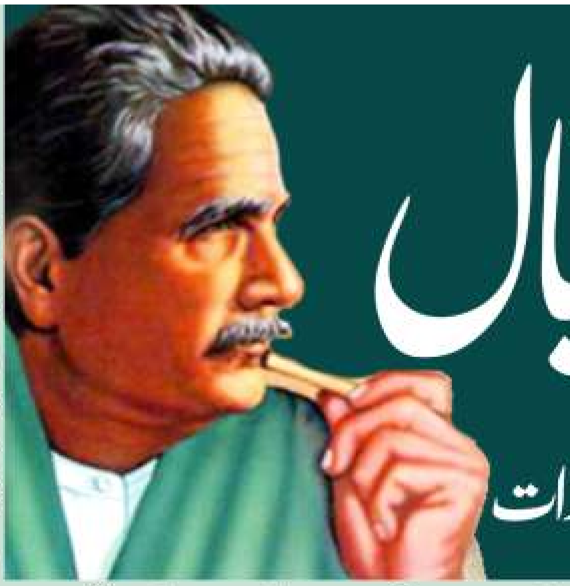

اقبال پر قصیدہ بردہ کے اثرات

سعود عالم

امام بوصیری ساتویں صدی ہجری کے ایک بڑے عالم اور شاعر گزرے ہیں۔ وہ مرض فالج میں مبتلا تھے۔ اسی دوران انھوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اللہ کے رسول کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر پیش کر رہے ہیں جس سے خوش ہو کر اللہ کے رسول نے انھیں خواب میں ایک چادر عنایت کی جس کے سبب ان پر سے فالج کا اثر زائل ہو گیا۔ اسی مناسبت سے اس قصیدے کا نام 'قصیدہ بردہ' پڑ گیا۔ بعض لوگ خواب کی مناسبت سے اُسے 'قصیدہ بردہ منامیہ' بھی کہتے ہیں۔ بہر حال اسی مناسبت وعقیدت کی بنا پر علامہ اقبال نے کئی جگہوں پر اپنے شعر و نثر (خطوط) میں امام بوصیری کے قصیدے کا ذکر کیا ہے۔

'اقبال نامہ' کے مرتب شیخ عطاء اللہ نے حصہ اول میں اقبال کے چند خطوط کا ذکر کیا ہے، ان کے ایک خط میں امام بوصیری کا ذکر بھی شامل ہے۔ وہ سید سلیمان ندوی کو 20 نومبر 1918 کو لکھتے ہیں:

''بوصیری کو چادر عطا ہونا کئی روایات میں آیا ہے۔ گذشتہ خط میں اس کا حوالہ لکھنا بھول گیا تھا۔ مولوی ذوالفقار علی دیوبندی نے شرح قصیدہ بردہ میں منجملہ روایات کے یہ روایت بھی لکھی ہے۔'' (ص:88)

وہیں ایک دوسرے خط میں ندوی صاحب سے مخاطب ہیں، اور لکھتے ہیں:

''بوصیری کے متعلق یہ واقعہ بھی مشہور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ حضورؐ نے بوصیری کو جو جذام میں مبتلا تھا اپنی چادر مطہر خواب میں عطا فرمائی تھی جس کے اثر سے جذام سے نجات پائی۔ بعض لوگوں میں قصیدہ بوصیری قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہے۔'' (84)

علامہ اقبال نے اپنے دوسرے خط میں گرچہ جذام کا تذکرہ کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ ایسا انھوں نے کتابوں میں بوصیری سے متعلق دونوں طرح کی روایات کے سبب لکھا ہوگا تاہم جو صحیح روایت ہے وہ خواب والی ہے نہ کہ جذام والی۔ اس واقعہ سے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔

ہوسکتا ہے علامہ اقبال تک جو روایت / کتاب پہنچی ہے وہ غیر مستند ہو۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے خط میں کیا جواب دیا تھا؟ غور طلب بات ہے کہ علامہ اقبال اپنے پہلے خط میں ذوالفقار علی دیوبندی کی کتاب کا حوالہ دے رہے ہیں۔ واضح رہے کہ دیوبندی صاحب نے اپنی کتاب میں فالج کا ذکر کیا ہے نہ کہ جذام کا۔

اس بات سے ہر کس وناکس واقف ہے کہ علامہ اقبال زیارت مدینہ سے محروم رہے۔ جیسا کہ ان کی مثنوی 'پس چہ باید کرد' کے آخری حصے سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں انھوں نے اپنی بیماری اور ناتوانی کا ذکر کیا ہے۔ اس نظم کے شان نزول سے متعلق علامہ اقبال کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ دوران قیام بھوپال اقبال نے ایک رات سر سید احمد خاں کی زیارت کی، جس کا ذکر وہ سر راس مسعود کے نام لکھے گئے خط میں کچھ اس انداز میں کرتے ہیں جس سے بوصیری کی نظم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اقبال نے نظم کے اخیر میں امام بوصیری کا نام لے کر ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے:

''3 اپریل کی شب کو جب میں بھوپال ہال میں تھا۔ میں نے تمہارے دادا رحمہ اللہ علیہ (سر سید احمد خاں) کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں کہ کب سے بیمار ہو۔ میں نے عرض کیا دو سال سے۔ مجھ سے فرمایا۔ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب کی خدمت میں عرض کرو۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا۔ اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے۔ ان شاء اللہ ایک مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہوگی۔'' (ص:414)

ذیل میں اسی نظم سے ماخوذ کچھ اشعار دیے جا رہے ہیں۔ اقبال نے ان اشعار میں اللہ کے رسولؐ کے احسانات کا ذکر اور قرآن کی عظمت کا اعتراف کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ اس سے 'قرآن کے لطف کی بقا انسان کے سوز جگر میں ہے' کے علم کا پتہ چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

در نفس سوز جگر باقی نماند   لطف قرآن سحر باقی نماند
کار ایں بیمار ناتواں بر د پیش   من چو طفلاں نالم از دوری خویش
تلخی او را فریبم از شکر   خندہ ہا در لب بدوز چارہ گر
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است   در خطا بخشی چو مہر مادر است
اے وجود تو جہاں را نو بہار   پرتو خود را دریغ از من مدار
چوں بوصیریؒ از تو می خواہم کشود   تا بمن باز آید آں روزی کہ بود

باوجود اس کے ان کے سینے میں دیار حرم کے لیے ایک چنگاری جل رہی تھی۔ ان کی ذاتی التجائیں تھیں کہ وہ حج کریں اور زیارت مدینہ سے سرفراز ہوں۔ وہ بیماری کے ایام میں اکثر شاکی رہتے کہ اس بیماری نے ان سے صبح کی تلاوت کلام پاک کی لذت چھین لی ہے۔ لہٰذا علامہ نے اپنی نظم 'ذوق وشوق' میں تشبیہات واستعارے کی مدد سے اس کی بھرپائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس سے جب لوٹنے لگے تو آپ نے چند روز قاہرہ اور بیت المقدس میں قیام کیا۔ اس کے بعد ان کے سینہ میں موجزن شعلہ نما چنگاری ذوق وشوق کی شکل میں بھڑک اٹھی، جس میں علامہ نے عرب شعرا کے تتبع میں ایسی خیالی مرقع کشی کی ہے جس کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اقبال نے اس نظم کا آغاز عربی قصیدے کے طرز پر کیا ہے۔

قلب ونظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
سرخ کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگ نخیل دھل گئے
ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

علامہ اقبال نے اس نظم میں علامہ بوصیری کے 'قصیدہ بردہ' سے استفادہ کیا ہے۔ بوصیریؒ ساتویں صدی ہجری کے ایک بلند پایہ عرب شاعر رہے ہیں۔ نعت نبوی ان کی شاعری کا اصل موضوع تھا 'قصیدہ بردہ' کے علاوہ بھی ان کی متعدد نعتیں ہیں۔ تقریباً تمام حروف تہجی میں ان کا کلام موجود ہے۔ سیکڑوں قصیدے اس زمین پر کہے جا چکے ہیں۔ پچاسوں تضمینیں اور مطر، مخمس، مسدس، مسبع اور معشر کہے گئے ہیں۔ بوصیری اپنے قصیدے کا آغاز ان اشعار سے کرتے ہیں۔

أَمِنْ تَذَكُّرِ جِيْرَانٍ بِذِي سَلَمِ
مَزَجْتَ دَمْعاً جَرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ
أَمْ هَبَّتِ الرِّيْحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ
وَ أَوْمَضَ البَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ إِضَمِ

ترجمہ: ''تیری آنکھوں سے یہ خون آلود آنسو کیوں رواں ہیں! کیا ذو سلم کے پڑوسی یاد آ رہے ہیں؟''

''یا کاظمہ کی جانب سے کوئی ہوا چلی ہے، یا تاریکی میں اضم کی پہاڑی سے کوئی بجلی چمکتی دیکھ لی ہے؟''

بوصیریؒ نے بذات خود اس قصیدے کی ابتدا قدیم عربی شاعری کے روایتی انداز سے کی ہے۔ شاعر نے نعت کے مضمون کی نزاکت اور مقام رسالت کے جمال وجلال کو مدنظر رکھتے ہوئے قصیدے کے مضمون کو طول نہ دے کر صرف انہیں دو مطلعے کے اشعار کے ذریعے عربی کے قدیم اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے قصیدے کا آغاز کیا۔ شاعر نے عرب کے جاہلی شعرا کی روایت شکنی کرتے ہوئے سرزمین حجاز کے سمت میں واقع چند مقامات کو یاد کیا ہے جہاں سے کسی زمانے میں حج وزیارت کے لیے جانے والے کارواں گزرا کرتے تھے۔ دونوں اشعار میں 'ذی سلم'، 'کاظمہ' اور 'اضم' جیسے الفاظ بطور تلمیح استعمال ہوئے ہیں۔

علامہ اقبال نے امام بوصیری کی زمین تو نہیں لیکن ان کے تخیل کو ضرور اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھوں نے اس نظم کے بیشتر اشعار فلسطین میں کہے تھے مگر وہ عالم خیال میں نواح مدینہ منورہ کی سیر وسیاحت کر رہے تھے۔ جیسا کہ ان کی نظم کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے الفاظ چھن کے ان کی روح میں سرایت کر گئے ہوں۔ قصیدے میں مذکور الفاظ 'دشت میں صبح کا سماں، اور چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں' کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کی منظر کشی میں نہ جانے کتنی بیاضیں صرف ہو جائیں گی۔ اقبال کے شارح یوسف سلیم چشتی ان الفاظ کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''اقبال کہتے ہیں کہ اس نظم کو پڑھتے وقت یہ تصور کرو کہ تم مدینۃ النبیؐ کے گرد ونواح میں ہو۔ شہر سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر کسی میدان میں کھڑے ہو۔ آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور اس سے نور کی ندیاں نکل کر مدینہ کی عمارتوں خصوصاً مسجد نبوی کے میناروں کو منور کر رہی ہیں۔''

(بال جبریل، مع شرح، مؤلفہ، (پروفیسر یوسف سلیم، ناشر، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، 1995ص:15-614)

اسی طرح سرخ کبود بدلیاں، سحاب شب، کوہ اضم، رنگ برنگ طیلسان، گرد سے پاک ہے ہوا، برگ نخیل دھل گئے، ریگ نواح کاظمہ، نرم ہے مثل پرنیاں، یہ ایسے الفاظ ہیں کہ پڑھنے کے بعد پوری اسلامی تاریخ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ علامہ اقبال نے ہو بہو بوصیری کے ہی الفاظ کو اپنی نظم میں جگہ دی ہے۔ اقبال چاہتے تو کوئی دوسرا سماں باندھ سکتے تھے یا کسی دوسرے استعارے کے ذریعے اپنی نظم کو بڑھا سکتے تھے، لیکن اقبال نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔ کیونکہ وہ بوصیری کی عظمت سے واقف تھے۔

نظم میں مستعمل الفاظ 'کوہ اضم' اور 'ریگِ نواح کاظمہ' تلمیح کے حامل ہیں، جس سے مدینے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس تاریخی شعر کا تو جواب ہی نہیں، جس میں ہزاروں سال قدیم تاریخ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جس کے الفاظ آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر...

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں اقبال کے ایسے اشعار ہیں جو شعرائے جاہلیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انھیں کے تتبع میں یہ اشعار قلمبند ہوئے ہیں۔ جاہلی شعرا کا دستور تھا کہ وہ اپنے قصیدے کا آغاز اپنی معشوقہ کی قیام گاہ کے تذکرہ سے کرتے، اس کے جانے کے بعد شاعر کو اس کی محبت دوبارہ اس مقام تک کھینچ لاتی تھی جہاں اس کی محبوبہ نے قیام کیا تھا۔ اس کی بہترین مثال سبعہ معلقہ کے شعرا ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں امرؤ القیس کے اشعار کو دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ حَبِيبٍ وَ مَنْزِلِ
بِسِقْطِ اللِّوَىٰ بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

ترجمہ: ''میرے دونوں ساتھیو، ٹھہر جاؤ، آؤ محبوبہ اور اس کی قیام گاہ کی یاد میں دو آنسو بہالیں۔ قیام گاہ جو دخول اور حومل کے درمیان ایک ریت کے تودے پر واقع تھی۔''

بال جبریل کے شارح یوسف سلیم چشتی اقبال کی اس نظم (ذوق وشوق) کے پہلے بند کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''چونکہ اقبال نے یہ نظم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھی ہے، اس لیے تمہید میں قصیدہ بردہ اور سبعہ معلقہ کا انداز بیان اختیار کیا ہے۔''

(بال جبریل، مع شرح، مؤلفہ، (پروفیسر یوسف سلیم، ناشر، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، 1995ص:618)

علامہ اقبال کے حالات زندگی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قصیدہ بردہ کا ورد ہمیشہ ان کے ذکر واذکار میں رہا کرتا تھا۔ جیسا کہ ان کی مثنوی 'رموز بے خودی' اور 'پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق' سے مترشح ہوتا ہے۔ 'رموز بے خودی' میں اقبال نے 'عرض حال مصنف بحضور رحمت للعالمینؐ' کے عنوان کے تحت جو اشعار لکھے ہیں ان کا فارسی زبان کے نعتیہ ادب میں اونچا مقام ہے۔ اقبال یہاں بھی قصیدہ بردہ کے ایک معنی خیز شعر کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے ترجمے اور تشریح سے مترشح ہوتا ہے۔

أَحَلَّ أُمَّتَهُ فِي حِرْزِ مِلَّتِهِ
كَاللَّيْثِ حَلَّ مَعَ الْأَشْبَالِ فِي أَجَمِ

ترجمہ: ''آپؐ نے اپنی قوم کو اپنے دین کے قلعے میں اس طرح محفوظ رکھا ہے جیسے شیر اپنے بچوں کے ساتھ کچھاروں (یا بھٹوں میں) رہتا ہے۔''

اقبال کہتے ہیں۔

امتش در حرز دیوار حرم   نعرہ زن مانند شیراں در اجم

ترجمہ: ''آپ نے اتارا اپنی قوم کو اپنے دین کے مضبوط قلعے میں، جیسے شیر اپنے بچوں کے ساتھ کچھار میں فروکش ہوتا ہے۔

اقبال نے مزید کئی جگہوں پر قصیدۂ بردہ اور سبعہ معلقہ سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں بوصیری کا ایک دوسرا شعر۔

لَمَّا دَعَا اللّٰهُ دَاعِيْنَا لِطَاعَتِهِ
بِأَكْرَمِ الرُّسُلِ كُنَّا أَكْرَمَ الْأُمَمِ

ترجمہ: ''جب اللہ تعالی نے ہمارے پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیا میں قابل عظمت نبی قرار دیا کہ وہ ہم سب کو اپنی اطاعت کی دعوت دیں تو ہم بھی تمام امتوں میں قابل عظمت قوم بن گئے۔''

مذکورہ شعر کا ترجمہ ومفہوم 'مسجد قرطبہ' کے چوتھے بند میں دیکھا جا سکتا ہے۔

تیرا جلال وجمال مرد خدا کی دلیل
تو بھی جلیل وجمیل وہ بھی جلیل وجمیل

فارسی ترجمے میں اس کی وضاحت مزید بہتر انداز میں نظر آ رہی ہے۔ جیسا کہ الفاظ اور جملوں کی بھرپور ترجمانی سے پتہ چل رہا ہے۔

پس خدا برما شریعت ختم کرد   بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را   او رسل را ختم وما اقوام را

ترجمہ: ''پس خدا نے ہم پر اپنی شریعت مکمل کر دی اور ہمارے رسول پر رسالت کی تکمیل کر دی۔ زمانے کی محفل میں ہم سے رونق ہے، آپؐ خاتم الرسل ہیں اور ہم خاتم الاقوام ہیں۔''

اس کے علاوہ بھی بہت سارے ایسے مقامات ہیں جہاں اقبال قصیدہ بردہ کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کے پیچھے صرف اور صرف اقبال کا اللہ کے رسول سے عشق اور ان سے والہانہ عقیدت کارفرما تھی۔ اقبال کی خواہش تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کا مرقد دیوار نبوی کے سایے میں ہو۔ اس سے متعلق بھی اقبال کی نظم موجود ہے۔ اس نظم میں بھی اقبال امام بوصیری کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

تا مرا افتاد بر رویت نظر   از اب وام گشتہ ئی محبوب تر
عشق در من آتشی افروخت است   فرصتش بادا کہ جانم سوخت است
نالۂ مانند نے سامان من   آن چراغ خانۂ ویران من
اے بصیری را ردا بخشندۂ   بربط سلمی مرا بخشندہ ئی
ذوق حق دہ این خطا اندیش را   اینکہ نشناسد متاع خویش را
در عمل پندہ تر گرداں مرا   آب نیسانم گہر گرداں مرا
از درت خیزد اگر اجزای من   وای امروزم خوشا فردای من
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش   مرقدی در سایۂ دیوار بخش

■

Dr. Saud Alam
B-114, Okhla Main Market
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025
Mob.:8076495936

اکبر اور کمالِ اکبر

محمد فیصل خان

اکبرالہ آبادی (16 نومبر 1846 - 15 فروری 1921) کی شاعری ان کے عہد و ماحول کی آئینہ دار ہے، اکبر نے اس عہد میں آنکھ کھولی جو زمانہ سیاسی سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے بڑے انتشار کا تھا۔ یہ وہی دور ہے جب انگریزوں نے ہندوستان پر پوری طرح قبضہ جما لیا تھا اور آہستہ آہستہ اپنے اقتدار کو مزید مضبوط بنانے کے لیے کوشاں تھے، ایسی کرب ناک صورتِ حال میں ہندوستانی عوام خود کو بے کس اور لاچار محسوس کر رہے تھے، جس کی وجہ سے انھیں مختلف قسم سے تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب ہندوستانیوں کے اوپر تھوپی جانے لگی اور مشرقی تہذیب سے لوگوں کو بیزار کیا جانے لگا، اس سے ہندوستانیوں کے عادات و اطوار میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ گویا یہ نئی اور پرانی دونوں تہذیبوں کے آپس میں ٹکرا جانے کا دور تھا، لوگ تیزی کے ساتھ مغربیت کو اپنا رہے تھے اور مشرقیت سے ان کی بے اعتنائی بڑھتی جا رہی تھی۔

بقول کلیم الدین احمد:

''یہ وہ زمانہ تھا جب دو مختلف تمدنوں میں زبردست تصادم ہوا تھا اور اس تصادم کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی تمدن کے شیرازے بکھرنے لگے تھے اور انگریزی تمدن اپنی دل فریبی کا سکّہ لوگوں پر جما رہا تھا۔ اپنے محاسن فراموش ہو چلے تھے اور حسنِ غیر ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔''

(اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم ص 75)

ایسے نازک اور پرخطر دور میں سر سید احمد خاں اور راجا رام موہن رائے نے عوام کی اصلاح کے لیے جو کوششیں کیں انھیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی زمانے میں ہمارے شاعروں نے بھی مختلف انداز کو اپناتے ہوئے قوم کی اصلاح کا ذمہ اٹھایا۔ ان میں خصوصی طور پر الطاف حسین حالی، علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی قابل ذکر ہیں جنھوں نے معاشرتی اور سماجی خامیوں کی نہ صرف نشان دہی کی بلکہ ان کی اصلاح کی بھرپور کوششیں بھی کیں۔ مذکورہ تینوں شاعروں کا مقصد تو ایک ہی تھا لیکن طریقۂ کار ایک دوسرے سے جداگانہ اور مختلف تھا، حالی نے اپنی نظموں کے ذریعے پند و نصائح کے انبار لگائے اور واعظانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے قوم کی اصلاح کرنی چاہی، اس سے ہٹ کر اقبال نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے خودی کا درس دیتے ہوئے زمانے کی آنکھ سے آنکھ ملانے کی ہمت، طاقت اور قوت لوگوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی، ان دونوں شاعروں کے برعکس اکبرالہ آبادی نے قوم کی درستگی کے لیے بالکل نئی راہ چن لی، اور طنز و مزاح کا لحاف اپنی شاعری پر ڈالتے ہوئے، معاشرے کی برائیوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی، اور مغرب کی اندھی تقلید کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا اور نئی تہذیب کے بجائے پرانی تہذیب کے پارکھ بنے۔

مسلمانو بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے ان پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تعلی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے
تمھیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر

اکبرالہ آبادی کے ذہن و دل میں یہ چیز پیوست ہو چکی تھی کہ ہم اپنی روایتی چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہیں، اور اس کے برخلاف ہر چیز کو جو انھیں نئی فکر اور نئی قدروں کی طرف ابھارے اسے قبول نہ کریں۔ وہ بھی شبلی کی طرح اپنی روایتی چیزوں کے قائل ہیں اور کسی بھی جدید چیزوں کو اپنانے کے لیے تیار نہیں، اکبر چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی باتوں کو نظر انداز نہیں کرتے اسی لیے ان کی شاعری اپنے زمانے کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اور اپنے عہد کی کش مکش کو پوری طرح اجاگر کرتی ہے۔

اکبرالہ آبادی کی پیدائش 16 نومبر 1846 کو الہ آباد کی تحصیل بارہ میں ہوئی۔ اکبر کے والد کا نام 'تفضل حسین' تھا۔ اکبر کی پیدائش کے بعد ان کا خاندان بہار چلا گیا اور

یہیں سے اکبر کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ دینی تعلیم کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو زبان بہت جلد سیکھ لی، ریاضی اپنے والد سے پڑھی گویا ریاضی کی مہارت وراثت میں ملی۔

اکبر کے دادا 'سید فضل الدین' 1855 میں بہار سے واپس الہ آباد آئے تو ان کے ساتھ خاندان کے باقی افراد بھی آگئے اور یہیں ان کا مستقل قیام رہا۔ اکبر دس سال کے تھے کہ ان کا داخلہ جمنا مشن اسکول میں کرادیا گیا جہاں انھوں نے دلچسپی سے پڑھائی شروع ہی کی تھی کہ غدر کے المناک سانحے نے قدغن لگادیا، اس کے بعد اکبر کے والد نے ان کو اپنے ایک دوست کے ذریعے سے عدالتی اور قانونی تعلیم دلائی۔ اکبر کی پہلی شادی سترہ سال کی عمر میں ہوئی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر 1876 میں دوسری شادی 'فاطمہ صغریٰ' سے کرلی جو ان کی زندگی میں نمایاں تبدیلی کا باعث بنی۔

اکبر نے 1866 میں وکالت کا امتحان پاس کر کے باقاعدہ وکالت شروع کی، اس کے بعد دن رات محنت کر کے اکبر نے اپنی انگریزی لیاقت میں اضافہ کیا اور قانونی نقطوں کو سمجھنے اور بیان کرنے کے قابل ہوگئے۔ 1873 میں ہائی کورٹ میں ملازمت شروع کردی اب ان کی شہرت دور دراز علاقوں تک پھیل گئی۔ 1880 میں منصف کی حیثیت سے مرزا پور رہے پھر سرسید کے توسط سے ان کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا۔ 1892 میں ترقی کر کے سیشن جج ہوگئے یہ پہلے ہندوستانی تھے جو اس عہدے پر پہنچے جس کی بنا پر اسی سال انھیں 'خان بہادر' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ اکبر کو ہائی کورٹ کا جج بنانے کی بھی بات کی گئی تھی مگر صحت کی خرابی اور کمزور بینائی کے سبب انھوں نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا اور 1903 میں ہی قبل از وقت پنشن لے کر ملازمت ترک کردی اور 9 ستمبر 1921 کو بروز جمعہ چند روز علالت کے بعد اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

اکبر الہ آبادی کو بچپن سے ہی شاعری کا شوق تھا، گیارہ برس کی عمر میں واقعۂ غدر سے اپنی شاعری کی شروعات کی اور کلام پر اصلاح استاد 'غلام حسین وحید' سے لی جو 'آتش' کے شاگرد تھے۔ اکبر نے اپنی 76 سالہ زندگی میں مختلف نشیب و فراز کا سامنا کرتے ہوئے طنز و مزاح کے ذریعے قوم کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کی اور عمر کے آخری لمحے تک یہی جذبہ باقی رہا۔ جس کی نظیر چار جلدوں میں موجود اکبر کے کلیات میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کلیات میں موجود کلام نے آج ایک صدی گزر جانے کے باوجود اکبر کو اسی آب و تاب کے ساتھ ہمارے درمیان زندہ رکھا ہے اور آگے بھی اسی آن بان و شان کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے وہ بیان کرنے کی کوشش کی جو ان کے دل پر گزری، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی ہے۔

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دل پہ گزری نہ ہو جو ایسی کوئی بات نہیں

اکبر نے شاعری شروع کرتے ہی اپنی آنکھوں سے ہندوستان کی شکست و ریخت دیکھی تھی، یہی سبب ہے کہ انگریزوں اور ان کی تہذیب دونوں کے تئیں ان کی شاعری میں نفرت دیکھنے کو ملتی ہے لیکن اس نفرت کو انھوں نے طنز و مزاح کے پیرائے میں اشاروں اور کنایوں میں بیان کیا۔

اکبر کی شاعری میں اپنی قوم سے، اپنی تہذیب سے، اپنے وطن سے، محبت کا اثر پوری طرح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی جذبہ اکبر کو قوم پرست بھی بناتا ہے، آج سے ایک صدی قبل ہی اکبر نے اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ اگر مغربی تہذیب اور کلچر کو اپنایا گیا تو ہمیں بہت سی نئی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ جیسے آج نئی نئی بیماریوں کا چلن اور کثرت اموات وغیرہ، جس کی سب سے بڑی وجہ ہوٹلوں کا کھانا ہے۔ آج ہم نے اپنے کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے یعنی اپنی تہذیب اور ثقافت میں جو تبدیلیاں پیدا کرلی ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے، اس کی مثال اکبر کے اس شعر سے بخوبی سمجھی جاسکتی ہے۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

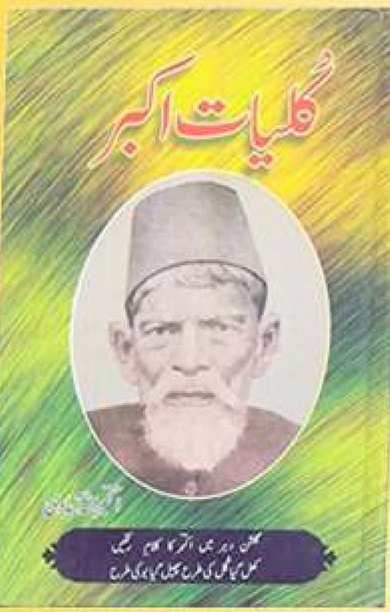

طنز و مزاح میں ایک احتجاجی عنصر ہوتا ہے، اس میں اشاروں اور کنایوں میں گہری مار ہوتی ہے، جسے کاری ضرب کہتے ہیں، اکبر کی شاعری میں جو طنز و مزاح کے پہلو ہیں ان سے صرف لطف اندوزی یا پھر حظ حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعے انھوں نے قوم و ملت کی اصلاح کی ہے۔ اور انگریزی تہذیب، نئی تعلیم کے ذریعے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور فرنگیوں کے ذریعے کیے جانے والے ظلم و ستم و بربریت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ نئی نسل کی ترقی اور آزادی کا جب چرچا شروع ہوا تو انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانی عورتوں نے بھی بے پردگی اختیار کرنی شروع کی اور یہ بات اکبر کو بہت ناگوار گزری اور انھوں نے طنز و ظرافت کا سہارا لیتے ہوئے لطیف پیرائے میں قوم کی عورتوں کو سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی، اس لیے کہ اکبر کو اپنے اخلاق و تمدن سے گہری دلچسپی تھی، ایسا بالکل بھی نہیں کہ وہ سنجیدہ نہیں تھے پھر بھی وہ طنز و مزاح کا لحاف ڈالے ہنستے ہیں تاکہ رونہ پڑیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر تعلیم نسواں کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ مغربی تہذیب اور اس کی عریانیت کے مخالف تھے۔ اکبر عورتوں کی تعلیم اور آزادی دونوں کے قائل تھے مگر وہ اپنی تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہو، اکبر کا ماننا ہے کہ اگر مکمل آزادی مل جائے گی تو اس کے ساتھ مختلف قسم کی برائیاں بھی جنم لیں گی۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اکبر نئی نسل کی اپنی تہذیب سے بے راہ روی، نوجوانوں کی بے پرواہی اور عدالتوں کی بے جا آزادی کو بالخصوص اپنے طنز کا نشانہ بناتے رہے، یہی اصول اکبر نے اپنے گھر والوں کے لیے بھی روا رکھا۔ مغربی تہذیب سے اس قدر بے اعتنائی کے باوجود اکبر نے جب اپنے بیٹے 'عشرت حسین' کو تعلیم کے لیے یورپ بھیجا تو لوگوں نے اس کی مخالفت کی، اس لیے لوگوں کا ماننا تھا کہ اکبر کے اصول صرف قوم کے لیے ہیں اپنے گھر والوں کے لیے نہیں۔ مگر ایسا بالکل نہیں تھا بلکہ 'عشرت حسین' کو روانہ کرتے ہوئے اکبر نے ان سے بہت سے عہد و پیمان لیے کیونکہ اس وقت انگلستان جانے والے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی یوروپین لیڈی ضرور لاتا ہے۔ اکبر کو بھی اپنے بیٹے سے اس کے متعلق

کھٹکا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عشرت حسین کا خط آنے میں کچھ تاخیر ہوگئی تو اکبر نے یہ قطعہ لکھ کر کے بھیج دیا جس کے مصرعے پیش خدمت ہیں۔

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھاکے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پرواہ نہ رہی
کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
بھولے ماں باپ کو اغیار کے چرنوں میں وہاں
سایۂ کفر پڑا نورِ خدا بھول گئے

اکبر کی شاعرانہ صلاحیت کے تو سبھی قائل ہیں، ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ معمولی اور ہلکے پھلکے الفاظ کو بھی بڑے معنیٰ خیز انداز میں استعمال کرتے ہیں اور ایسے الفاظ کو جو اکبر سے پہلے شاعری میں استعمال نہیں ہوتے تھے، اکبر نے انھیں زندگی بخشی اور نئے نئے معنیٰ ومفاہیم کے لیے استعمال کیا۔ جیسے جمن، بکلو، بتو وغیرہ۔ اس کے علاوہ انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا اکبر کو بہت پسند تھا، انگریزی حکومت سے نفرت کے باوجود انھیں کی زبان استعمال کرتے اور طنز ومزاح میں اس سے سہارا لیتے اور عوام کے دلوں میں مغربیت سے نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ اکبر کا کہنا تھا کہ ہمارے سماج میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی اصل جڑ مغربی تہذیب ہے جس کی چمک نے ہماری تہذیب کی روشنی کو ماند کر دیا ہے۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

اکبر نے اپنی پوری زندگی سرسید کے کاموں کی مخالفت کی، اور اپنی شاعری کے ذریعے طنز کے تیر چلاتے رہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید مسلمانوں کی ترقی کو مغربی تہذیب اور کلچر میں دیکھتے تھے جبکہ اکبر کا خیال تھا کہ اس نئی ثقافت نے ہمارے اندر برائیاں پیدا کی ہیں۔ لیکن سرسید کے انتقال پر اکبر نے ان کے تخلیقی اور تعمیری دونوں طرح کے کاموں کو سراہا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ جو اختلافات سرسید کے ساتھ تھے وہ بس نظریاتی تھے۔ دل سے وہ ان کا بہت احترام کرتے تھے اس کا بیّن ثبوت اکبر کی وہ شاعری ہے جو انھوں نے سرسید کی رحلت فرمانے کے بعد خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہی ہے۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہا جو چاہے کوئی میں تو کہتا ہوں کہ اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ایک دوسری جگہ اکبر کہتے ہیں۔

بعد سید کے میں کالج کا کروں کیا درشن
اب محبت نہ رہی اس بتِ بے پیر کے ساتھ

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں آزادی کا جذبہ بھی ہے اور وہ تحریک آزادی میں بھی حصہ لینے کے خواہاں تھے لیکن ضعیفی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا، پھر بھی گاندھی جی کے آتے ہی آزادی کی تحریک میں جو ولولہ پیدا ہوا تھا اس کا احساس اکبر کو ہو گیا تھا اور وہ ان سے بہت متاثر بھی تھے، گاندھی جی سے متعلق وہ انقلاب زمانہ کی بات کرتے ہیں۔ اس بنا پر ہم اکبر کو مجاہدِ آزادی کے طور پر بھی دیکھ سکتے ہیں انہوں نے گاندھی جی کے مشن کو آگے بڑھایا اور گاندھی جی سے متعلق ایک معرکۃ الآرا نظم 'گاندھی نامہ' لکھی جو قابل ذکر ہے۔

بقول صغریٰ مہدی:

''گاندھی جی نے عدم تعاون اور سودیشی کی تحریکیں چلائیں۔ یہ زمانہ اکبر کی زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ وہ بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ اکثر بیمار بھی رہتے تھے، مگر انگریزوں کے خلاف ہندوستانی اب اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس بات سے اکبر بہت خوش تھے۔ انھوں نے اس زمانے کی سیاست کے بارے میں، گاندھی جی کے بارے میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔'' (حوالہ اکبرالہ آبادی، ص 49)

اکبر کی شاعری میں ہمیں ان چیزوں پر طنز ملتا ہے جو آج ہماری زندگی کے لیے بے حد ضروری اور انتہائی کار آمد ثابت ہو رہی ہیں، اس بات کے سبب بعض نقادوں اور ادیبوں کا ماننا ہے کہ اکبر کی اہمیت اب وہ نہیں رہی جو پہلے تھی، جس طرح وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں فضول اور بے معنیٰ ہو جاتی ہیں اسی طرح آج اکبر کا طنز بھی اپنی جاذبیت کھو چکا ہے کیونکہ اب وقت کا تقاضا وہ نہیں رہا، ان کی شاعری محض لطف اندوزی کے سوا اور کچھ نہیں، کیونکہ انھوں نے ترقی یافتہ چیزوں پر نکتہ چینی کی ہے اور ان کو ہماری تہذیب، تمدن اور ثقافت کے لیے مضر بتایا ہے، لیکن میرا ماننا ایسا بالکل بھی نہیں ہے بلکہ اکبر نے مغربیت کی مخالفت کے باوجود ہنستے ہنساتے بہت سی ایسی باریک باتوں کی طرف اشارے کر دیے ہیں جس کی طرف ہماری نگاہیں بڑی مشکل سے پہنچتی ہیں۔ مثال کے طور پر آج ہم سب اپنی قوم کی تعلیم کے مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لے رہے ہیں۔ ہم سبھی کی یہ کوشش ہے کہ ہر بچہ اور قوم کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو اور ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھے۔ اس بات کی طرف اکبر نے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ہی ایک لطیفے کے ذریعے ہماری توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی اور 'فرضی لطیفہ' کے نام سے ایک شاہ کار نظم تخلیق کی جس کے چند مصرعے پیش خدمت ہیں۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عشق شاہد مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

اس نظم کے ذریعے سے اکبر نے ہمیں تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ہم ان کی وسعتِ نظری کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں پھر بھی یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکبر مغرب کے مخالف ہونے کے باوجود ان کی ملازمت کرتے رہے جو ایک تضاد کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ پہلو قابل ذکر بھی ہے، اور قابل غور بھی، مگر ان سب باتوں کے باوجود اکبر ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ہمارے درمیان ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اکبر کی شاعری ایک مختصر سی بات نہیں بلکہ یہ ایک تنگ رستہ ہے جس سے گزر کر ہم وسیع میدانوں میں پہنچ جاتے ہیں اور یہی ان کی انفرادیت کا سبب بھی ہے۔

کتابیات

1. آل احمد سرور: تنقید کیا ہے، مکتبہ جامعہ نئی دہلی لمیٹڈ، 2011
2. اسیم کاویانی: اکبرالہ آبادی اپنی شکست کی آواز، دار چلی کیشنز 2021
3. ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا: اکبرالہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور 2003
4. صغریٰ مہدی: اکبرالہ آبادی ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1983
5. صغریٰ مہدی: اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1981
6. عشرت حسین سید: حیات اکبرالہ آبادی، کلیم پریس کراچی 1951
7. کلیم الدین احمد: اردو شاعری پر ایک نظر (دو جلدیں)، دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ، 1966 (تیسرا ایڈیشن)

■

Mo Faisal Khan
Flat No. 404 Fourth Floor
Ho. No. 448/237, Nagariya Radha Gram
Scheme Mallahi Tola Thakurganj
Lucknow - 226003 (U.P.)
Mobile No: 9918998144
Email: fk.nadwa123@gmail.com

خدا بخش خان بہادر اور ان کی لائبریری

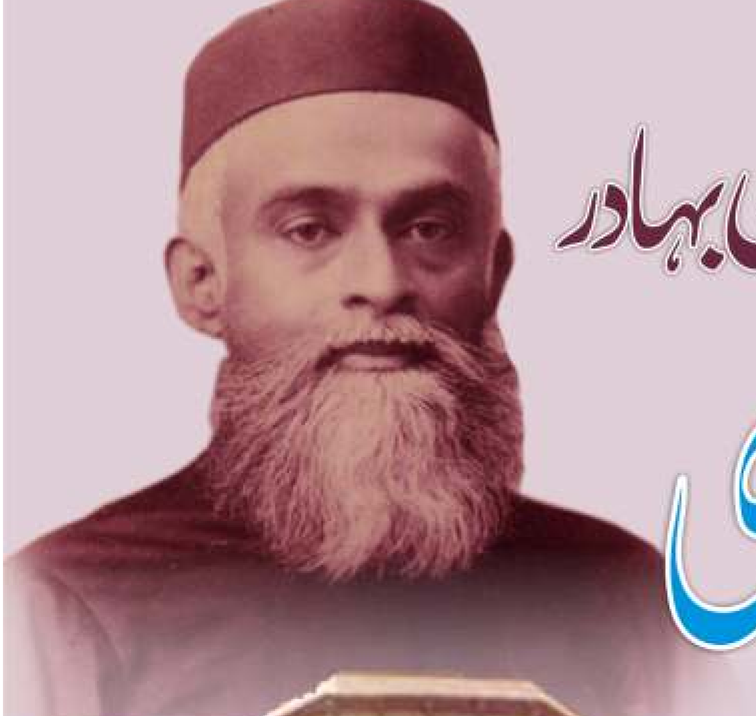

مہتاب جہاں

بہار کی راجدھانی پٹنہ کئی وجوہات اور جگہوں کی بنا پر مقبول ہے وہاں گنگا گھاٹ ہے، گول گھر ہے، گاندھی میدان ہے، گاندھی میوزیم ہے۔ پٹنہ زو ہے۔ کئی معروف ادارے قائم ہیں۔ اردو اکادمی پٹنہ ہے، پٹنہ کالج ہے، سنہا لائبریری ہے، درگاہ شاہ ارزانی ہے، قاضی عبدالودود صاحب کا گھر ہے۔ ڈاکٹر اعجاز احمد صاحب کا ادارہ تحقیقات ادبیات عربی و فارسی انسٹی ٹیوٹ بھی ہے۔ ان سب میں ایک بہت اہم مقام ہے جس سے صرف اسی علاقے کے لوگ ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک کے اہل علم حضرات بخوبی واقف ہیں اور وہ ہے خدا بخش لائبریری۔ سبزی باغ ایک مردم خیز علاقہ ہے جہاں یہ لائبریری اپنی پوری آب وتاب اور بڑی تمکنت سے ایستادہ ہے۔ نہ بہت چھوٹی ہے نہ بہت بڑی۔ مگر شہرت ملکوں ملکوں تک ہے۔ یہ صرف ایک لائبریری ہی نہیں بلکہ ایک ادبی مرکز ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ یہاں صرف کتابوں کی ورق گردانی نہیں ہوتی۔ یہاں جلسے منعقد کیے جاتے ہیں مذاکرے اور لیکچرز ہوتے ہیں۔ سیمناروں کا انعقاد ہوتا ہے۔ مختلف فیلوشپ دی جاتی ہیں۔ سالانہ خدا بخش ایوارڈز بھی دیے جاتے ہیں، کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے۔ مجلے اور جرنل طبع کیے جاتے ہیں۔ مخطوطات کی حفاظت وتحفظ کے تمام انتظامات کیے جاتے ہیں۔ کرزن ریڈنگ روم موجود ہیں۔ قلمی نسخے مطلوبہ اور خواہش مندوں کو مہیا کرائے جاتے ہیں جدید ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کیا جارہا ہے۔ نادر مخطوطات کا منبع ہے یہ لائبریری۔ قلمی نسخوں کے علاوہ مختلف زبانوں کی کتابیں نیز رسالے لاتعداد اس عظیم کتب خانے کی قدر ومنزلت میں اضافے کا باعث ہیں۔ یہ لائبریری ایشیا کی بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔

اس کتب خانے کے بانی کے بارے میں اگر بات نہ کی جائے تو بے محل ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اس کتب خانے کے سب سے پہلے بانی کا اگر ذکر کیا جائے تو وہ تھے محمد بخش جنھوں نے اس کی ابتدا چودہ سو مخطوطات کے ساتھ کی تھی یہ ان کا ذاتی مشغلہ تھا جو انھوں نے محمد یہ کتب خانے کے نام سے شروع کیا۔ 1876 میں اپنی وفات سے قبل اپنے بڑے بیٹے خدا بخش کو یہ تمام ذخیرہ سونپ دیا۔ اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کے اس ذخیرے کو مزید بڑھانے کی سعی کریں۔ اس کو ایک عوامی کتب خانے میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں اور ان کے فرزند بھی ان کی اس آخری خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں جٹ گئے اور پوری محنت ولگن سے قلمی نسخوں کی تعداد بڑھا کر تقریباً چار ہزار تک کردی۔ آج خدا بخش لائبریری اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ایک بیٹے نے باپ کی خواہش کو پورا کر دکھایا۔ نہ صرف عوامی کتب خانے میں تبدیل کیا بلکہ ایک انفرادی حیثیت سے ساری دنیا میں روشناس بھی کرایا۔

خدا بخش کی جائے ولادت کے بارے میں اگر بات کریں تو وہ شمالی بہار میں چھپرہ کے نزدیک ایک اوکھی نامی گاؤں ضلع سارن میں پیدا ہوئے۔ 2 اگست 1842

اس وقت محمد بخش ایک عام حیثیت کے زمیندار تھے۔اور کتابوں کے قدرداں۔ خدابخش کی زندگی کا اوائلی حصہ ایک بحرانی دور تھا۔ جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو 1857 کا انقلاب واقع ہوا جس کی وجہ سے ان کی ابتدائی تعلیم بھی متاثر ہوئی مگر خدابخش نے تعلیمی میدان میں اپنی جنگ جاری رکھی اور میٹرک پٹنہ سے انٹر کلکتہ سے کیا (مگر کلکتہ جانے کی ایک دوسری وجہ تھی والد کی بیماری کی وجہ سے وہ پٹنہ سے انٹر نہیں کر پائے اور پھر بعد میں انھوں نے کلکتہ سے کیا، ایک وجہ مالی تنگی بھی بتائی جاتی ہے) اس کے بعد خدابخش پہلے ضلع جج کے پیش کار اس کے بعد سب انسپکٹر آف اسکولز رہے۔ پھر وکالت کا امتحان دیا اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور ایک بہترین وکیل بنے اس کے بعد حکومتی وکیل کا عہدہ سنبھالا اور یہ سلسلہ حیدرآباد تک پہنچا۔ وہاں اسٹیٹ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور اعزازات میں لگاتار اضافہ ہوتا ہی رہا۔ دہلی دربار میں اعزازی سرٹیفکیٹ حاصل ہوا۔ پھر پٹنہ میونسپلٹی اور پٹنہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے سب سے پہلے وائس چیرمین کے طور پر انتخاب ہوا اور کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے 1898 میں عہدہ جلیلہ سے سبکدوش ہوئے اور حیدرآباد سے پھر واپس پٹنہ آگئے اور دوبارہ وکالت کا آغاز کیا اور معاشی حالات اچھے نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی کمائی کا بیشتر حصہ کتابوں کی خریداری کے لیے وقف کردیا اور آخرکار 3 اگست 1908 کو اس کتابوں کے دلدادہ کی آخری گھڑی آہی گئی۔ فالج کے حملے نے اپنا اثر دکھایا اور ان کو آخری منزل پر گامزن کیا۔ خدابخش خان بہادر کی مرنے کے بعد بھی اپنی لائبریری سے وابستگی برقرار رہی کیونکہ وہ اس کے احاطے میں ہی مدفون ہوئے۔ یہ تو تھا خدابخش کے بارے میں ایک مختصر تعارف۔ اب مزید خدا بخش خان بہادر کو بہتر طریقے سے سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس مقالے کو چند عنوانات کے تحت منقسم کیا جارہا ہے۔

خدابخش کا کتابوں سے عشق

جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ یہ والہانہ عشق ان کو اپنے والد محترم سے ورثے میں ملا۔ خدابخش جہاں گئے وہاں سے اپنی لائبریری کے لیے کتابیں خریدتے گئے۔ جمع کرتے گئے کئی واقعات ان کی اس دلبستگی اور محبت سے وابستہ ہیں۔ 1857 کے بعد مخطوطے بازاروں میں کوڑیوں کے دام بکے، اور گراں قیمتوں پر بھی۔ بڑے بڑے اہل علم اور ان مخطوطوں اور کتابوں کے خواہاں حضرات میں خدابخش بھی شامل تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے اس وقت وسائل دیگر افراد کی طرح لامحدود نہیں تھے مگر پھر بھی خدابخش نے اپنے انہی محدود وسائل کے ساتھ اپنے جذبے اور شوق کو زندہ رکھا۔ ان کے اس شوق نے ان کو بے حد مشہور کردیا۔ کتاب فروش ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹتے تھے۔ محمد مکی نام کا ایک عرب کتب شناس شخص 18 برس تک 50 روپے ماہوار پر نادر مخطوطات کی خریداری کے لیے مقرر رہا۔ اس شخص نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر، شام، ایران اور عرب کے شہروں سے خدابخش کے لیے مخطوطات حاصل کیے۔ جو آج بھی خدابخش لائبریری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ چند نسخے ایسے بھی ہیں جو منحصر بہ فرد ہیں کئی نسخے مصور ہیں اور کئی ہزار قلمی تصویریں اس لائبریری میں موجود و محفوظ ہیں۔ جو مغلیہ، ایرانی، راجپوت اور وسط ایشیائی مصوری کے اسکولوں کی نادر تصاویر ہیں۔ خدابخش لائبریری اپنے ان کمیاب اور نادر مخطوطات کے باعث ہی تمام برصغیر اور دوسری دیگر لائبریریوں کے مقابلے میں زیادہ مشہور و مقبول ہے۔

وکالت کا پیشہ

خدابخش جب وکالت کے پیشے میں آئے تو اس پیشے کو پوری ایمانداری سے اختیار کیا اور بڑے ذوق اور شوق اور تن دہی کے ساتھ اس پیشے کو وقت دیا۔ ہر مقدمے کے ہر لفظ کو غور سے پڑھتے اور بات میں بات پیدا کرتے کہ مقدمے کا رُخ ہی بدل جاتا۔ دو چار مقدموں کے بعد ہی ان کی قابلیت سب پر عیاں ہوگئی۔ اور ان کا شمار اس وقت کے مشہور وکلا میں ہونے لگا۔ معاشی حالت بھی سدھر گئی اور زندگی میں بھی خوشحالی آگئی۔ سرکاری حلقوں میں بھی احترام ہونے لگا۔ حکام کا یقین اور بھروسہ بھی میسر آیا اور خدابخش بھی پٹنہ کے دولت مندوں اور متمول لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ 1880 میں ان کو سرکاری وکیل مقرر کیا گیا۔ اور خان بہادر کا گراں قدر خطاب بھی عطا ہوا۔ یہ خطاب اس وقت ایک ہندوستانی کے لیے بہت فخر وعزت کی بات تھی۔ اس شہرت کے باعث ہی حیدرآباد کے نظام نے ان کو (1895-98) حیدرآباد بلایا اور چیف جسٹس کا عہدہ مرحمت فرمایا۔ مگر وہ تین سال ہی وہاں رہے۔ کیونکہ وہ اپنی لائبریری سے زیادہ دنوں تک جدا نہیں رہ سکتے تھے۔

اولادیں

اولادوں میں دو بیٹوں نے خوب شہرت حاصل کی۔ ایک صلاح الدین خدابخش کامیاب بیرسٹر تھے۔ قانون کے معلم اور علوم شرقیہ کے ماہر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ انھیں جرمن زبان میں کافی اور خاصی مہارت حاصل تھی۔ اسلامی تہذیب پر ان کی تحریریں جرمن اور مستشرقین کے لیے بہت اہم ہیں۔ اور قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ دوسرے بیٹے شہاب الدین خدابخش بنگال میں سپرینڈینٹ آف پولیس رہے اور اپنے والد کی وفات کے بعد لائبریری کے سکریٹری بھی رہے۔

اہلیہ

راضیہ خاتون جمیلہ، پیدائش کلکتہ (بنگال) 1868 وفات 1921 پٹنہ، جمیلہ خان بہادر شمس العلماء مولوی کبیر الدین احمد کی بیٹی تھیں۔ خداداد صلاحیت کی باکمال خاتون، پاکباز، دیندار اور وفاشعار۔ اپنے خاوند کا ہر حالت میں ساتھ نبھایا۔ ان کی علالت اور عسرت کے دنوں میں بھی خدابخش کی ہمدم و غمگسار رہیں۔ شاعری سے رغبت تھی۔ ابتدا میں جمیلہ خاتون، اور راضیہ تخلص تھا۔ مگر اپنے پیرومرشد حضرت شاہ مرشد علی جمال کی اجازت کے بعد جمیلہ تخلص اختیار کیا۔ پورا نام راضیہ خاتون جمیلہ تھا۔ ان کو اپنے مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ان کی شاعری پر پیرومرشد کا صاف اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

چشمۂ فیض جمالی وہ سمجھ لے اس کو
اس گنہگار جمیلہ کا جو دیوان پائے

جمیلہ صوم وصلوۃ کی پابند تھیں۔ تصوف وطریقت سے متاثر تھیں۔ اور ایک قادرالکلام شاعرہ بھی۔ ان کے کلام میں حمد، نعت ومنقبت، قصیدے رباعیات اور مثنوی کا قیمتی سرمایہ موجود ہے ان کی باقیات شاعری میں آٹھ دیوان اور دو مثنویاں شامل ہیں۔

جمیلہ خدابخش، خدابخش خان بہادر کی تیسری بیوی تھیں آخری نہیں، کیونکہ ان کی زندگی میں خدابخش نے ایک اور شادی کی تھی، جمیلہ کے بطن سے ان کے ایک بیٹے بھی تھے۔ ان کا نام ولی الدین خدابخش تھا۔ مگر ان کے بارے میں زیادہ معلومات تا بحال فراہم نہ ہوسکیں۔

جمیلہ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ غزل، مثنوی، رباعی وحمد ونعت وغیرہ شاد عظیم آبادی کی شاگردی کو خود جمیلہ نے قبول کیا ہے اور داغ کا نام بھی ان کے استادوں میں شمار ہوتا ہے۔ جمیلہ کی شاعری پر کلاسیکی شاعری کا اثر صاف نمایاں ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار

بے کلی بڑھ گئی ایسی کہ کل آئی نہ مجھے
یاد کل آئی جو اس بت کی کلائی مجھ کو
میں ہوں جاہل مگر فطرت نے یہ امداد کی میری
کہ ہے بزم سخن میں ان دنوں رونق میرے دم سے
یکتائی رب کی اور ظہور رسول پاک
نقشہ دکھا رہے ہیں الف لام میم

نام تمھارا غوث ہے جد میں تمھارے بذہین
رب کو کہیں کے نعبد تم کو کہیں گے نستعین
تو جو خاک کو دے جمال ہے یہ جمیلہ تیرا کمال ہے
نہ ہو کیوں بڑا تیرا مرتبہ، تیرا پیر صاحب حال ہے

لیڈی کرزن کے لیے جمیلہ نے ایک نظم تحریر کی تھی جس کا عنوان تھا 'لندن' چند شعر بطور نمونہ

یہ تمنا ہے کہ دنیا میں تو آباد رہے
گلِ شگفتہ سا خنداں رہے اور شاد رہے
ہووے تو سیج مبارک تجھے لیڈی کرزن
تیری حالت پہ سدا شاہ کا امداد رہے
لارڈ کرزن تیرے حق میں ہے یہ خاتون کی دعا
صد وسی سال تو قایم رہے اور شاد رہے

خدابخش کے آخری دن

خان بہادر خدا بخش یہ نام آج بھی جیسے زبان پر آتا ہے اس نام کا طمطراق و دبدبہ مبہوت کردیتا ہے۔ شہرت اپنی جگہ عزت اپنی جگہ، مگر جب براوقت آتا ہے تو وہ کہہ کر نہیں آتا یہی خدا بخش کے ساتھ بھی ہوا ان کی زندگی کے آخری ایام بڑی کسمپرسی میں گزرے۔ گھر میں دولت کی ریل پیل ان کی ایمانداری، ذہانت اور علم کی روشنی کی بدولت اور شخصیت کی پاکیزگی کی وجہ سے تھی۔ خدا بخش نے وہ وقت بھی دیکھا تھا جب خود دولت کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ مگر جب تنگدستی آئی تو اس نے بھی خدا بخش کے ساتھ خوب ساتھ نبھایا اور اپنی گرفت میں لے کر خوب تنگ کیا اور خدا بھی اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ خدا بخش کو بھی آزمایا، ان پر سب سے پہلے فالج کا حملہ ہوا مگر تب بھی انھوں نے علم اور اپنی کتابوں کے تئیں ان کی حصول یابی کے لیے کبھی کوتاہی نہ برتی علمی کام بدستور جاری رہے مگر بیماری کے باعث مقروض ہوتے چلے گئے۔ جو بعد میں حکومت وقت نے مدد کی اور دوستوں کی ہمدردی اور ساتھ نے خدا بخش کو اس مشکل گھڑی سے نکالا۔ اس کے علاوہ حکومت وقت نے ان کے لیے 200 روپے ماہانہ بھی مقرر کیے اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی سکریٹری شپ تفویض کی۔ جو انھوں نے مرتے دم تک خوش اسلوبی سے نبھائی۔ 1903 میں سی۔آئی۔اے کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ خدا بخش نے اپنا سارا وقت لائبریری کو دیا۔ چلنا پھرنا بند ہو چکا تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہی وہ اپنے دوستوں سے ملاقاتیں کرتے تھے۔ علمی بحث ومباحث ہوتے۔ مطالعہ کرتے تھے۔ مضامین لکھتے تھے۔ مفلوج حالت میں بھی وہ سارے کام کیے جو ایک عام صحت مند آدمی بھی نہیں کرسکتا۔

کتابوں کی حصول یابی کے لیے اس حالت میں بھی کوشاں رہے۔ اور آخرکار 3 اگست 1908 میں اس مردِ مجاہد نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت۔

خدابخش مصنف کی حیثیت سے

خدا بخش ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ زبان دانی کی اگر بات کی جائے تو ان کو اردو، عربی، فارسی، انگریزی پر پوری قدرت حاصل تھی۔ یہ تمام زبانیں وہ لکھ پڑھ سکتے تھے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔ خدا بخش کی تصانیف میں چند مضامین اور تین کتابوں کے بارے میں اطلاع دستیاب ہوتی ہے (1) تاریخ عظیم آباد (2) تفسیر سورہ فاتحہ وسورہ اخلاص (3) محبوب الالباب۔ خدا بخش کی

یہ کتاب بہت معروف ہے "محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب" یہ کتاب فارسی میں تحریر ہے اور ایک کیٹلاگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں 1389 قلمی نسخوں کا ذکر ہے یہ کتاب 1314ھ/ 1897 میں حیدرآباد میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نام حیدرآباد کے نواب فرمانروائے دکن نظام الملک میر محبوب علی خان کے نام پر رکھا اور ان کو معنون کیا۔ جب خدا بخش حیدرآباد میں وہاں کی عدالت عالیہ کے چیف جسٹس تھے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں 859 صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لائبریری میں موجود ذخیرہ شدہ نوادر کا سب کو علم ہوجائے اور علم کے خواہاں حضرات اس ذخیرے سے استفادہ کرسکیں۔ یہ کتاب ایسی مثال ونمونہ ہے جس کے ذریعے ہم خدا بخش کی متنوع صلاحیت و قابلیت کا بہتر طریقے سے اندازہ لگاسکتے ہیں۔ اس میں جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ 1389 قلمی نسخوں کا مفصلاً تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف فنون پر مبنی عربی اور فارسی کے علاوہ چند اردو اور ترکی کے قلمی نسخوں اور کچھ قدیم و نایاب مطبوعات بھی شامل ہیں فارسی زبان میں یہ کتاب خدا بخش خان کی عمدہ طرز نگارش کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ خدا بخش کو مختلف زبانوں سے واقفیت کے علاوہ مخطوطہ شناسی میں بھی پوری قدرت حاصل تھی اور اسی وجہ سے وہ اہم اور نادر و نایاب مخطوطات کی جمع آوری میں بے حد کامیاب ہوئے۔ مخطوطے کے حوالے سے مختلف جزئیات سے بھی وہ باخبر تھے۔ مثلاً مخطوطے کا کاغذ، روشنائی کی قسم، رسم خط اور طرز تحریر کی شناخت رسم الخط کے بدلتے دور کے ساتھ مختلف رجحانات کا علم انھیں بخوبی تھا اور یہ وہ تمام اہم باتیں ہیں جو ایک مخطوطے کی قدر ومنزلت اور اس کے جعلی ہونے کا تعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اور خدا بخش نے ان تمام تقاضوں کو بہت تحقیق وتفتیش وجستجو کے ساتھ بروئے کار لانے میں اعلیٰ معیار تک پہنچایا۔ یہ کتاب ایک زندہ مثال ہے یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جبکہ ان کی عملی زندگی کے تقاضے ان کے ذوق سے یکسر مختلف تھے۔ مؤرخین اور اہل قلم لکھتے ہیں کہ وہ عملی زندگی کی پُرخار وادی سے بھی دامن بچاتے ہوئے نہایت کامیابی کے ساتھ گزرے گویا حق ادا کردیا۔

'محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب' میں کتابوں کا اندراج حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے۔ کتابوں کے تعارف کے سلسلے میں عام طور سے کتاب کا نام لکھ کر خط، کاغذ کی قسم، کاتب اور سنہ کتابت کی وضاحت ہے۔ اس کے علاوہ کتاب کی مجموعی کیفیت وحالت درج ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے فن کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بعد کتاب سے متعلق مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پھر مصنف کے احوال درج ہوئے ہیں جو ایک جامع خاکہ ہے۔ کبھی صرف کتاب کا نام لکھ کر فوراً مصنف کے احوال قلمبند کرنے لگتے ہیں خدا بخش۔ اور حوالے کے طور پر مستند تراجم وتذکرے کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بعض حضرات اس کتاب کو ایک تذکرے کے طور پر بھی مانتے اور اہمیت دیتے ہیں۔

خدابخش مفسر کی حیثیت سے

خدا بخش جمیع الصفات کے مالک تھے۔ وہ محقق تھے مصنف تھے، ادیب تھے، شاعر تھے کتاب شناس، مترجم، کیٹلاگر، تذکرہ نگار، مکتوب نگار، ناقد اور ایک مفسر بھی تھے اور اس زمرے میں ان کو اس لیے رکھا جارہا ہے

کیونکہ انھوں نے قرآن کی دو اہم سورتوں کی بہت جامع تفسیریں تحریر کی ہیں۔ سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص یہ دونوں تفسیریں لیکچرز کی شکل میں ہیں۔ اور دوران قیام حیدرآباد میں جب وہ چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے غالباً (1894-98) کے درمیانی سالوں میں یہ لیکچرز دیے اور حیدرآباد سے ہی یہ شائع بھی ہوئے مگر ان کی صحیح تاریخ دستیاب نہیں ہے۔ پہلا لیکچر انھوں نے شبلی نعمانی کی جگہ دیا۔ یعنی شبلی نعمانی کسی وجہ سے اس پروگرام میں نہ آسکے۔ تو اس وقت خدابخش خان ہی سب سے موزوں تھے ان کی جگہ۔ یہ دونوں لیکچرز زیادہ طویل نہیں ہیں صرف 31 صفحات پر مشتمل ہیں۔ مگر اپنے علمی مضامین، تفسیری نکات، حکمتیں اور تاریخی واقعات کے پیش نظر بہت قابل قدر ہیں اور خدابخش کی تبحر علمی اور دینی معلومات و بصارت کا بین ثبوت ہیں۔ پہلا لیکچر انھوں نے سورہ اخلاص کی تفسیر پر دیا تھا۔ اس کا آغاز انھوں نے حکیم سنائی کے شعر سے کیا تھا: شعر بطور نمونہ

عروس حضرت قرآن نقاب آنگہ براندازد
کہ دارالملک ایمان را مجرد بنی از غوغا

اور اس کے بعد معجزۂ قرآنی پر گفتگو کی اس میں انھوں نے معجزۂ قرآنی کو دو طریقوں پر ثابت ہوتا ہے، وضاحت کی۔ پہلا حسن عبارت اور دوسرا طریقۂ لطائف معنی۔ دوسرے لیکچر کا آغاز انھوں نے قرآن کی پہلی سورہ، سورہ فاتحہ کی تفسیر کے بیان میں کیا۔ اور اس سورہ کی تفسیر کے ضمن میں ایسے ایسے تفسیری نکات اور بڑے بڑے نامور عالموں کے حوالے سے اس سورہ کے ایک ایک لفظ کی تفسیر بیان کی ہے اس میں انھوں نے مزید بتایا کہ خدا نے اس سورہ میں اس نعمت کاملہ کا بیان کیا ہے جو اس سورہ کی سب سے بڑی خوبی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو پانچوں وقت کی نماز میں پڑھا جانا لازم قرار دیا ہے۔ تاکہ مومن ہر نماز میں نعمت کاملہ کا طلبگار ہو کر خدا کو راضی کر سکے۔ اور اپنی آخرت کو سنوار سکے اللہ تعالیٰ چونکہ پوری کائنات کا خالق، مالک اور قادر مطلق ہے، اس لیے مومن کی شان یہ ہے کہ وہ نعمت کاملہ کا طلب گار ہو۔ نعمت کامل یہ ہے کہ خدا مومن کو سیدھا، سچا اور صحیح راستہ دکھا دے۔ اپنی شناخت کرا دے۔ اس کی آخرت سنوار دے اور اپنے بندے سے راضی ہو جائے۔

خدابخش کے عادت و اطوار

خدابخش خان بہادر کا معمول تھا۔ شام کو گھر واپس آتے تو تھوڑی دیر آرام کرتے پھر اپنی وکالت کے کام میں مشغول ہو جاتے۔ اس سے فارغ ہوتے تو عربی، فارسی اور انگریزی کی کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو جاتے۔ جو گھنٹوں تک جاری رہتا اور یہ کبھی کبھار کا نہیں روزانہ کا معمول تھا۔ گھنٹوں عربی اور فارسی کے اشعار خوش الحانی سے پڑھتے۔ فارسی زبان ایسی شستہ اور صاف لکھتے جیسے کوئی اہل زبان ہو۔ حافظ اور رومی کے شیدائیوں میں سے تھے۔ ان دونوں شاعروں کا کلام روزانہ پابندی سے پڑھتے جیسے کوئی مذہبی کتاب ہو۔ جب کتب خانے جاتے تو کتب بینی میں مصروف ہو جاتے یا مختلف کتابوں پر نوٹس لکھتے۔ یا کسی اہل علم سے علمی و دینی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ انگریزی زبان و ادب اور شاعری سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ انگریزی شعرا میں Shelly, Byron Words Worth ان کے پسندیدہ شعرا تھے۔ جن کا کلام وہ اکثر پڑھتے تھے۔

خدابخش خان بڑے مذہبی اور سچے مسلمان تھے اور یہ ان تک ہی محدود نہ تھا۔ وہ اپنے بچوں میں بھی اس اثر کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ بقول صلاح الدین بخش (ان کے بڑے بیٹے) کہ جب وہ انگلینڈ سے چھٹیوں میں اپنے گھر آتے تو والد صاحب کے ساتھ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے۔ اور کہیں کہیں اکثر ان میں آزادیٔ فکر عیاں ہو جاتی تھی تو وہ ان سے ناراض نہیں ہوتے تھے، بلکہ اپنے بیٹے کی ذہنی اور فکری اصلاح کے لیے کئی معروف غیر مستشرقین کی کتابیں جو انھوں نے حضرت محمد کی زندگی پر تحریر کی تھیں پڑھنے کی صلاح دی اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ وہ احادیث کی کتابیں بھی پڑھتے رہیں تاکہ ان میں حضرت محمد کی سچی عقیدت و محبت پیدا ہو۔ مثلاً سر ولیم میور کی Life of Mohammad، Koelle کی Life of Mohammad، اور Dodd کی Budha,Christ and Mohammad اس کے علاوہ ابن ہشام کی سیرت ابن ہشام۔ قاضی عیاض کی الشفاء ابن قیم کی زادالمعاد، الموصلی کی الوسیلہ بھی پڑھنے کی ہدایت کی۔

خدابخش مشاہیر کی نظر میں

خدابخش کے بارے میں اور ان کی لائبریری کے بارے میں لوگ گن گاتے نہیں تھکتے۔ اور یہ بجا بھی ہے۔ یہاں چند مشہور و معروف ہستیوں کی آرا کو قلمبند کیا جا رہا ہے جو خدابخش اور ان کی لائبریری کے بارے میں مختلف موقعوں پر تحریر کی گئیں۔

1 علامہ شبلی نعمانی خدابخش کے بارے میں فرماتے ہیں:

''مولوی خدابخش نے جس اہتمام اور زر خطیر کے صرفہ سے کتابیں بہم پہنچائی ہیں اور اس کی نظیر سے تمام ہندوستان خالی ہے۔ کیا یہ کچھ کم تعجب کی بات ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا وکیل جس کے پاس کچھ جائداد نہیں اور جس کی آمدنی صرف ضلع کی وکالت پر محدود ہے ایک کتاب خانے کی تیاری میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کر دے۔ بے شبہ ایسا اولوالعزم شخص ان نامور مسلمانوں کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جن کی حوصلہ مندیوں کا ہم افسانہ سنایا کرتے ہیں۔'' 1891

2 مہاتما گاندھی:

''نو سال قبل میں نے اس حسین و جمیل لائبریری کے بارے میں سنا تھا۔ اور اب تک اس کو دیکھنے کی خواہش تھی۔ لائبریری کی زیارت سے مجھے کافی خوشی ہوئی۔ جس سے مجھے یہاں کی نادر کتابوں کے عظیم ذخیرے کو دیکھنے کا موقع ملا...... میں خدابخش خان بانی کتب خانہ کی ذہانت کا احترام کرتا ہوں۔ جنھوں نے حکومت کو ان نادر ذخیروں کے سپرد کرنے میں بار محسوس نہیں کیا اور مالی منفعت کو خاطر میں نہیں لائے۔''

3 سر جادو ناتھ سرکار:

''وہ اسلامی کتابیات پر عظیم ماہرین میں سے ایک تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح ایک دن انھوں نے اپنی یادداشت سے علم کا دریا بہا دیا تھا انھوں نے پہلی صدی سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کے عربی تذکرہ نگاروں اور ناقدین کی ایک مکمل فہرست پیش فرما دی تھی اور ہر ایک کی قدر و منزلت پر تبصرہ بھی فرماتے تھے۔''

4 ڈاکٹر سچیدانند سنہا:

خدابخش کے اچھے اور قریبی دوستوں میں سے تھے کہتے ہیں ''خدابخش خان صحیح معنوں میں ایسے عظیم انسان تھے جن پر صرف بہار ہی نہیں بلکہ پورا ہندوستان بجا طور پر فخر کرے گا انھوں نے سادی زندگی بسر کی۔ اس عظیم ادارے کے توسط سے علم و آگہی کے فروغ کے لیے اپنی وکالت سے حاصل شدہ کمائی کا بیشتر حصہ صرف کیا اور اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔''

5 عابد رضا بیدار:

انھوں نے خدابخش کو کتابوں کا شہید قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں ''کتابوں کا ایسا شہید آپ کو خال خال ہی ملے گا جو اچھی کتابیں اور ان پر مشتمل ایک اچھا کتاب خانہ بنانا اپنی زندگی کا مشن بنا لے۔ جینا، مرنا، کھانا، پینا، اوڑھنا، بچھونا سب کچھ کتابیں ہوں اور صرف کتابیں۔''

■

Dr. Mehtab Jahan
Asst Proffesor, Dept of Persian
Delhi University
Delhi - 110007
Mob.:9717412946

مشتاق احمد گنائی

شعبۂ اردو سیوا سدن کالج برہانپور کی ادبی و تحقیقی خدمات

ریاست مدھیہ پردیش ہندوستان کی بڑی ریاستوں میں ایک ہے۔ یہ ریاست ہندوستان کے وسط میں واقع ہے۔ اس ریاست میں اردو زبان و ادب کے قدیم مراکز میں بھوپال کے بعد سب سے زیادہ اہمیت جس شہر کو حاصل ہے وہ شہر برہان پور ہے۔ یہ شہر تاپتی ندی کے شمالی کنارے پر آباد ہے۔ جغرافیائی مناسبت سے اسے 'باب دکن' بھی کہتے ہیں۔ برہان پور مغلوں کی شاندار تاریخ کا امین ہے۔ یہاں اکبر، شاہجہاں، اورنگ زیب جیسے برگزیدہ اور نامور مغل بادشاہوں نے زندگی کے بہترین ماہ سال گزارے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اس شہر کی بڑی اہمیت ہے۔ سلطان ناصر خان نے 1338 میں اس شہر کو بسایا ہے جو فاروقی سلطنت کے سلطان تھے۔ یہ شہر خاندیش کا دارالخلافہ رہا ہے۔ یہاں فاروقیوں، مغلوں، نظاموں، مراٹھوں اور انگریزوں نے حکومت کی ہے، جن کی نشانیاں یہاں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ چاہے شاہی قلعہ ہو یا قدم سیاہ پتھروں سے بنی جامع مسجد، ممتاز محل کا مقبرہ اول ہو یا شاہی حمام ہو، آہو خانہ ہو، درگاہ حکیمی ہو، تاریخی گردوارا ہو یا اسیر گڈھ کا قلعہ ہو۔ ہر عمارت اور قلعے کی اپنی تاریخ ہے۔ شہر کے بیچ میں آج بھی ٹوٹی ہوئی دیواریں اور قدیم دروازے موجود ہیں جس سے برہان پور کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے قدیم عکس آج بھی نظر آتے ہیں۔

> برھان پور میں اردو زبان وادب کے بے شمار شیدائی آج بھی موجود ھیں-یہیں سیوا سدن کالج بھی ھے- یہ کالج آزادی کے بعد 1954 میں قائم کیا گیا ھے- جب سے اس کا قیام عمل میں آیا اسی وقت سے یہاں شعبہ اُردو و فارسی بھی قائم کیا گیا ھے جو اپنی خدمات حسب معمول آج تک بدستور انجام دے رھا ھے-

برہان پور میں اردو زبان وادب کے بے شمار شیدائی آج بھی موجود ہیں۔ یہیں سیوا سدن کالج بھی ہے۔ یہ کالج آزادی کے بعد 1954 میں قائم کیا گیا ہے۔ جب سے اس کا قیام عمل میں آیا اسی وقت سے یہاں شعبہ اُردو و فارسی بھی قائم کیا گیا ہے جو اپنی خدمات حسب معمول آج تک بدستور انجام دے رہا ہے۔

کالج کے یوم قیام سے لے کر 1980 تک یہاں صرف بی۔ اے اُردو اور فارسی کی تدریس کا انتظام تھا۔ 1980 میں جب پروفیسر محمد شفیع صاحب کا تقرر یہاں صدر شعبہ اُردو فارسی کی حیثیت سے ہوا تو ان کی ذاتی دلچسپیوں اور سعی مسلسل سے یہاں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد کے لیے بھی طلبہ کو داخلہ ملا۔ کالج اس وقت ڈاکٹر ہری سنگھ گور یونیورسٹی ساگر سے ملحق تھا۔ پھر دیوی اہلیہ یونیورسٹی سے منسلک ہوگیا۔ پروفیسر محمد شفیع بہت ہی قابل استاد اور اردو کے خیر خواہ تھے۔ انہوں نے اپنے ملازمت کے عرصے کے دوران نہ صرف خود مختلف موضوعات پر مضامین لکھے بلکہ بی اے اور ایم اے کے طلبا کو بھی لکھنے کی تلقین کرتے تھے اور جو لکھنے کی کوشش کرتے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ شفیع صاحب کی زیر نگرانی شعبہ اردو میں پندرہ اسکالرس نے مختلف موضوعات پر پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ جن کی فہرست درج ذیل ہیں۔

نگراں	نام اسکالر	موضوع
ڈاکٹر محمد شفیع	فیروز حسن حاجی	اردو غزل حالی سے 1960 تک
	سید شرف الدین	دکن کے اہم صوفی شعراء اور ان کے کلام کا تحقیقی جائزہ
ایضاً	سید قاضی شکیل	مولانا ظفر علی بحیثیت شاعر
ایضاً	سید جمیل الدین	اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں کی نعت گوئی
ایضاً	محمد عثمان انصاری	دکن کے اہم مثنوی نگاروں کے کلام کا تحقیقی جائزہ
ایضاً	شہناز شفیع	شمالی بندیل کھنڈ کے اہم شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی جائزہ
ایضاً	محمد ادریس نکرانی	ساگر کمشنری کے اردو کے اہم شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی جائزہ
ایضاً	کبیر عالم	اردو میں آیورویدا اور یونانی طب کی تصانیف اور اردو ادب میں طب یونانی
ایضاً	ظہیر احمد	برہان پور کی شعری روایات
ایضاً	جلیل الرحمن	برہان پور کے اہم مرثیہ نگار
ایضاً	شیخ محمد شکیل	خاندیش میں اردو شاعری کی روایت
ایضاً	محمد عارف انصاری	برہان پور کی اردو شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات
ڈاکٹر حدیث انصاری	ناظمہ پروین	کھنڈوہ کے اہم شعرا
ایضاً	شمیمہ انصاری	برہان پور میں اردو نثر کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ
ایضاً	فوزیہ خان بھائی والا	پریم چند کے ناولوں میں دیہاتی کردار

2005 کے بعد سیوا سدن کالج دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور سے منسلک ہو گیا۔ اس کے بعد جو بھی اسناد تفویض کی گئیں وہ سبھی اسی یونیورسٹی کی جانب ہوئیں۔ 2009 میں ڈاکٹر محمد شفیع کی اچانک موت کے بعد کالج انتظامیہ نے ان کے ہی ایک لائق و فائق اور ذہین و فطین شاگرد ڈاکٹر ایس ایم شکیل کو صدر شعبہ کی ذمے داری سونپ دی۔ ڈاکٹر موصوف اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے۔ شعبے کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کر رہے ہیں۔ آپ بہت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ کی نگرانی میں 13 اسکالرس پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں جن میں سات نے مقالہ جمع کیا ہے۔ اور ان کو ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اور اس سال بھی قریب پانچ اسکالرس کو آپ کی نگرانی کی ذمے داری سونپ دی گئی ہے۔ تا حال آپ کی زیر نگرانی ہونے والے تحقیقی کام کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

نگراں	نام اسکالر	موضوع
ڈاکٹر ایس ایم شکیل	اشفاق احمد خان	اردو ڈائجسٹوں کی اہمیت
ایضاً	آزاد ایوب بٹ	کشمیر میں غیر افسانوی نثر 1947 سے پہلے
ایضاً	عبداللہ عباس بٹ	مابعد آزادی اردو ناولوں میں ہجرت کے مسائل
ایضاً	محمد یاسین گنائی	وادی کشمیر کے ادبی اور ثقافتی اداروں کی اردو خدمات
ایضاً	توصیف احمد بٹ	غلام نبی خیال اور ان کے معاصرین کی ادبی خدمات
ایضاً	فیاض احمد ڈار	ریاست جموں کشمیر کے اردو افسانوں میں کشمیریت
ایضاً	رئیس احمد اتو	نسیم حجازی کی ناول نگاری تاریخ کے تناظر میں
ایضاً	حارث حمزہ لون	اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی کشمیر کا قیام اور مقاصد
ایضاً	محمد الطاف انصاری	برہان پور میں نظم نگاری اور اہم نظم گو شعرا
ایضاً	غلام مصطفی	جدید نظم کے بدلتے رجحانات آزادی کے بعد
ایضاً	زاہد یاسین شاہ	جموں کشمیر میں اردو ڈراما... ایک مطالعہ
ایضاً	اعجاز احمد ڈار	جموں کشمیر میں اردو نعتیہ شاعری... ایک مطالعہ
ایضاً	رافیعہ	جموں کشمیر میں خواتین قلم کاروں کی اردو خدمات

اسی تحقیقی مرکز سے منسلک پروفیسر ڈاکٹر عثمان انصاری کی زیر نگرانی ہونے والے کام کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

نگراں	اسکالر کا نام	موضوع
عثمان انصاری	قیصر جمال	ڈاکٹر محمد شفیع حیات اور کارنامے
عثمان انصاری	بے نظیر شفیع	برہان پور میں اردو شعر و ادب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
عثمان انصاری	سیما انصاری	برہان پور کے اہم نعت گو شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
عثمان انصاری	حمید اللہ انصاری	خانوادۂ اشرفیہ کے اہم نعت گو شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ
عثمان انصاری	شبانہ نکہت	برہان پور میں سلسلۂ میر ایک تحقیقی جائزہ
عثمان انصاری	مشتاق احمد بٹ	فرید پربتی حیات اور خدمات ایک تحقیقی مطالعہ
عثمان انصاری	سفیان قاضی	منور رانا فن اور شخصیت
عثمان انصاری	مدثر احمد ڈار	پریمی رومانی حیات اور ادبی خدمات

مذکورہ تحقیقی کام پر ایک طائرانہ نظر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بیشتر کام علاقائی ادب پر ہوا ہے۔ جو ضروری بھی ہے۔ اس سے اردو کے مختلف علاقوں اور شہروں میں تخلیقی ادب کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور وہاں کے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی بھی۔ اس اعتبار سے ہم اس کو دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں ایک وہ جو صرف برہان پور کے شعرو ادب کا احاطہ کرتا ہے اور دوسرا وہ جو برہان پور سے باہر کے علاقوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ پہلے حصے کے تحت اگر دیکھا جائے تو، برہان پور میں اردو شاعری، برہان پور میں اردو نثر، برہان پور میں اردو مرثیہ، برہان پور میں سلسلہ میر، برہان پور کی شاعری پر دبستان لکھنؤ کے اثرات، برہان پور کے اہم مرثیہ گو شعرا، برہان پور میں اردو نعت گوئی، برہان پور کے اہم نعت گو شعرا وغیرہ جیسے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بھی یہاں بعض ایسے موضوعات پر تحقیق ہوئی ہے جو قابل ستائش ہے۔ جیسے دکن کے اہم صوفی شعرا، دکن کے اہم مثنوی نگار۔ اردو میں طب یونانی اور آیوروید کی تصانیف، احمد رضا خان کی نعت گوئی، خاندیش میں شاعری کی روایت، اردو غزل حالی سے 1960 تک، پریم چند کے ناولوں میں دیہاتی کردار، اردو ڈائجسٹوں کی اہمیت، وادی کشمیر کے ادبی اور ثقافتی اداروں کی اردو خدمات وغیرہ جیسے موضوعات پر بھی کام ہوا ہے۔

> **تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو میں دیگر ادبی سرگرمیاں بھی ہوتی ہیں- پروفیسر ایس ایم شکیل بہت ھی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ھیں-مقامی اخبارات اور قومی سطح کے رسائل و جرائد میں بھی مختلف موضوعات پر ان کے فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین شائع ھوتے رھتے ھیں-**

تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو میں دیگر ادبی سرگرمیاں بھی ہوتی ہیں۔ پروفیسر ایس ایم شکیل بہت ہی فعال اور متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ مقامی اخبارات اور قومی سطح کے رسائل و جرائد میں بھی مختلف موضوعات پر ان کے فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں گنج سربستہ کے نام سے 2016 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دو تین کتابیں زیر طباعت ہیں۔ ان کے دل میں اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور ترقی و بلندی کے لیے وسیع مقام موجود ہے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ وہ شعبے میں طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے مختلف ادبی نشستوں اور پروگراموں کا انعقاد بھی کرتے رہتے ہیں۔ شکیل صاحب کے دوران صدارت میں تا حال تین قومی سطح کے سمینار ہوئے ہیں۔ جو ان کی ادب نوازی اور اردو دوستی کا بین ثبوت ہے۔ یہ تینوں سمینار دو روزہ تھے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے انجام پائے ہیں۔ پہلا سمینار 22 اور 23 اگست 2016 میں بعنوان 'تحریک آزادی اور اردو ادب' دوسرا سمینار 18 اور 19 اپریل 2018 میں 'علامہ شبلی نعمانی کی حیات اور ادبی خدمات' پر مبنی تھا۔ تیسرا سمینار 'اردو شعر و ادب میں غیر مسلم عاشقان اردو کا حصہ' کے عنوان سے 7 اور 8 فروری 2020 کو منعقد ہوا۔ ان سمیناروں کی کامیابی میں جہاں شکیل صاحب کا اہم رول ہے وہیں کالج انتظامیہ کی دلچسپی بھی قابل ستائش و تحسین ہے۔ شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر قیصر جمال اور پروفیسر محمد الطاف انصاری کے علاوہ تقریباً سبھی شعبوں کے اساتذہ اس طرح کے ملکی سمیناروں کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر ایس ایم شکیل کا بھرپور ساتھ اور تعاون دیتے ہیں۔

■

Dr. Mushtaq Ahmad Ganai
47, Ganaie Mohallah Samboora, Pampore
Pulwama - 192121 (J&K)
Mob.:7006402409

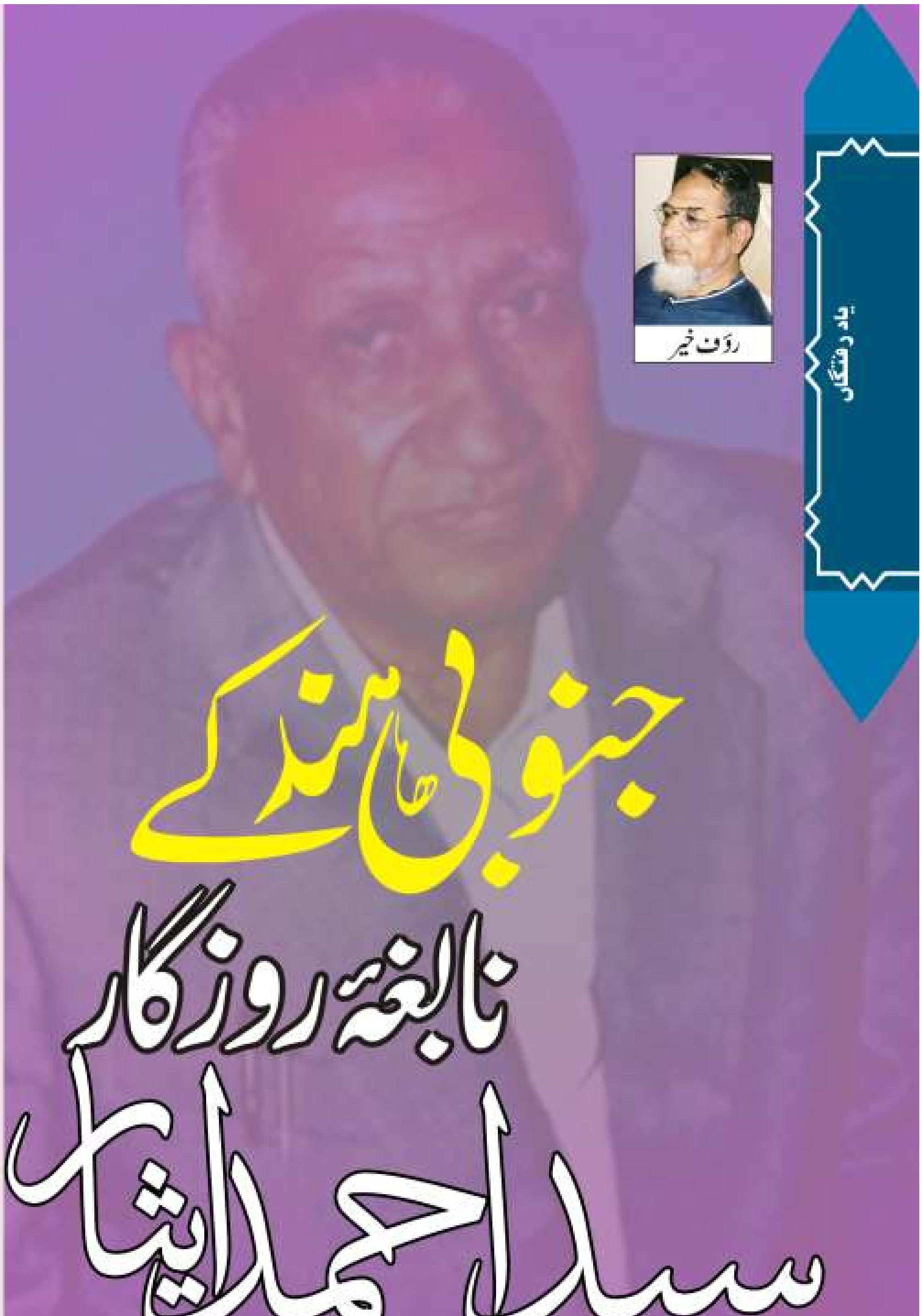

جنوبی ہند کے نابغۂ روزگار سید احمد ایثار

رؤف خیر

ٹی ایس ایلیٹ اپنی شاہ کار نظم کی ابتدا میں کہتا ہے

: April is the cruelest month یاد رہے ہر فن مولا عزیز احمد نے اس شاہ کار نظم کا 'خراب آباد' کے نام سے آزاد ترجمہ کیا تھا۔ 2021 کا اپریل بھی بڑا ظالم مہینہ ثابت ہوا۔ اردو شعر وادب کی کئی ہر دل عزیز شخصیتیں اس مہینے داغ مفارقت دے گئیں۔ کیسے کیسے لکھنے والوں کے قلم کی سیاہی خشک ہوگئی۔

اسی ماہ میں علامہ اقبال کے سید التراجم حضرت ایثار بھی اس دنیا کو الوداع کہہ گئے۔

پچیس جولائی 1922 کو میدان حیات میں قدم رنجہ فرمانے والے سید احمد ایثار کی شمسی تقویم کے اعتبار سے بھلے ہی سنچری میں ایک کسر رہ گئی ہو مگر قمری تقویم کے مطابق تو سنچری مکمل ہو ہی گئی تھی۔ اپنی باری میں انھوں نے ترانہ و ترنگ کے کئی چوے اڑائے اور بعض یادگار چھکے بھی مارے۔ جنوبی ہند کے اس قلم کار نے وہ منفرد بے نظیر ریکارڈ قائم کیا ہے جس سے آگے جانے والا مشکل سے پیدا ہوگا۔

اول تو ہند و پاک میں فارسی لکھنے پڑھنے والے ناپید ہوگئے الا ماشاء اللہ ایسے میں یہ بے حد ضروری تھا کہ علامہ اقبال کے ہر فارسی شاہ کار کا باذوق اردو داں حلقے سے بھرپور تعارف کرایا جائے اس مشکل کام کے لیے جان ناتواں رکھنے کے باوجود جناب سید احمد ایثار نے بیڑہ اٹھایا۔ اور الحمد اللہ سرخ رو بھی ٹھیرے۔

علامہ اقبال کے بے مثال شاہ کار جاوید نامہ کا منظوم ترجمہ 1979 میں کیا مگر جو 2003 میں شائع ہوا۔ ساتھ ہی ''اسرار خودی و رموز ی بے خودی'' کے ترجمے سے بھی اسی سال عہدہ بر آ ہوئے جو 2008 میں منظر عام پر آیا۔ 'ارمغان حجاز' کو بھی اردو میں ڈھالنے میں 1979 ہی میں کامیاب ٹھیرے جو 2009 میں چھپا۔

علامہ اقبال کو اپنے مجموعۂ کلام 'زبور عجم' پر بڑا ناز تھا اور وہ اپنے باذوق قاری سے مطالبہ کرتے ہیں۔

اگر ہے ذوق تو خلوت میں پڑھ 'زبور عجم'
فغان نیم شبی بے نوا ے راز نہیں

اردو کے باذوق قاری تک زبور عجم کو پہنچانے کی ذمے داری سید احمد ایثار نے اپریل 1980 میں نبھائی یہ الگ بات ہے کہ یہ مجموعہ اکتوبر 1999 میں اشاعت کا منہ دیکھ سکا۔

اقبال کی قوم وملت سے دردمندی و ہمدردی کی شاہ کار مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' کو بھی قوم و ملت تک پہنچانے کے لیے جناب ایثار نے 1980 ہی میں اس کا منظوم ترجمہ کر ڈالا مگر اردو داں قوم تک علامہ اقبال کا یہ پیغام 2006 سے پہلے پہنچ نہ سکا۔

جرمن شاعر گوئٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں اقبال کا 'پیام مشرق' آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے منظر عام پر آیا تھا جس کا منظوم ترجمہ سید احمد ایثار نے 1982 میں مکمل کر دیا تھا مگر یہ کرناٹک اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے 1997 میں منظر عام پر آیا۔

اقبال کے فارسی شاہ کاروں کے تراجم کے علاوہ سات سو بہتر 772 رباعیات عمر خیام کا منظوم اردو ترجمہ رباعی ہی کی بحر میں سید احمد ایثار نے 1977 ہی میں کر دیا تھا مگر یہ بھی کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام 2019 میں شائع ہو سکا۔ 1982 سے 1992 کے دس سالہ عرصے میں حضرت ایثار نے مثنوی مولانا روم کا ترجمہ پانچ جلدوں میں انجام دیا تھا جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو NCPUL دہلی نے 2020 میں شائع کیا۔

جنوبی ہند کے ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے جناب سید احمد ایثار نے علامہ اقبال کے تمام فارسی شاہ کاروں

کے ساتھ ساتھ رباعیات عمر خیام اور مثنوی مولانا روم کی پانچ جلدوں میں جو کارنامے اپنے پیچھے چھوڑے ہیں وہ انھیں اردو ادب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کا شمار بلاشبہ ماہرین اقبالیات میں ہوتا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ایک بڑا علمی حلقہ ان سے کما حقہ واقف ہی نہیں ہے اس میں خود جناب ایثار کی قلندرانہ بے نیازی کا دخل ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو منوانے کے جتن کیے ہی نہیں حالانکہ انھوں نے بڑی ہی خود اعتمادی کے ساتھ فارسی متن کے بالمقابل اردو متن رکھ کر دعوت خوش ذوقی دی ہے۔ اپنے طبع زاد کلام ''ترانہ وترنگ'' اور ''آبشار'' کو ذیلی و ثانوی حیثیت دی۔ اپنی خودنوشت ''سراغ زندگی'' میں اپنے حالات بلاکم وکاست بیان کردیے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ان کے ایک قریبی دوست محمد اقبال نے 'واردات ایثار اور جہات اقبال' کے نام سے ایثار پبلیشنگ ہاؤس ٹرسٹ بنگلور کے زیر اہتمام 2006 میں مختلف عنوانات کے تحت ایثار صاحب کے فکروفن کے تعلق سے لکھے ہوئے کئی مضامین اور بعض مشاہیر کے خطوط مرتب کیے جن کی روشنی میں سید احمد ایثار کا بھرپور تعارف ہو جاتا ہے۔ 2017 میں ایک اور مجموعہ بھی 'واردات ایثار' ہی کے نام سے ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ بنگلور کے تحت جناب محمد اقبال نے بعض اہم لکھنے والوں کے جناب ایثار کے نام مکتوبات اور مضامین کو جمع ومرتب کرکے ایثار فہمی کی راہ ہموار کی جس میں خود جناب ایثار کے لکھے ہوئے چند معلوماتی مضامین جیسے قرآن کے ادبی محاسن، اقبال کی نعت گوئی، اقبال کا تصوراتی حج، شکوہ و جواب شکوہ کی تفہیم، اقبال کے تراجم کا ایک اجمالی جائزہ اور چند شخصیات کے خاکے بھی شامل ہیں۔

سید التراجم کا ایثار سخن تو دیکھیے کہ طبع زاد تخلیقات سے اپنے آپ کو منوانے کے بجائے مستند تخلیق کاروں کے فارسی شاہ کاروں کو مادری زبان کے ذریعے روشناس کروانے کے جتن کرتے رہے اور وہ بھی منظوم۔ ظاہر ہے شعر کے ترجمے کا مزہ تو شعر ہی میں آتا ہے۔ اچھے سے اچھے شعر کا اگر نثری ترجمہ ہو تو اس کی روح تو مجروح ہو جاتی ہے۔ محترم سید احمد صاحب نے جس عرق ریزی سے نایاب فارسی شاہ کاروں کو منظوم اردو کا جامہ دل کش پہنایا ہے وہ ہر اعتبار سے قابل داد ہے۔ مترجم ہونا دوسرے درجے کا خالق ہونا ہے۔ مگر جناب سید احمد ایثار کا ایثار دیکھیے کہ انھوں نے اس حیثیت ثانوی کو اولیت بخشی اور اب یہی ان کی پہچان بھی ٹھہری۔ ان کا اپنا 'ترانہ و ترنگ' دب کر رہ گیا ہے۔

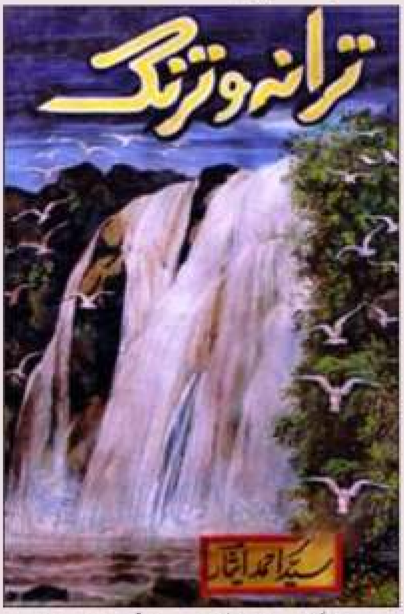

25 اگست 2005 کو ان سے انھی کے در دولت پر نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کی کاوشوں کی تفصیلی روداد سننے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ حیرت تو یہ جان کر ہوئی کہ ایثار صاحب نے بے شمار فارسی شاہ کاروں کے تراجم محض اپنی خوش ذوقی کے بل بوتے کر ڈالے حالانکہ آپ نے کسی مدرسے میں یا کسی استاد کامل سے باضابطہ فارسی کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ ان تراجم کی داد دینے والا بھی کوئی آپ کو میسر نہ تھا۔ لے دے کے ایک مڈل پاس غریب دوست سید حسین تھے جو ایثار صاحب کے منظوم تراجم خوش خط لکھ کر خوش ہوا کرتے تھے اس طرح یہ تراجم محفوظ بھی رہ سکے۔ ایثار صاحب محکمہ جنگلات کے بہت بڑے افسر اور سید حسین آب رسانی میں معمولی ملازم لیکن اس ادبی پر بہار رشتے نے دونوں کو شاداب و مستحکم رکھا تھا۔ ایثار صاحب نے سید حسین مرحوم کے احسانات کا بہت ذکر کیا ہے حتیٰ کہ اپنا شعری مجموعہ ان کے نام معنون بھی کیا ہے۔ ایک دور وہ بھی آیا کہ سید حسین کے لڑکے اتنے مرفہ حال ہو گئے کہ انھوں نے ایثار صاحب کی ایک کتاب کی اشاعت میں مالی اعانت بھی کی۔

محکمۂ جنگلات میں بے انتہا مصروفیت اور اندرونی محکمہ جاتی سیاسی کشمکش کے باوجود ادبی شاہ کاروں کے تراجم کے لیے ایثار صاحب وقت نکالتے رہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ علمی ادبی ماحول بھی آپ کو میسر نہیں تھا۔ آپ نے ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا کہ 1942 میں 'اسرار خودی' ہاتھ لگی۔ قیمت چھے 6 روپے تھی۔ مگر وہ اسے خریدنے کے قابل نہیں تھے۔ لامحالہ پوری کتاب نقل کر ڈالی اور یوں بیشتر اشعار ازبر ہو گئے۔ گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر آتے جاتے تنہائی میں اقبال کے اشعار گنگناتے جاتے۔

آپ نے بتایا کہ 'آمدن سی لفظی' سامنے رکھ کر فارسی سیکھی۔ اپنے طور پر فارسی شعر وادب کا ایسا ذوق پیدا کیا جو کئی شاہ کاروں کو روشناس خلق کروانے کا باعث بنا۔ آج سارے بنگلور بلکہ سارے جنوبی ہند کے ماہرین اقبالیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے آپ کے کارناموں کی داد دی ہے۔ یوں تو پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور معتبر نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی جناب ایثار کی خدمات کو سراہا ہے پھر بھی وہ قدر ومنزلت آپ کے حصے میں نہیں آئی جس کے آپ مستحق ہیں۔ اقبال نے خرد کے بالمقابل جس جنوں کی پذیرائی اپنے کلام میں کی ہے اس کا جیتا جاگتا پیکر ایثار ہمارے سامنے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد سوا سو روپے (ایک روپیہ چار آنے کی) رائل ڈکشنری سے انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ کر سکتے ہیں تو سید احمد ایثار آمدن سی لفظی سامنے رکھ کر علامہ اقبال کے تمام کلام کا ترجمہ کیوں نہیں کر سکتے۔

پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، اسرار و رموز اور ارمغان حجاز جیسے شاہ کاروں کا منظوم اردو ترجمہ بجائے خود قابل تحسین کارنامہ ہے۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ اقبال کے ان شاہ کاروں کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے ایک معلوماتی مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور یوں اس شاہ کار کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ترجمے کی شواریوں پر بھی روشنی ڈالی۔ خاص طور پر 'جاوید نامہ' کا 70 صفحات پر پھیلا ہوا مقدمہ بجائے خود دستاویزی نوعیت کا حامل ہے۔ اس میں آپ نے تصنیف کی ابتدا، تمہید آسمانی، تمہید زمینی، جہاں دوست و شوامتر کی حقیقت، فلک عطارد، طاسین زرتشت، طاسین گوتم، طاسین مسیح سے لے کر جمال الدین افغانی اور سید علم پاشا کی مساعی جمیلہ کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ غنی کاشمیری، بھرتری ہری اور احمد شاہ ابدالی وغیرہ کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی۔ آپ نے ہر کتاب کا مقدمہ تقریباً ایسا ہی جامع تحریر فرمایا ہے جس سے کتاب، صاحب کتاب اور مترجم کی علمیت سے قاری کا شرح صدر ہوتا ہے۔ 'پس چہ باید کرد' کا مقدمہ لکھتے ہوئے ایثار صاحب نے اس مثنوی کا پس منظر بیان کیا کہ نادر شاہ والئی افغان کی دعوت پر علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود افغانستان گئے تھے تاکہ اس ملک کے لیے نئی تعلیمی پالیسی پیش کریں۔ اس مثنوی میں در آنے والی

اہم شخصیت نادر شاہ، حکیم سنائی اور سلطان محمود غزنوی کا ضروری تعارف لکھ کر ایثار صاحب نے خاصی معلومات فراہم کی ہیں۔

زبورِ عجم کا مقدمہ لکھتے ہوئے آپ نے اقبال کے تصورِ خودی، نظریہ وحدت الوجود وغیرہ کے ساتھ ساتھ محمود شبستری کی 'گلشن راز جاوید' میں اٹھائے گئے بعض اہم سوالات اور ان کے حل پر بھی کافی دلچسپ مواد پیش کیا ہے۔ غرض ترجمے تو رواں دواں ہیں ہی، مقدمے بھی آپ کی علمیت کے مظہر ہیں۔

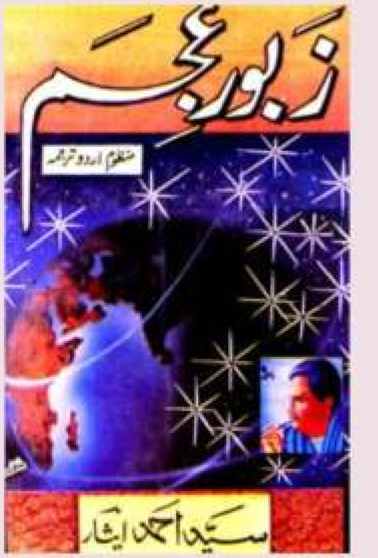

اقبالیات کے علاوہ جناب ایثار نے عمر خیام کی ان سات سو بہتر 772 رباعیات کا منظوم ترجمہ کر ڈالا۔ شمس تبریز کی چار سو چھتیس رباعیات کا ترجمہ کرتے ہوئے آپ نے محسوس کیا کہ ایک رباعی ایسی ہے جو دونوں شاعروں کے دیوان میں لفظ بہ لفظ موجود ہے۔

اے زندگی تن و تو انم ہمہ تو
جانی و دلی اے دل و جانم ہمہ تو
تو ہستی من شدی از آنی ہمہ من
من نیست شدم در تو از انم ہمہ تو

مخفی مباد کہ شمس تبریز تو بے چارہ مجذوب تھا۔ رومی نے ہزاروں غزلیات اپنے مرشد شمس تبریز کی یاد میں کہہ ڈالیں اور وہ غزلیں شمس تبریز کے نام سے 'دیوان شمس تبریز' میں جمع کی گئیں۔ یہ رباعی بھی دراصل رومی کی ہے۔ رومی اور خیام کی رباعی کی مماثلت دراصل اسی سبب سے ہے کہ بعض خوش ذوق ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے نام سے لکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح کے الحاق کلام کی کئی مثالیں اردو ادب میں مل جاتی ہیں۔ وہی صورت حال ایثار صاحب پر واشگاف ہوئی۔ خیام و رومی کی اس مشترکہ رباعی کا منظوم اردو ترجمہ بھی آپ نے یوں کیا ہے۔

تن کے لیے زندگی توانائی تو
تو جان میں دل میں دل وجاں میری تو
تو میرا وجود اس لیے تو خود مجھ میں
میں تجھ میں فنا ہوں اس لیے ہوں بھی تو

ایثار صاحب نے سعدی شیرازی کی 161 رباعیات، حافظ شیرازی کی 88 میں سے 33 رباعیات کے منظوم اردو ترجمے کے علاوہ رومی کی مثنوی معنوی مولوی کا اردو ترجمہ بھی تین جلدوں میں کر کے رکھ دیا ہے جو اشاعت کی منتظر ہیں۔

جناب سید احمد ایثار نے رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ 'بادۂ خیام' کے نام سے کیا جسے کرناٹک اردو اکادمی نے 2019 میں شائع کیا۔ ایثار صاحب نے عبدالباری آسی کے مرتبہ 772 رباعیات خیام کو بنیاد بنایا۔ کتاب کے دائیں جانب کے صفحے پر چار چار فارسی رباعیات خیام ہیں اور بائیں جانب بالمقابل ان کا منظوم ترجمہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح 772 رباعیات کا ترجمہ دراصل ایثار صاحب کا کارنامہ ہے جو 2 اگست 1978 ہی کو تکمیل کو پہنچا تھا۔

محترم سید احمد ایثار کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اپنی ابتدائی تعلیم ملک میں اور ملک سے باہر جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا، شادی، جنگلوں میں پیدل چلنا، تقریباً تیس پینتیس میل کا پیدل سفرات بھر کر کے گھر پہنچنا، ملازمت میں ایک جنگل سے دوسرے جنگل کو تبادلہ، بعض ضرورت مندوں کی مدد کرنا اور پھر ولایت کا سفر ہوائی جہاز سے، وہاں سے تعلیم کے بعد سمندری جہاز کے ذریعے تجربات سے گزرتے ہوئے واپسی وغیرہ امور سے متعلق محترم سید احمد ایثار صاحب نے کھل کر اپنی آپ بیتی 'سراغِ زندگی' میں لکھا ہے۔

سید احمد ایثار صاحب جیسے شریف آدمی نہ اپنے ماتحتین سے خوش ہوتے ہیں نہ اپنے افسران بالا کو خوش کرتے ہیں۔ یہی ان کے سراغِ زندگی کی روداد ہے۔ ایک باکردار آدمی کسی بے کردار سے بھلا کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ مگر ایسے آدمی کی خوش کرداری اسے باوقار بناتی ہے۔ اس کا اپنا مضبوط کردار اسے دوسروں کی نظروں میں سبک ہونے نہیں دیتا اور ہر ایمان دار آدمی ایسے صاحب کردار کی قدر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو یہی 'خوش کرداری' مردِ مومن کی کمائی ہے۔ سید احمد ایثار مردِ مومن ہیں۔

جنگل کی زندگی، دفتری سیاست، ناگفتہ بہ حالات سے گزرتے ہوئے محترم سید احمد ایثار صاحب نے علامہ اقبال کے فکر و فن سے جو اپنے شغف کو برقرار رکھا وہ قابل داد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ماہرین اقبالیات ہند و پاک میں بہت ہیں۔ علامہ اقبال کے فارسی کلام کو اردو میں ڈھالنے والے بھی کئی ہیں مگر اقبال کے تمام فارسی شعری مجموعوں کو منظوم اردو میں پیش کرنے کا سہرا صرف اور صرف سید التراجم حضرت سید احمد ایثار ہی کے سر بندھتا ہے۔ آپ نے اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، ارمغانِ حجاز اور پیامِ مشرق کا منظوم اردو ترجمہ یکے بعد دیگرے 1979 سے شروع کر کے 1982 میں مکمل کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان تراجم کی اشاعت مسلسل نہ ہو سکی بلکہ جیسے جیسے موصوف کو سہولت حاصل ہوئی یعنی حسبِ استطاعت ان کی اشاعت عمل میں آئی۔ محترم ایثار صاحب کو وظیفہ یابی کے بعد 78000 روپے کے بقایا جات حکومت سے موصول ہوئے تو انھوں نے یہ پوری رقم کتابوں کی اشاعت میں لگا دی۔

میں اکثر کہتا رہتا ہوں کہ جو قلم کار بنیادی طور پر شاعر ہوتا ہے وہ ہر صنفِ سخن میں اپنی پہچان کروا کر ہی چھوڑتا ہے چاہے وہ افسانہ ہو، ناول ہو، مضمون نگاری ہو، ڈرامہ نگاری ہو، تنقید ہو، تحقیق ہو چاہے کچھ ہو، اگر وہ متوازن فکر کا حامل ہی نہ ہوگا تو کسی دوسرے کے فن پارے کو بھلا کیسے جانچ پائے گا، تحقیق کرتے ہوئے بھی کسی شاعر کا کلام مرتب نہ کر پائے گا نہ اچھا ڈرامہ لکھ سکے گا نہ اچھا افسانہ یا ناول۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ فن کار کا بنیادی طور پر شاعر ہونا ضروری ہے، آپ کو مجھ سے اختلاف کا حق حاصل ہے اگر آپ شاعر نہیں ہیں۔

محترم سید احمد ایثار بھی بنیادی طور پر شاعر ہیں ورنہ اقبال جیسی عبقری شخصیت کے شاہ کاروں کا ترجمہ کیسے کر پاتے۔ انھوں نے ترجمے کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو محدود کر لیا۔ وہ اسی دائرے میں سرگرداں رہنے پر مجبور ہیں جو دائرہ اقبال نے کھینچ رکھا ہے۔ اس لکشمن ریکھا سے باہر قدم رکھنا گویا اون کے حوالے ہو جانا ہے۔ اقبال ان کے فکر و فن پر اس قدر حاوی ہے کہ وہ اقبال کے بغیر ایک لقمہ بھی نہیں توڑتے۔ عالم یہ ہے۔

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad - 500008 (Telangana)
Cell.:9440945645
Email.: raoofkhair@gmail.com

کلیم عرفی

ایک فراموش کردہ ادیب

انور آفاقی

11 اپریل 2021 کی شب میں ایک روح فرسا خبر ملی کہ نہیں رہے مشہور ساہتیہ کار کلیم عرفی۔ اس خبر نے، نہ صرف مجھے چونکا دیا بلکہ صدمے اور سکتے میں بھی ڈال دیا۔ صدمہ اس لیے کہ تقریباً نصف صدی سے زیادہ اپنی تخلیقات سے اردو دنیا میں اپنے اسلوب اور طرز بیان سے جادوگری کرنے والا مایہ ناز قلم کار اپنے مالک حقیقی سے جا ملا اور سکتہ اس لیے کہ ایسے عظیم تخلیق کار کی وفات پر نہ ذرائع ابلاغ نے تفصیل سے خبر دی نہ کسی کو غم ہوا نہ افسوس۔ کل کا ممتاز ادیب وقت کی دھند میں گم اور لوگوں کی بے اعتنائیوں کا شکار ہوگیا۔ سچ ہی تو کہا تھا ساحر نے

کل کوئی مجھ کو یاد کرے، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے کیوں وقت اپنا برباد کرے

کلیم عرفی میرے لیے اجنبی نہ تھے۔ میں نے اپنے گریجویشن کے زمانے (1972-1974) میں ان کا مشہور ومقبول ناول 'صنم خانوں میں' جو ارض فلسطین کی بستی ناصرہ کے ابن مریم کی ولادت مقدس کے ایک ہزار نو سو چھپن سال بعد (یعنی 1956 عیسوی) مکتبہ جاوید الہ آباد نے بڑے تزک واحتشام سے شائع کیا تھا، اسے میں نے پڑھا تھا۔ اس ناول کی شہرت اس زمانے میں بہت دور تک پھیلی تھی اور لوگوں کے درمیان بحث وتکرار کا سبب بن گئی تھی۔

کلیم عرفی کی پیدائش الہ آباد (پریاگ راج) میں دو اکتوبر انیس سو اٹھائیس (02/10/1928) عیسوی میں ہوئی تھی۔ تعلیم وتربیت کے بعد جلد ہی وہ تلاش معاش کے لیے بمبئی (ممبئی) منتقل ہوگئے اور وہیں اپنی قسمت آزمانے لگے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات فلمی دنیا کی بڑی مشہور ومعروف شخصیتوں سے ہوئی جن میں گرودت، راج کپور، منوج کمار، آتما رام، اس۔ ڈی۔ نارنگ اور ٹی۔ پرکاش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہیں انھوں نے پہلے فلموں اور بعد میں ٹیلی ویژن ڈراموں کے لیے اسکرین پلے لکھے۔

صحت کی خرابی کے باعث تقریباً دس سال قبل ممبئی سے الہ آباد واپس آگئے اور اپنے اٹالا میں واقع گھر پر رہائش پذیر ہوگئے تھے۔ دن بہ دن ان کی صحت بگڑنے لگی۔ علاج ومعالجہ بھی چلتا رہا مگر 11 اپریل 2021 کی رات میں پونے گیارہ بجے آخری سانس لی۔ کڈنی کا فیل ہونا ان کی موت کا سبب بنا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الہ آباد (پریاگ راج) کے کالا ڈانڈا قبرستان میں سوموار (12 اپریل 2021) کو دن میں دس بجے سپرد خاک ہوئے۔ وہ تقریباً 92 سال 6 ماہ اس دار فانی میں رہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے ایک بھرا پرا کنبہ چھوڑا۔

کلیم عرفی نے مختلف موضوعات پر ایک سو سے زیادہ تصانیف اردو ادب کو دی ہیں جن میں ناول، فکشن، ڈرامہ، ترجمہ اور بچوں کے ادب شامل ہیں۔ ان کی تصانیف اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع ہوئیں۔ وہ اردو، ہندی کے ساتھ فارسی اور انگریزی پر بھی قدرت رکھتے تھے۔

کلیم عرفی کا پہلا ناول 'سائیکی' 1954 میں مکتبہ جاوید الہ آباد نے شائع کیا، دوسرا ناول 'رضیہ سلطانہ' 1955، 'صنم خانوں میں' اور 'غم خانۂ دل' 1956 'یوکتا' ستمبر 1956، 'خیال فصل گل' اور 'طرب گاہ رقیب' 1961، 'ساتویں یاترا' 1974 اور 'جس کی عظمت میں گھنٹے بجتے ہیں' 2003 میں شائع ہوئے۔ سائیکی کی اشاعت پنجم 1987 میں ہوئی۔ 'سات بیٹوں کا باپ' (ٹی۔ وی۔ ڈرامے) 2006، اور کلیم عرفی کے پانچ ٹی۔ وی ڈرامے 2007 میں منظر عام پر آئے۔ بچوں کے لیے تین کتابیں لکھیں جبکہ 'فردوس گم شدہ'، داستان سماوی، مذہب عشق، شاہنامہ، جاوید نامہ اور کادمبری (ہندی) کے نام سے ان کے تراجم اشاعت پذیر ہوئے۔

کلیم عرفی نے دو درجن سے زیادہ ٹی۔ وی۔ ڈرامے لکھے، 'پازیب' اور 'ایک بیٹے کا باپ' ان کے طویل ڈرامے ہیں۔ ان کے علاوہ 50 ڈراموں کا مجموعہ (پانچ جلدوں میں) بھی مکتبہ جاوید الہ آباد نے شائع کیا تھا۔

ساتھ ہی ان کی تصانیف، نقش پائے قدم، نقش ناتمام، غم خانۂ ہستی، راہ صلیب، سفیر غم، ظلمات شب غم، غبار راہ نجوم، ازل سے ابد تک، سیاح وغیرہ کا شمار اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔

مکتبہ جاوید اپنے زمانے میں اس لیے بھی بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ یہ اپنی ہر کتاب کو اسلوب کی ارتقا پذیر جدتوں اور مواد کی گیرائی اور فنی باریکیوں کو کسوٹی پر پرکھ کر شائع کرتا تھا۔ کلیم عرفی کی تقریباً ساری تصنیف وتالیف مکتبہ جاوید نے ہی شائع کی ہیں۔

کلیم عرفی نے ناولوں کے بعد سب سے زیادہ ڈرامے تخلیق کیے ہیں کیونکہ وہ سوچتے اور سمجھتے تھے کہ ٹی۔ وی کے ڈراموں سے اردو زبان کا فروغ ہوسکتا ہے۔ اردو تہذیب، وسعت پاسکتی ہے، اردو معاشرت مزین ہوسکتی ہے۔

کلیم عرفی، حکومت ہند کی وزارت صحت وخاندانی فلاح وبہبود اور حکومت بہار (اردو اکیڈمی) کی طرف سے ناول 'ساتویں یاترا' کے لیے انعام یافتہ تھے۔ ان کے اسی ناول ساتویں یاترا کے لیے اردو اکیڈمی یوپی نے بھی سند وانعام سے نوازا تھا۔

ان کا ناول 'ساتویں یاترا' کی سب سے بڑی خوبی اس کا طرز اسلوب ہے۔ یہ کتاب گنگا جمنی تہذیب، سماجی بھائی چارہ اور ہندو مسلم دوستی واتحاد کی فضا کو استوار کرتی ہے۔ ساتویں یاترا کے بارے میں خود کلیم عرفی رقمطراز ہیں، کہتے ہیں ''ہمیشہ کی طرح میں نے پھر طرز واسلوب میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اجنبیت لازمی ہے۔ (ساتویں یاترا، ص 10)

اس ناول کی ابتدا 'حالیہ بیانیہ نمبر 1' سے ہوتی ہے اور اختتام حالیہ بیانیہ 110 پہ ہوتا ہے۔ ابتدا یوں ہوتی ہے......

حالیہ بیانیہ 1:

''شطرنج کی بساط بچھی ہوئی ہے ایک جانب مولوی عنایت اللہ صاحب اور دوسری جانب پنڈت کاشی پرساد دوبے بیٹھے ہیں۔ بساط پر مہرے لگے ہیں۔ دونوں سوچ رہے ہیں۔ سامنے کی کھڑکی کھلی ہے۔ روشنی کم ہوتی جارہی ہے۔ ملگجا اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ مولوی صاحب جھوم رہے ہیں۔ دوبے صاحب آنکھوں کی کمزوری کی وجہ سے بساط کے قریب جھکے ہیں۔ کھڑکی سے دکھائی دے رہا ہے دن بھر کا تھکا ہوا آفتاب ایک تھکن کے ساتھ بلندی سے پستی کی طرف گرتا جارہا ہے۔ گل ریز لالہ زار کریں کا کائنات پر بکھری ہوئی ہیں۔ شفق کی سرخ روشنی بساط پر پڑ رہی ہے۔ اندھیرا اور بڑھتا ہے اور بڑھتا ہے۔ غروب کی لالی غائب ہوجاتی ہے۔ ساتھ ہی اللہ کی بلندی اور انسان کے فلاح کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اذان سنتے ہی مولوی صاحب کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اذان ختم بھی نہیں ہونے پاتی پاس ہی کے

کسی مندر سے ناقوس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مندر کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ پنڈت جی بھی اٹھ چکے ہیں........''

کلیم عرفی اپنی والدہ سے بے انتہا عقیدت و محبت کرتے تھے، بے حد عزیز رکھتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے ہر ناول میں انتساب کے صفحہ پر کیا ہے۔ اپنے ناول ساتویں یاترا میں وہ لکھتے ہیں:

''اماں! ایک اور کوشش ناتمام''۔ انھوں نے اپنی پہلی دو کتاب سانگی اور رضیہ سلطانہ کا انتساب اپنی والدہ جو کہ اس وقت حیات سے تھیں، میں صرف یہ لکھا تھا: ''اپنی والدہ کے لیے..........''

مگر والدہ کی وفات کے بعد جتنے بھی انتسابی کلمات ان کے نام کیے ہیں وہ خون جگر میں قلم ڈبو کر لکھے گئے ہیں قارئین کے لیے ان میں سے چند کو درج کر رہا ہوں:

''اماں! غم زدہ اکتایا ہوا، تھکا ہارا، مجروح و شکستہ زندگی کا کارواں خمارِ آرزو لیے وقت کے مہیب و بھیانک طویل اور سنسان ریگستانوں میں گم، تاریک قرار گاہوں کو عبور کرتا ہوا، آتشِ فراق میں سلگتے ہوئے اداس دنوں اور اداس راتوں کے اختتام کا منتظر ہے۔'' (غم خانۂ دل)

''اماں! کائناتی گرد و غبار میں ایک اور ناتمام خیالی سفر ایک اور کوشش'' (خیال فصل گل)

ناول 'طرب گاہِ رقیب' کے اس انتساب سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے انھوں نے نثری ادب میں کیسے کیسے کامیاب تجربے کیے۔ ملاحظہ فرمائیں: ''اماں! کاش آپ نے دیکھا ہوتا میں کس طرح نثری ادب کو شاعری، مصوری اور صنم سازی کے اعلیٰ مقام پر لے آیا ہوں۔''

اماں! جب اس خاک جہاں مجبور پر آپ کے سفر آخر کے بعد شب و روز کی گرد سفر پھیلی اور ازلی و ابدی خلاؤں کو عبور کرتے ہوئے مہر و ماہ نے چار سو اٹھانوے منزلوں اور قرار گاہوں کا اختتام کیا تو ذہنی سفر کی یہ روداد عدم تکمیل کے ایک نشان راہ پر دم بھر کو ٹھہری۔'' (صنم خانوں میں)۔

ناول 'جس کی عظمت میں گھنٹے بجتے ہیں' کے انتسابی کلمات ''اپنی اماں کے نام..... جو عالم ہستی میں ایک چراغ یقیں طاہر و صادق رہنما چراغ۔''

کوئی ماں اپنے جگر گوشے کے لیے کس قدر محبت اور قوت و توانائی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اس کا احساس ان کی جدائی کے بعد ہی اولاد کو ہوتا ہے۔ اپنے ٹی۔ وی۔ ڈراموں کی کتاب 'سات بیٹوں کا باپ' میں اپنے احساس و جذبات کو نہایت کرب و غم میں ڈوب کر کلیم عرفی نے تحریر کیا ہے اور جسے پڑھ کر اس کی ٹیس قارئین کو اپنے جگر میں اٹھتی ہوئی محسوس ہوگی وہ لکھتے ہیں:

''اماں! آپ کے رخصت جہاں کے بعد دنیا میرے لیے ایک مقتل ایک دار ایک صلیب گاہ ہوگئی ہے، جہاں میں ہر لحظہ قتل ہوتا ہوں دار پر چڑھتا ہوں مصلوب ہوتا ہوں۔''

کتاب ''کلیم عرفی کے پانچ ٹی۔وی۔ ڈرامے'' میں وہ اپنی والدہ سے کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

''اماں میرے پاس فکر ہے نہ نظر ہے نہ فن ہے۔ میں ایک حقیر کمتر، بے مقام، ناکام، بے نام قلم کار ہوں پھر عظیم قلم کار میری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے میں ایک صاحب مقام صاحب بصیرت آشنائے رازِ حیات ہوں۔''

یوں تو کلیم عرفی کی ہر تصنیف اپنی فکری اساس، طرز بیان اور جدید اسلوب کی بنا پر اپنا ایک درجہ ایک مقام رکھتی ہے مگر مجھے چند باتیں فی الوقت ان کے معروف و مقبول ناول 'صنم خانوں میں' کے حوالے سے کرنی ہے۔ اس ناول 'صنم خانوں میں' سے متعلق اشاعتی ادارہ مکتبہ جاوید کی رائے دلچسپی سے خالی نہیں جو بانگ دہل کہتا ہے:

''یہ کتاب مکتبہ جاوید نے تکنیک کے ایک ایسے اچھوتے تجربے کی حیثیت سے شائع کی ہے جو عزم و ارادے کی دنیا میں صرف بڑے بڑے ذہنوں کا حصہ رہا ہے اور ہم نے انھیں کے نقوش قدم اپنے لیے پسند کیے ہیں جن کی کوئی شے نوع انسان کی تاریخ سے ہٹاکے، فراموشی کے غار میں نہیں ڈھکیل سکتی۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ناول اپنے اسلوب، انداز بیان اور موضوع فن کے اعتبار سے بالکل اچھوتا ہے۔ اس طرز سخن کا اظہار اس سے پہلے کم از کم اردو ادب میں مجھے نظر نہیں آتا۔ یہ ناول اپنے زمانے میں اعلیٰ معیار کے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں نہ صرف کامیاب رہا ہے بلکہ ان کے دل و دماغ پر خمار آلود پر کیف نشہ بن کر مدتوں چھایا رہا۔

یہ ناول نثر میں دراصل ایک شاعری ہے، ایسی شاعری جس کا انداز بالکل نیا ہے اور اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ایسی پینٹنگ ہے جس کے سامنے کیوب ازم کا موجد پیکاسو اور براک کی پینٹنگ نظریں چراتی نظر آتی ہیں اور صنم کدوں کے تمام صنم اس نثری صنم سازی کے سامنے سر جھکائے باادب باملاحظہ نظر آتے ہیں۔ اپنی آرا اور باتوں کی دلیل کے طور پر ناول 'صنم خانوں میں' کے چند ایک اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس کو پڑھ کر آپ کی آنکھوں کے سامنے شاعری، مصوری اور صنم سازی کے ملے جلے تمام مناظر ہیئت و صورت سامنے آجائیں گے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''قلوپطرہ کے حسن کا نکہت زار، بحیرہ روم میں ڈولتا ہوا وہ زرتار جہاز، ارغوانی رنگ کا، باریک ریشمی، بادبان، اور سرزمین مصر کی وہ کنواریاں جن کے جسم پر ایک تار بھی نہیں، اس جہاز کو چلا رہی تھیں ملکہ مصر نہایت باریک فیروزی رنگ کی ریشمی چادر میں پھیلتے ہوئے جسم کو لپیٹے باصد ہزار رعنائی و پندارِ حسن جلوہ افروز تھیں۔ سیکڑوں حبشی غلاموں کا دستہ، جن کے کانوں میں بھیانک، لوہے کی بالیاں جھول رہی تھیں، خواجہ سراؤں کی جماعت، لمبی لمبی عبائیں پہنے امرائے مصر کی قطاریں، ان کے پیچھے کاہن اور نجومی، اور پھر پجاریوں کا گروہ، لیکن سب کچھ وقت کے سنہرے ریگستان میں کھو چکا ہے۔''

ایک آخری اقتباس:

''سقراط و سکندر کا وطن، دیار ہند کو فتح کرنے والے اسکندر اعظم کا تابوت چوبتر بیل گاڑیوں پر نکالا گیا اور مقدس پانی کے ظروف لیے ہوئے لوگوں کا ہجوم بلند دیواروں کے سائے تلے سے گزرتا ہوا، پتھریلے کوہستانی راستوں سے اُس مقام پر پہنچا جہاں نہر مقدس کے پانی سے اس کو غسل دیا گیا۔ شکستہ ہیکل عشتروت کی تاریکیاں چیخ رہی تھی ''اے دیوتاؤں کے دیوتا! اس پاکیزہ پانی کو قبول کر۔ ملک کے ویران کھیتوں کو ہرا ابھرا کردے۔ جہازوں کے لیے موافق ہوا چلا۔ تاجروں کے تھیلے لولو اور مرجان سے بھردے۔ ملک کو امن و سکون سے آشنا کر اور دشمنوں کو تباہ و برباد۔''

مجھ جیسا مبتدی اس عظیم ادیب کے کارناموں پر کیا خامہ فرسائی کا حق ادا کر سکے گا۔ آیئے اپنے وقت کے ایک منفرد اور ممتاز ناقد سید احتشام حسین کی گراں قدر رائے جو انھوں نے متذکرہ ناول (صنم خانوں میں) پہ دی تھی اسے پیش کرتے ہوئے اپنی بات یہیں پر ختم کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

''کلیم عرفی نے 'صنم خانوں میں' لکھ کر اردو پڑھنے والوں کو چونکا دیا ہے کیونکہ اس کے موضوع فن اور انداز بیان سب ہی میں انوکھا پن ہے۔ یہ ناول بہت دنوں تک نقادوں کے درمیان اختلاف اور بحث کا موضوع بنا رہے گا۔ میرے خیال میں کسی کتاب کا یہ حیثیت اختیار کر لینا اس کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ تلمیحات، علامات، اشارات اور محاکات کی کثرت جہاں لکھنے والے کے مطالعے اور مشاہدے کا پتہ دیتی ہے وہیں اس تصنیف کو خواص پسند بھی بناتی ہے کیونکہ بہت لوگ ان اشاروں سے واقف ہی نہ ہوں گے چہ جائکہ ناول میں ان کے اظہار کی اہمیت اور لطافت کو سمجھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا۔ یہ ناول Best seller تو کبھی نہیں بن سکے گا لیکن ناول نگاری کی تاریخ میں اسے ایک خاص جگہ ضرور دی جائے گی۔''

■

Anwar Afaqi
Hoda Manzil, Rajtoli, Bhigo, P.O. Lalbagh,
Darbhanga - 846004
Mob:9931016273

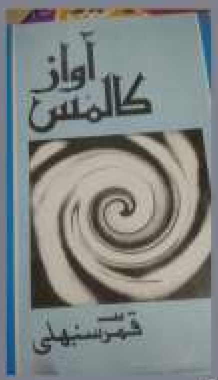

عاکف سنبھلی

علم و ادب کا تابندہ آفتاب

قمر سنبھلی

قمر صاحب کا اصل نام تو سلطان الدین تھا مگر دنیائے علم و ادب ان کو 'قمر سنبھلی' کے نام سے جانتی ہے۔ آپ سنبھل کے علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا اسمِ گرامی حمید الدین تھا جو حافظ، قاری اور عالمِ دین تھے۔ برادر محترم مولانا قاری برہان الدین سنبھلی بھی قاری اور عالمِ دین تھے جو ندوۃ العلما لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے خاندانی پس منظر کے طور پر مولانا امداد اللہ صابری کی کتاب 'فیضانِ رحمت' سے ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے۔

932ھ مطابق 1526 میں بابر بادشاہ کے ہمراہ آپ کے مورثِ اعلیٰ شیخ حسن رضا برعہدہ رسالدار سنبھل آئے موصوف عربی النسل صحیح النسب قریشی تھے۔ وہ سنبھل ہی میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں شاہی قلعہ (کوٹ) میں ان کی کئی نسلیں اعلیٰ عہدوں پر رہتے ہوئے مقیم رہیں۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد شیخ حسن رضا کی پانچویں پشت میں شیخ محمد بخش نے قدیم قلعے کی سکونت چھوڑ کر جدید قلعے میں رہائش اختیار کر لی۔ جس کے کھنڈرات اور شکستہ فصیلیں آج تک (محلّہ میاں سرائے میں) باقی ہیں۔ شیخ محمد بخش کے فرزند جن کا نام سراج الدین رکھا گیا۔ بعد میں یہ اپنے علم و فضل اور معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ملا سراج الدین مشہور ہوئے۔ ان کے فرزند مولوی سعید الدین 1860 میں پیدا ہوئے جو صاحب علم بزرگ ہوئے۔ یہی قمر سنبھلی کے دادا تھے''۔ (فیضانِ رحمت، ص 261)

قمر سنبھلی کے والد حضرت مولانا قاری محمد حمید الدین صاحب حافظِ قرآن، قاری، مستند طبیب اور دار العلوم کے فاضل یعنی متبحر عالمِ دین تھے۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران مدرسہ صولتیہ سے بھی قرأت و تجوید کی باقاعدہ تعلیم اور سندِ فراغت حاصل کی۔ اس سلسلے میں مصنف فیضانِ رحمت اس طرح رقمطراز ہیں:

''سلطان الدین قمر سنبھلی قاری حمید السین کے دوسرے اور سب سے چھوٹے فرزند ہیں انھوں نے بھی والد سے ہی حفظ قرآن کی دولت پائی اور تجوید و قرأت سیکھی۔ خداداد خوش الحانی کی وجہ سے قرآن مجید کی قرأت مؤثر اور جاذبِ قلب انداز میں کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔'' (فیضانِ رحمت، ص 289)

قمر سنبھلی کا بچپن تو سنبھل ہی میں گذرا۔ 1958 میں والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ کا دس سال قبل ہی انتقال ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بڑے بھائی قاری برہان الدین صاحب (جو ان دنوں مدرسہ عالیہ فتحپوری میں مدرس تھے) کے ساتھ 1960 میں دہلی چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ مدرسہ عالیہ میں تعلیم کے ساتھ گھڑی سازی کا ہنر بھی سیکھا۔ جسے آگے چل کر انھوں نے ذریعہ معاش بنایا۔ 1964 میں ان کی شادی ہوگئی۔ شریکِ حیات نیک صالح اور شوہر کی خدمت کرنے والی دیندار خاتون تھیں۔ ان سے آپ کی چار صاحبزادیاں ہوئیں۔ بڑی بیٹی چھ ماہ زندہ رہ کر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ تین بیٹیاں بقیدِ حیات رہیں جنھوں نے علم دین حاصل کیا اور مستند عالمات ہوئیں۔ ان میں سے دو نے قراءت کی سند بھی حاصل کی۔ قمر صاحب کی اہلیہ عارضۂ قلب میں مبتلا رہتی تھیں۔ جن کے انتقال کے بعد بچیوں نے اپنے تایا محترم یعنی حضرت مولانا قاری برہان الدین صاحب کی سرپرستی میں رہ کر پرورش و علم حاصل کیا۔

علمی و ادبی حیثیت سے آپ کا اہم مقام تھا۔ آپ شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ اس فن میں حضرت زاہر حیدری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ملک کے مقتدر و معتبر رسائل و جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا۔ متعدد شعری مجموعے بھی زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے۔ جن میں آواز کالمس، (مجموعہ غزلیات) روشن روشن حرف (حمد و نعت) پھول آنگن کے (بچوں کی نظمیں) جزیرے خواب کے (دیوناگری میں) قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی ایک نثری تصنیف 'میری نظر میں' قلم کاروں کے خاکوں پر مشتمل ہے جسے دہلی اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور اتر پردیش اردو اکادمی سے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آپ کی کچھ اور کتابیں ابھی مسودات کی شکل میں ہیں۔ ان میں قافلۂ رفتگاں (مرحوم قلمکاروں کا تذکرہ) میزان (تبصرے) ادبی کہکشاں (ادبی شخصیات دوم) مذاقِ نظر (متفرق مضامین) بساطِ حرف (شعری مجموعہ) طباعت و اشاعت کے منتظر ہیں۔ آپ متذکرہ بالا نثری و شعری تصانیف کے علاوہ چند ادبی رسائل سے بھی بحیثیت معاون و نگراں وابستہ رہے ہیں۔ جن میں 'رہنمائے تعلیم' دہلی، سہ ماہی 'ایوانِ ادب' دہلی، ماہنامہ 'گل کدہ' سہسوان، ماہنامہ 'باجی' دہلی اور ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم جدید' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ تین درجن سے زائد دیگر انتخابی مجموعوں، تذکروں، مختلف اکادمیوں کی مطبوعات اور تذکروں میں نیز کئی دیگر پی ایچ ڈی کے مقالات میں آپ کا ذکر اور نمونۂ کلام شامل ہے۔ گزشتہ تقریباً پچپن برسوں سے ہند و بیرونِ ہند کے ادبی رسائل و جرائد میں آپ کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی آپ کے کلام کی ترسیل کی جاتی رہی ہے۔ بحیثیت شاعر معروف سخنوروں میں آپ کا شمار تھا۔

آپ کو مختلف اعزازات و تمغات بھی حاصل ہو چکے ہیں۔ شعری مجموعے 'آواز کالمس' پر انجمن ترقی اردو دہلی کی جانب سے شال کا تحفہ عطا کیا گیا۔ 'ادبی سنگم' غازی آباد کی جانب سے 'مہدی نظمی ایوارڈ'۔ ماہنامہ 'روبی' دہلی کی جانب سے 'روبی ادبی ایوارڈ'، 1999 میں 'میکش اکبر آبادی ٹرافی اور سلور میڈل'، 2003 میں دہلی اردو اکادمی کی جانب سے 'پھول آنگن کے' کو ایوارڈ۔ 2003 میں ہی اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے 'روشن روشن حرف' پر ایوارڈ، 2008 میں نعتیہ شاعری پر 'حضرت حسان ایوارڈ'، 2011 میں اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے آپ کی کتاب 'میری نظر میں' کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی سال آپ کو دہلی اردو اکادمی کی جانب سے آپ کی مجموعی شعری خدمات پر 50 ہزار روپے کا نقد انعام دیا گیا۔ 2013 میں بہار اردو اکادمی کی

جانب سے 'غلام سرور ایوارڈ' سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

قمر صاحب بحیثیت شاعر ملک کے اہم و نمایاں شعرا میں اپنا ایک خاص و منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے شعری مجموعے اور ان پر ملے ایوارڈ اس بات کا پختہ ثبوت ہیں۔ آپ کے کلام بلاغت نظام کے معیار و مرتبے کے اکثر صاحبانِ کلام و فن سچے دل سے معترف رہے ہیں۔ ملک کے متعدد دانشوروں اور صاحبانِ نقد و نظر کی جانب سے شعری صلاحیتوں اور علم و ادب کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ ان میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر حفیظ بنارسی، رفعت سروش، پروفیسر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے کلام سے چند نمونے قارئین کے لیے پیش ہیں۔

نظر کا حسن بھی حسنِ خیال بھی اس کا
مرے ہنر میں ہے سارا کمال بھی اس کا
مرے قلم کی سیاہی بھی نور ہے اس کا
ہر اک سخن میں ہے میرے جمال بھی اس کا
صدا اس کی سنوں دل کی دھڑکنوں میں بھی
لرزتے ہونٹوں پہ حرفِ سوال بھی اس کا

اسی طرح نعتِ رسولِ مقبول بھی ہے۔ وہ اگرچہ ہے تو بڑی معزز صنفِ سخن مگراتنی ہی احتیاط کی متقاضی بھی ہے کہ معمولی سی بے احتیاطی اور عدم توجہی سے گناہ سرزد ہوجانے کا امکان رہتا ہے۔ آپ نے اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں اور غیر شرعی مبالغات سے اجتناب کرتے ہوئے سیرتِ پاک کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں ملاحظہ کیجیے اس سلسلے میں یہ چند اشعار۔

کون ہے یہ دو دو پیٹ سے پتھر باندھے ہوئے؟
رہ کے خود فاقوں سے اوروں کو کھلا دیتا ہے کون
کس کو اپنے واسطے بوسیدہ کملی ہے پسند
سر برہنہ اپنی امت کو ردا دیتا ہے کون

غزل جو اردو شاعری کی مقبول صنف ہے اس میں بھی آپ نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ راقم الحروف قارئین کے ذوقِ مطالعہ کے پیشِ نظر چند اشعار حاضر کررہا ہے۔

ہر ایک ستم سے لڑے حوصلہ ہمارا تھا
جلا کے ہم نے چراغ آندھیوں میں رکھا تھا
قمر مجھے کبھی زنجیر کر نہ پایا کوئی
سفر مدام سفر میرے نام لکھا تھا

آپ کی ایک اور غزل کے کچھ اہم اشعار اور دیکھیے۔

مشکل یہ ہے کہ جرأت انکار بھی نہیں
کوشش بقدرِ ہمتِ اظہار بھی نہیں

رکھوں نظر میں کس کا سراپا کہ اب یہاں
مخلص بھی کوئی آئینۂ کردار بھی نہیں

اپنی ایک غزل میں وہ انسان کی جہدِ مسلسل اور ہمتِ مرداں کا ذکر کچھ اس طرح سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تلووں میں چبھے جاتے ہیں احساس کے کانٹے
تم ساتھ نہیں ہو تو سفر کاٹ رہا ہے
الفاظ کی تاثیر، کہ جادو ہے زباں کا؟
لہجے سے وہ پتھر کا جگر کاٹ رہا ہے

قمر صاحب نے غزلوں کے ساتھ ہی عمدہ رباعیات بھی لکھی ہیں۔ جو بڑی ہی دلکش و دلنشیں ہونے کے ساتھ ہی پرکیف و پرمعنی بھی ہیں۔ آپ اپنی ایک رباعی میں انسان کو ایثار و خلوص کا احساس اس طرح کراتے ہیں۔

اخلاص و وفا، لعل و گہر میں تولو
احباب کو میزانِ بشر میں تولو
ایثار بھی دنیا میں قمر ہے کوئی چیز
ہر شئے کو نہ تم نفع و ضرر میں تولو

ماہیا ایک پنجابی صنفِ سخن ہے۔ 'ماہیا' کا اپنا مخصوص فنی نظام ہے۔ اسے برقرار رکھتے ہوئے 'غزل' کہنا ایک نازک فن ہے اور اس میں مہارت کے لیے زبردست محنت اور بڑی ہی مشق کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ قمر صاحب نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی اور اپنی کامیابی کا لوہا منوایا۔ اس سلسلے میں آپ کے کلام سے یہ نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

شوخی ہے شرارت ہے، لب پہ تبسم سا، انفاس میں جدت ہے
نفرت کبھی الفت ہے، اُس کی اداؤں سے، شرمندہ قیامت ہے
گھر میرا نہ در میرا، کم نہیں کچھ یہ بھی، باقی تو ہے سر میرا
دستار سلامت ہے، اس کا کرم ہے یہ، کردار سلامت ہے
کچھ فکر و نظر کا بھی، پاس قمر رکھا، تقدیس ہنر کا بھی
کیا خوب یہ جدت ہے، ماہیا غزلوں میں، فن کی بھی لطافت ہے

سطور بالا میں قمر سنبھلی کے کلام سے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ان سے موصوف کی قادر الکلامی کے ساتھ ہی فن کے تنوع اور ادبی جہات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قمر صاحب اگرچہ بنیادی اعتبار سے تو شاعر ہیں مگر آپ نے نثر میں بھی زور آزمائی کی اور اس میدان میں بھی اپنی صلاحیت کا سکہ جمایا ہے۔ آپ ایک تذکرہ نویس اور خاکہ نگار کی حیثیت سے اپنی کتاب ''میری نظر میں'' میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں اور موضوع کا حق پوری طرح ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں آپ نے مشاہیر اردو ادب کا جس منصفانہ اور غیر جانب دارانہ تذکرہ و تعارف پیش کیا ہے اس سے آپ کے ایک بہترین تذکرہ نویس اور مبصر فن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ آپ اپنی کتاب میں جناب حفیظ میرٹھی صاحب کا تعارف اس طرح پیش کرتے ہیں:

''مرحوم حفیظ میرٹھی کی شخصیت بحیثیت مسلمان، بحیثیت انسان اور بحیثیت شاعر کئی پہلو سے قابلِ ذکر ہے۔

جس پہلو سے بھی دیکھیں وہ ممتاز نظر آئیں گے.....

حفیظ مرحوم ایک راسخ العقیدہ اور قلندرانہ شان والے مسلمان تھے۔ سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل دردمند رکھتے تھے اور صحیح معنوں میں تمام مخلوق کو 'اللہ کا کنبہ' سمجھتے تھے۔''

(میری نظر میں، ص15)

مندرجہ بالا اقتباس قمر صاحب کی شخصیت نگاری کی کامیاب عکاسی کا مظہر ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کسی بھی شخصیت کو کتنے مؤثر و دلنواز طریقے پر قارئین سے متعارف کرانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ آیئے دیکھیں کہ فن کار کے فن کو ظاہر کرنے میں آپ کا قلم گوہر بار کس طرح موتیوں کی بارش کرتا ہے۔ معروف اردو قلم کار سید نسیم اختر شاہ قیصر صاحب کے فن پر اظہار کرتے ہوئے آپ اس طرح رقم طراز ہیں:

''جناب نسیم اختر شاہ قیصر کے یہاں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ وہ علمی، ادبی، شخصی، سماجی، ثقافتی کئی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ مگر دل نشیں ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ اس کا حق ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ شخصیات پر انہوں نے بڑے مفید مضامین تحریر کیے ہیں۔ ان کی خاکہ نگاری کے بہت سے صاحبانِ قلم معترف ہیں۔'' (میری نظر میں، ص226)

قیصر صاحب کے عمدہ خاکہ نگار ہونے کے ساتھ ہی ہم تو قمر صاحب کے بھی کامیاب خاکہ نگار ہونے کے دل سے معترف ہیں۔ جس کا ثبوت آپ کی کتاب ''میری نظر میں'' ہے۔ صاحبانِ ذوق مذکورہ کتاب سے ہمارے دعوے کی دلیل حاصل کرسکتے ہیں۔

آپ کے سوانح پر نظر ڈالنے پر یہ بھی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آپ ابتدائی عمر سے ہی اپنے مادرِ وطن سنبھل سے دہلی چلے گئے۔ پھر وہاں سے لکھنو منتقل ہوگئے تھے جہاں رہ کر آپ نے علم و ادب کی شمع فروزاں کیں اور تاحیات شعر و سخن کے پھول مہکاتے رہے۔ اس طرح اردو ادب کی خدمات انجام دیتے ہوئے بالآخر شعر و ادب کا یہ آفتاب 14 اگست 2021 کو ڈوب گیا اور اپنے پسماندگان کو سوگوار چھوڑ گیا۔ نماز جنازہ ندوۃ العلما کے مہتمم ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی نے پڑھائی اور تدفین ڈالی گنج کے قبرستان میں ہوئے۔

■

Razaur Rahman Akif Sambhali
Miyan Sarai, Katra Bazar
Sambhal - 244302 (UP)
Mob.:9837826809

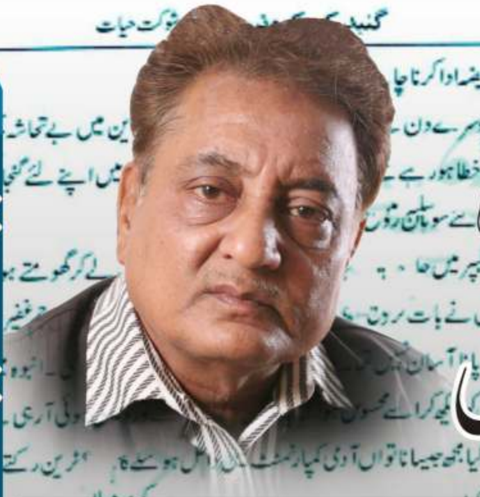

شوکت حیات

افسانہ ’کوبڑ‘ کی روشنی میں

رضیہ پروین

شوکت حیات کی افسانوی کائنات وسیع وعریض ہے۔ وہ منفرد راستہ تلاش کرنے والوں میں سے تھے۔ انھیں نہ روایت کی فکر تھی اور نہ ہی بھیڑ میں چلنے والے لوگوں کی۔ انھوں نے جس راستے کو بھی اختیار کیا وہ انھیں کے نام سے مقبول ہوا۔ آپ نے کئی لازوال افسانے تخلیق کیے جن میں بکسوں سے دبا آدمی، گھونسلا، گنبد کے کبوتر، سرخ اپارٹمنٹ، رانی باغ، پاؤں، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، چیخیں، بلی کا بچہ، گھڑیال اور فرشتے وغیرہ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

شوکت حیات کا شمار مشہور افسانہ نگاروں میں تو ہوتا رہا، ان کے افسانوں کے چرچے بھی خوب ہوئے مگر کئی سالوں بعد ایک ہی مجموعہ ’گنبد کے کبوتر‘ منظر عام پر آیا۔ جس قدر انھوں نے افسانے لکھے وہ چاہتے تو کئی مجموعے منظر عام پر آسکتے تھے مگر ایسا نہ ہوسکا۔ وارث علوی شوکت حیات کے افسانوی مجموعہ ’گنبد کے کبوتر‘ میں لکھتے ہیں:

’’شوکت حیات ان جیالے لوگوں میں سے ہیں جو نہ تو کسی نقاد کی توجہ کی پروا کرتے ہیں نہ دوسروں کی بخشی ہوئی بیساکھیوں پر راہِ ادب طے کرتے ہیں۔ وہ اپنا راستہ خود بناتے ہیں اور اپنے اظہار وبیان کے طریقے آپ ہی ایجاد کرتے ہیں۔‘‘ (گنبد کے کبوتر، شوکت حیات کی افسانہ نگاری، ص11)

شوکت حیات کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے افسانے منفرد اور نرالے ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کے افسانے مختصر مگر معنی ومفاہیم کا ایک وسیع سمندر موجود رہتا ہے، کردار، پلاٹ اور مکالمے میں اس قدر ربط وتسلسل ہوتا ہے کہ قاری پوری طرح کہانی میں ڈوبتا ہے۔ کہانی کا پورا منظر وپس منظر نگاہوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر:

’’یہ ہنر اسے معلوم تھا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات سنگین حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیا میں تبدیل کردینا پڑتا تھا۔‘‘ (کوبڑ)

اس مختصر سے اقتباس سے ہی کہانی کی فضا اور ماحول سے آشنائی ہونے لگتی ہے۔ جزئیات نگاری ان کے افسانوں میں خاص وصف رکھتی ہے۔ اس طرح ان کی انفرادیت کو واضح کرتی ہے۔ معاشرے میں ہورہی تبدیلیاں، تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے جرائم، اخلاقی گراوٹ، معاشی بدحالی، رشتوں کی پامالی، نظریاتی تفریق، کشمکش جذبات، بے چینی، فکرمندی ان سب کو اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر نئی شناخت کے ساتھ نئے پیرائے، نئے انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے شوکت حیات خوب واقف ہیں۔ نظام صدیقی ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’شوکت حیات جدید تر نسل میں سب سے زیادہ منفرد، تیز گام اور تجربہ پسند افسانہ نگار ہیں۔‘‘

شوکت حیات ’میری تھیوری سازی اور میرے افسانے‘ میں خود رقم طراز ہیں:

’’میرے افسانے اس تناظر میں دیکھے جائیں کہ یہ وہ نئے جدید اور مابعد جدید افسانے جو دراصل نامیاتی اور امکانی ہیں اور انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ ان افسانوں میں آج کے عہد اور آج کے انسان، اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ، لہجے، تکنیک، ٹریٹ منٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (گنبد کے کبوتر ص37)

شوکت حیات نے افسانوں میں انسانی زندگی کی ناہمواریوں، رشتوں کی تلخی، ناآسودہ جذبات اور ستم ظریفیوں کو پیش کرکے حقیقت کا آئینہ دار بنادیا۔ کچھ افسانے تو انسانی رشتوں کی بے اعتنائی کی ایسی دردناک تصویر پیش کرتے ہیں کہ دل کراہ اٹھتا ہے۔ ’کوبڑ‘ کہانی اسی طرح کی جذباتی اور آئینہ دکھاتی ہوئی ہمارے معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔

شوکت حیات کو زبان وبیان اور اسلوب نگارش پر عبور حاصل ہے۔ ان کے تمام افسانوں میں زبان وبیان کی خوبیاں جگ ظاہر ہیں۔ انھوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ نہ صرف مستحسن ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ وہ جذباتی پینترا استعمال کرکے قاری کو گمراہ کرنے کی قطعی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ جذباتیت سے حد درجہ گریز کرتے ہیں۔ ان کی اس خوبی کو مہدی جعفر نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

’’شوکت حیات کے یہاں جذباتیت کم ہے۔ جہاں کہیں جذباتیت معلوم ہوتی ہے دراصل وہ تخلیقی تندی کی ایک صورت ہے۔ حالانکہ اسی راہ میں جذباتیت کے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔‘‘ (گنبد کے کبوتر، ص19)

گنبد کے کبوتر میں شوکت حیات کے تین اہم ہم عصر وارث علوی، مہدی جعفر، ڈاکٹر ابرار رحمانی کے مضامین شامل ہیں، جو شوکت حیات کی زندگی اور ان کے طرز نگارش پر روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

’گنبد کے کبوتر‘ پچیس کہانیوں پر مشتمل افسانوں کا مجموعہ ہے۔ کوبڑ، گھونسلا، میت، گنبد کے کبوتر، اپنا گوشت، رانی باغ، مادھو، مرشد، سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ، پاؤں، ڈھلان پر رکے ہوئے قدم، بھائی، مسٹر گلیڈ، تفتیش، سرخ اپارٹمنٹ، بانگ، شکنجہ، فرشتے، بلی کا بچہ، گھڑیال، رحمت صاحب، کوا، چیخیں، سکوت، کہ۔‘

شوکت حیات کی کہانیوں میں زندگی کی تمام تر رمق اور امنگ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کہانیوں کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اگرچہ انھوں نے تحریکی رجحان سے انحراف کیا ہے لیکن سماج کے درپیش مسائل اور زمانے کے تقاضے کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں بجا طور پر سماجی مسائل، عروج و زوال، اخلاقی پستی، مشینی زندگی کی بھاگ دوڑ کا سامنا ہوتا ہے۔ ان کی ہر کہانی اپنے اندر الگ الگ مزاج اور احساس رکھتی ہے۔ کوئی کہانی کردار کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے تو کوئی واقعات وحادثات کے اعتبار سے شاہکار ہے۔ کوئی احساس کی ترجمان ہے تو کوئی عظمت رفتہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شوکت حیات کے تمام افسانے قاری کو ایک نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں۔

شوکت حیات کے افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ’کوبڑ‘ ہے۔ یہ افسانہ دو سگے بھائیوں کی کہانی ہے۔ چھوٹا بھائی امریکہ میں خوشحال زندگی گزار رہا ہے اور بڑا بھائی اپنی ذمے داری کے بوجھ تلے ایثار وقربانی اور اقتصادی تنگی کا استعارہ ہے۔ لاچار وبے بس شخص کی زندگی کی علامت ہے جس نے اپنی پوری زندگی ذمے داریوں کی

ادائیگی میں خرچ کردی لیکن اسے اپنے ہونے نہ ہونے کا کوئی احساس نہیں ہوا۔ حالات کے ساتھ چلنے کا کوئی ہنر نہ آیا اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کی ضرورتوں کا احساس ہوا اور نہ ہی نئے زمانے کے نئے تقاضے کا۔ وہ بس چلتا رہا، اپنی ذمے داریوں کے ساتھ۔ یہی وجہ کہ کہانی کے مرکزی کردار واحد غائب بہن کی شادی کے دن شدید تکان اور دوراتوں سے مستقل جاگنے کے بعد بھی اپنے بھائی کو چھوڑنے کے لیے دہلی کے ہوائی اڈے پر پہنچتا ہے۔

افسانہ کا مرکزی کردار (جس کو شوکت حیات نے کوئی نام دیے بنا ہی پیش کیا ہے۔) کی زندگی کی کشمکش، جد و جہد، اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی کے تعلق سے کس قدر صابر و شاکر ہے۔ افسانے کے ایک اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''شادی بیاہ کے ہنگاموں کی وجہ سے وہ دو روز سے مستقل جاگا ہوا تھا۔ آج شاید کچھ سکون سے سونے کا موقع ملتا۔ حالانکہ صبح سویرے اٹھ کر بھائی کو ہوائی اڈے تک الوداع کہنے کے لیے جانا تھا اور یہی نہیں، گھر کے سارے افراد کو وہاں تک پہنچانے کا اہتمام کرنا تھا۔ طرہ یہ کہ گاڑیوں کی ہڑتال تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کس طرح یہ سب بحسن وخوبی انجام دے گا کہ اماں نے حکم صادر کردیا کہ اسے ابھی شام والی گاڑی پکڑ لینی ہے تاکہ صبح گیارہ بجے تک دہلی پہنچ جائے۔ اس کا بھائی صبح کی فلائٹ سے دہلی کے لیے روانہ ہوگا اور ساڑھے دس گیارہ تک پہنچ جائے گا۔ وہاں وہ بھائی سے ہوائی اڈے پر ملے گا۔ اسے رات کے ڈھائی بجے نیویارک والی فلائٹ میں سوار کرادے گا۔'' (گنبد کے کبوتر، افسانہ کوبڑ، ص 39)

افسانے کا مرکزی کردار محنت کش، ذمے دار اور با مروت ہے۔ شادی کے ہنگاموں میں اسے سونے تک کی مہلت نہیں ملتی ہے۔ گھر کے تمام افراد کو ائیر پورٹ پہنچانے کا اہتمام کرنا ہے۔ لیکن اماں کے اچانک دلی جانے کے حکم پر بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچنا پڑتا ہے، ورنہ ذرا سی تاخیر سے ٹرین چھوٹ جاتی۔ وہ جسمانی طور پر کمزور ہے یہاں تک کہ حالات سے لڑنے کی طاقت بھی اس میں نہیں ہے۔ ٹرین میں بے تحاشہ بھیڑ کے سبب جگہ ملنا بھی مشکل ہے مگر بھائی ہونے کے ناطے وہ تمام پریشانیوں کو نظر انداز کرکے ٹرین میں داخل ہوہی جاتا ہے۔ اور سخت دشوار کن سفر کے لیے تیار ہونے کے بعد خود سے کہتا ہے:

''..... کیا مجھ جیسا ناتواں آدمی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوسکے گا.....!؟'' ٹرین رکتے ہی اس نے خود سے سوال کیا۔

''کوئی جواب دیے بغیر امنڈتی ہوئی بھیڑ کے درمیان اس نے خود کو کٹھری میں تبدیل کرلیا۔ یہ ہنر اسے معلوم ہوا کہ بچپن سے اب تک اکثر اوقات سنگین حالات کے سامنے گھٹنے ٹیکتے ہوئے اسے خود کو بے جان اشیاء میں تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ ورنہ اس کے جیسے آدمی کے لیے جینا آسان نہ تھا۔ اس کے کمزور جسم میں مزاحمت کرنے، حالات پر قابو پانے اور رخ موڑ دینے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں جیسے تیسے داخل ہونے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ اس کی ہتھیلی سے خون بہنے لگا ہے۔ خون کا بہنا اس کے نزدیک کوئی اہم بات نہ تھی۔''

ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ناتواں شخص جو حالات سے لڑ نہیں سکتا باوجود اس کے وہ ہر ممکن کوشش کرکے بے رحم زندگی کا بوجھ اپنے پیٹھ پر اٹھائے رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھتا ہے۔ اس تقدس کو برقرار رکھنے کے لیے زخمی ہتھیلی کا درد اور خون کے قطرے کو نظر انداز کرنا کہانی میں احساس محبت اور اثر انگیزی کو شدید کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کہانی رشتوں کی خود غرضی اور ایثار و ہمدردی کو بھی واضح کرتی ہے۔ افسانہ 'کوبڑ' معمولی واقعات پر مبنی عام اور سیدھے سادے مکالمات کے ذریعے معاشرے پر گہرا طنز اور سیدھا وار کرتا نظر آتا ہے۔ جس سے کرداروں کی شخصیت اجاگر ہوتی ہے اور قاری کو 'کوبڑ' سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

حالات کی دکھاکی نے اس کو کوبڑ بنا دیا ہے لیکن اسے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ بغیر شکوہ کیے دہلی پہنچتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ دہلی جو خود کئی بار لٹی، اس نے ایک غریب و بے بس کو بھی لوٹ لیا۔ جیسے تیسے وہ پالم ایئر پورٹ پر پہنچتا ہے دیکھتا ہے کہ جیب بھی کٹ چکی ہے ہاتھ میں بچی گھڑی بھی آٹو والا لے کر فرار ہوجاتا ہے۔ محبت کا مارا وہ اپنے چھوٹے بھائی سے ایک لفظ تک نہیں کہتا، یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتاتا ہے کہ اس کے پاس گھر واپسی کے لیے پیسہ نہیں بچا ہے۔

دونوں بھائیوں کے درمیان ایئر پورٹ کی گفتگو بھی غور طلب ہے، وہ دبے لفظوں میں اپنی کم مائیگی پر حسرت کناں ہوتا ہے۔

چھوٹا بھائی سنجیدگی سے بڑے بھائی سے کہتا ہے:

''بھیا آپ تو اب نہ معلوم شادی کریں گے یا نہیں...... لیکن آپ کے انتظار میں میں اب بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ صرف شادی ہی تو نہیں...... اولاد اپنی زندگی میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے یہ بھی تو دیکھنا ہے۔''

''آپ رہ گئے بھیا......!'' کے جواب وہ دبے لفظوں میں کچھ اس طرح دیتا ہے کہ: ''ہاں...... میں رہ گیا...... کہیں چھوٹ گیا میں...... جانے کہاں...... اندھیرے میں ایک ٹرین گم ہوتی جارہی ہے...... میں کنارے گرا ہوا اٹھنے کی ناکام کوشش کررہا ہوں...... میرے چاروں طرف کتے بھیانک آواز میں رو رہے ہیں...... روتے ہوئے کتے رونے کا فعل چھوڑ کر میری طرف دیکھ کر بھونکنے لگے ہیں......'' (افسانہ کوبڑ، ص 49)

فلائٹ پر سوار ہونے سے قبل دونوں بھائیوں کے گلے ملتے وقت یکایک چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کے کوبڑ کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ اچانک چونک پڑتا ہے۔ ''بھیا...... تمھاری پیٹھ پر یہ کیسا ابھار ہے...... میں...... وہ خبیث کے سر جیسا......!''

''بھیا!...... یہ کیسا آسیب سوار ہے تم پر...... تم نے آج تک نہیں بتایا......!''

یہ تحریریں ہمیں اندر تک جھنجھوڑتی ہیں۔ کیا ہم اس قدر مطلب پرست اور خود غرض ہوگئے ہیں کہ جہاں حقیقی رشتوں کو بھی ذاتی مفاد کے لیے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ شوکت حیات نے نہایت سادگی اور سمجھداری سے یہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ ہم اپنا محاسبہ خود کریں۔ کیونکہ اس طرح کے کردار اب آج کل عام طور پر نظر آتے ہیں جو رشتوں کو شکست اور پامال کرتے ہیں۔

'کوبڑ' افسانے میں شوکت حیات نے نہایت درد مندی اور فنکارانہ طور پر کرداروں کی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر قاری کے سامنے بحسن وخوبی پیش کیا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شوکت حیات کی اسی فکری وفنی بصیرت کے پیش نظر شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''دوسری باتوں کے علاوہ ان کے یہاں جو خاص بات مجھے نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان کی کہانیاں صرف سماجی شعور کا ہی پتہ نہیں دیتیں بلکہ ان کے یہاں سماجی ضمیر کو پوری طرح گہرائی کے ساتھ گرفت میں لینے کا رجحان بھی ملتا ہے۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ افسانہ کوبڑ ایک لازوال اور بے مثال افسانہ ہے جس کو شوکت حیات نے نہایت چابکدستی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اور نئے افسانہ نگاروں کے لیے بھی راستہ ہموار کیا ہے۔ کوبڑ کی شکل میں دنیا کا اصلی چہرہ عوام کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ روایت سے گریز کرتے ہوئے اپنا ایک الگ راستہ نکالا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ کوبڑ افسانہ بھی اپنے رنگ میں ایک خاموش احتجاج، زخم خوردگی سے لبریز، ضمیر اور روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا خاموش پیغام چھپائے ہوئے ہے۔

■

Razia Parveen
Head, Dept of Urdu
Govt Girls P G College
Rampur - 244901 (UP)

شبیر احمد لون

دیارِ دکن کا پروقار قلم کار

پروفیسر بیگ احساس

پروفیسر بیگ احساس کا اصل نام محمد بیگ اور قلمی نام بیگ احساس ہے۔ ان کی پیدائش 10 اگست 1948 کو حیدر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خواجہ حسن بیگ ہے۔ بیگ احساس انتہائی شریف النفس اور دھیمے لہجے کے آدمی تھے۔ ان کے سینے میں ایک درد مند دل دھڑکتا تھا اور ہمیشہ امن و آشتی کے خواہاں تھے۔ گفتار دھیمی، پر نہایت خوش کرنے والی، ان کی ادا میں خوشی جیسے سمائی تھی۔

بیگ احساس نے اعلیٰ تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ بی اے سال 1975 میں اور ایم اے سال 1979 میں مکمل کیا۔ اس کے بعد 1985 میں یونیورسٹی آف حیدر آباد سے 'کرشن چندر فن اور شخصیت' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سال 1984 میں بیگ احساس نے عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر کام کرنا شروع کیا اور سال 2000 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد 2000 سے لے کر 2006 تک صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے کام کیا۔ 2007 میں حیدر آباد سینٹرل یونیورسٹی سے جُڑ گئے اور 2013 تک یہاں پہلے پروفیسر اور پھر صدر شعبہ اردو کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ بیگ احساس حیدر آباد لٹریری فورم کے مشترکہ امور کے جنرل سکریٹری اور صدر رہے اور 1988 میں ساوتھ انڈیا اردو اکیڈمی کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ بیگ احساس مختلف اداروں اور انجمنوں کے رکن بھی رہے، جن میں ساہتیہ اکادمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو رائٹرز اینڈ جرنلسٹس ویلفیئر فنڈ، آندھرا پردیش اردو اکیڈمی وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس مشہور ادبی رسالہ 'سب رس' کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ 2013 سے اب تک رسالہ 'سب رس' کے ساتھ جڑے رہے۔ اس کے علاوہ بطور صحافی اقبال اکیڈمی، حیدر آباد کی جانب سے نکلنے والا رسالہ 'اقبال ریویو' کے چند خصوصی شمارہ جات کی ادارت بھی کی۔

پروفیسر بیگ احساس کی ادبی خدمات کے تئیں ہندوستان میں انھیں مختلف انعامات سے نوازا گیا۔ سال 2016 میں تلنگانہ اردو اکیڈمی کی جانب سے پروفیسر بیگ احساس کو مخدوم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی سال افسانوی مجموعہ 'دخمہ' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا جو انھیں سال 2017 میں ملا۔ عصرِ حاضر کے یہ بہترین قلم کار تقریباً پندرہ روز تک ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد 8 ستمبر 2021 کو 11 بجے دماغ پر فالج کی وجہ سے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی تدفین نمازِ عشا کے بعد پیرا ماؤنٹ ہلس قبرستان، ٹولی چوکی میں ہوئی۔

پروفیسر بیگ احساس بیک وقت افسانہ نگار، صحافی، محقق، نقاد، ادیب، استاد اور مقرر تھے۔ آپ کی ادبی زندگی لگ بھگ پچاس سالوں پر محیط ہے۔ ان پچاس سالوں میں بیگ احساس نے تین افسانوی مجموعے خوشہ گندم (1979)، حنظل (1993)، دخمہ (2015)، ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب 'کرشن چندر شخصیت اور فن' (1999)، تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'شور جہاں' (2005)، شاذ تمکنت پر ایک مونوگراف (2010) اور ڈاکٹر ایم کے کول کے ساتھ مل کر (دکنی فرہنگ، 2012) بھی تدوین کی۔ اس کے علاوہ 'ہزار مشعل بکف ستارے' (انتخاب کلام علی ظہیر، 2005)، تعلیم بالغان سے متعلق (مرزا غالب اور بوجھ کیوں بنوں، 2004) ترتیب دیے ہیں۔ بیگ احساس ایک بہترین صحافی بھی تھے۔ مشہور رسالہ 'سب رس' کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے مختلف شماروں کے اداریے لکھ کر اردو زبان و ادب کی آبیاری کی لیکن بنیادی طور پر بیگ احساس افسانہ نگار ہیں اور اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی افسانہ نگاری سے 1971 میں افسانہ 'سراب' سے کیا جو

ماہنامہ 'بانو'، دہلی میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ 'حنظل' کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی پہلی کہانی 1971 میں لکھی اور کہانی کا بیج کہاں سے اُڑ کر میرے وجود میں آپڑا کب اس نے آنکھیں کھولیں، کب اس نے نمو حاصل کی میں نہیں جانتا۔ سوتے جاگتے ہر پل یہ کہانی میرے ساتھ رہنے لگی۔ ایک تشنج ایک اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ پھر میرے قلم سے کہانی نکلی۔ یہ کہانی 'افسانے' کی شکل میں تھی۔''

(حنظل: بیگ احساس، مکتبہ شعر وحکمت، حیدرآباد، 1993، ص 9)

ان کے افسانوں میں عصر حاضر کے درد وکرب اور پیچیدہ مسائل کا نہایت حقیقت پسندانہ اظہار ملتا ہے۔ جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کا سفر کرنے والا یہ عظیم فکشن نگار عصری تقاضوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہے بلکہ انسانی نفسیات کا نبض شناس بھی ہے۔ بیگ احساس کے افسانوں کا موضوع کچھ بھی ہو لیکن جملے بہت مختصر اور سلیس پیش کرتے ہیں۔ ان کے پیرایہ اظہار میں برجستگی، سادگی اور تازگی ہے۔ بیگ احساس نے خارجی اور داخلی زندگی کی ہم آہنگی کو اپنے افسانوں کا وصفِ خاص بنایا۔ بقول اقبال متین:

''بیگ احساس ایک سچے فن کار کی طرح اردو فکشن کے ایوان میں خاموشی سے داخل ہوئے۔ نہ سہارا دینے کے لیے کسی گروپ کی ادبی لاٹھی ساتھ تھی نہ کسی پیشہ ور نقاد نما خطوط نویس کا دوشِ دست گیر۔ نہ کبھی انھوں نے اس کی ضرورت محسوس کی اس لیے کہ انھیں اپنی تحریروں پر اعتماد تھا اور ہے۔ اوپر سے کہانیوں پر کسی فیشن کا نقاب اُڑھانے کی بجائے انھوں نے خارجی زندگی اور داخلی محسوسات کے آہنگ کو اہمیت دی۔''

(خوشہ گندم: بیگ احساس، انجمن معمار ادب، حیدرآباد 1979، ص 11)

بیگ احساس کا پہلا افسانوی مجموعہ 'خوشہ گندم' نومبر 1979 میں پہلی بار انجمن معمار ادب، حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل بارہ افسانے ہیں، جو اس طرح ہیں: خوشہ گندم، خوابوں کا صحرا، تنکا اور طوفان، سنگ اُٹھایا تھا کہ ٹوٹتے لمحوں کا کرب، آگہی کے اندھیرے، اندھیری دھوپ، ریت کا سمندر، گندی، سوئی ہوئی آگ، تیرگی کا سفر، سلگتی برف۔ بیگ احساس کے یہ سارے افسانے نہایت خوبصورت ہیں اور ان میں حیدرآبادی تہذیب کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانے اگرچہ 'حنظل' اور 'دخمہ' کے معیار کے برابر نہیں ہیں کیونکہ یہ ستر کی دہائی میں لکھے گئے افسانے ہیں اور اس وقت کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی مسائل کچھ مختلف تھے اور فنی اعتبار سے اتنی پختگی بھی بیگ احساس کے ہاں موجود نہ تھی۔ دوسری جانب جدیدیت اپنی انتہا پر پہنچ چکی تھی اور مابعد جدید اثرات نے اپنا جلوہ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی مجموعہ 'خوشہ گندم' میں کچھ تکنیکی خرابیاں نظر آتی ہیں۔ پھر بھی بیگ احساس کے افسانے ایک نیا چہرہ پیش کرتے ہیں۔ دراصل بیگ احساس کو افسانہ لکھنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور افسانہ بننے کا گر بھی جانتے ہیں۔

بیگ احساس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'حنظل' ہے۔ یہ مجموعہ دسمبر 1993 میں مکتبہ شعر وحکمت، حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں اور ابتدائیہ کے طور پر 'کہانی اور میں' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔ 'حنظل' میں شامل افسانوں کی ترتیب اس طرح ہے۔ پناہ گاہ کی تلاش، میوزیکل چیئر، کرفیو، اجنبی اجنبی، ملبہ، سوا نیزے پہ سورج، بے سورج آسمان، نیا شہسوار، خس آتش سوار، حنظل، برزخ، آسماں بھی تماشائی۔

مجموعہ 'حنظل' کا عنوان ہی اتنا پرکشش ہے کہ اس کو پڑھنے کی چاہ پیدا ہو جاتی ہے۔ 'حنظل' اور 'دخمہ' کے عنوانات ایسے ہیں جو اس قدر مبہم ہیں کہ قاری کو لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ معروف ادیب مجتبیٰ حسین اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''جتنی محنت وہ خود افسانہ لکھنے میں کرتے ہیں اتنی ہی محنت وہ اپنا افسانہ پڑھنے والے قاری سے بھی کراتے ہیں کم از کم مجھ جیسے کم علم سے تو وہ محنت ضرور کراتے ہیں۔ جب سے میری عمر اسی برس کے قریب تک پہنچنے کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں، میں نے اپنی ساری ڈکشنریوں کو اٹھا کر الماری کے سب سے اوپر والے شیلف میں رکھوا دیا ہے، بھلا اب اس عمر میں کسی لفظ کے معنی جان کر میں کیا کروں گا، اور معنی سمجھ میں آبھی گئے تو ان پر عمل پیرا کیونکر ہو سکوں گا۔ تاہم بیگ احساس نے کم از کم دو مرتبہ مجھ جیسے ضعیف آدمی کو مجبور کیا کہ میں سیڑھی لگا کر جیسے تیسے ان ڈکشنریوں کو نیچے اتاروں اصل قصہ یہ ہے کہ ان کے افسانہ کا عنوان تھا 'حنظل'۔ اب میں پریشان کہ یہ حنظل کیا بلا ہے۔ تلاش بسیار کے بعد پتہ چلا کہ حنظل کڑوے پھل کو کہتے ہے، بتایئے میں تو صبر کے پھل کے انتظار میں ہوں اور بیگ احساس نے تو میری خدمت میں کڑوا پھل پیش کر دیا۔ ایک اور افسانہ کا عنوان تھا 'دخمہ' اس بار پھر وہی سیڑھی کی کشاکش اور محنت سے گزر کر معنی دیکھا تو معلوم ہوا کہ 'پارسیوں کے قبرستان' کو کہتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے عمر کی اس منزل میں قبرستان کو لے کر کیا کروں گا۔ مگر جب افسانہ پڑھا تو اس کے انوکھے بیانیہ اور طرز ادا کو پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ چلو ڈکشنریوں والی کڑی محنت اکارت تو نہیں گئی۔''

(مضمون 'بیگ احساس تم ہی ہو'، رسالہ 'چہار سو'، لاہور، جلد 27، شمارہ مئی۔ جون 2018، ص 20)

حنظل میں شامل ساری کہانیاں 1979 سے لے کر 1993 تک مختلف رسالوں میں چھپتی رہیں اور 1993 میں پھر یہ مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں پہلی کہانی 'پناہ گاہ کی تلاش' ذکی محمد انور کے نام لکھی ہے۔ اس میں ایک کینوس میں سارے مصنفوں کو جمع کرتے ہیں اور خود بھی اس میں موجود ہیں۔ پھر مصنف اور کردار میں وہ مکالمہ ہوتا ہے جس میں مصنف کی ساری ہیرا پھیری کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مکالمہ نگاری کے اعتبار سے یہ ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ اس کہانی میں فن میں سچائی کو پیش کرنے کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک کینوس جو چاہتا ہے کہ اس منظر پر خوبصورت رنگوں کا برش پھیر دے لیکن کچھ مدت گزرنے کے بعد ہی نئے رنگ ڈھل جاتے ہیں اور پرانی حالت پھر لوٹ آتی ہے۔ اس افسانے میں کرداروں کا کام 'منظر' اور 'تلاش' نے نبھایا ہے۔ یہ افسانہ دراصل فکشن نگاروں پر طنز کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

'میوزیکل چیئر' میں بھی سماج کے نچلے طبقے کی ایک عورت کی گود میں دم توڑتی بچی کو دکھایا گیا ہے جسے گاڑی میں سیٹ تک نصیب نہیں ہوتی اور کوئی میوزیکل چیئر پر آرام سے بیٹھا میگزین پڑھ رہا ہوتا ہے۔ دوا دارو کے لیے نزدیک کوئی ہسپتال بھی نہیں ہے۔ غربت کی وجہ سے عورت کی جسمانی حالت اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ چھاتی سے بچی کے لیے دودھ تک نہیں نکلتا۔ اس طرح سے 'میوزیکل چیئر' میں ایک طرف آج کی مصروف زندگی اور وسائل کی عدم دستیابی سے پیدا شدہ مسائل دکھائے گئے ہیں وہیں عورت کو محض جنسی لذت دینے والی شئے کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔

افسانہ 'حنظل' ایک علامتی نوعیت کا افسانہ ہے جس میں ایک درخت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جس میں پھل آنا خوشحالی کی طرف اشارہ ہے۔ اس افسانے میں ہندوستان کی 200 سالہ تاریخ کو پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح انگریزوں نے ہماری جڑوں کو نقصان پہنچایا اور ملک غلام ہو گیا۔ 'حنظل' ایک ایسا پھل ہے جو نہایت کڑوا ہوتا ہے۔ آدم کو جس پھل کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا تھا وہ تو لذیذ تھا پر آج وہی پھل حنظل کے پھل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یعنی زندگی کڑوی حقیقتوں سے بھر چکی ہے۔ اس افسانے میں درحقیقت جڑوں سے بچھڑنے کا شدید احساس ہے۔

'آسماں بھی تماشائی' ایک ایسی کہانی ہے جو سماج کے ان لوگوں کی بے حسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے پاس طاقت ہے اور جو بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے کیوں کہ ان کو تماشائی بن کر دیکھنے میں ہی مزہ آتا ہے۔

افسانہ 'برزخ' کا بنیادی موضوع 'وقت' ہے۔ اس

میں دو متضاد حقیقتوں، زندگی اور موت کے تصادم میں تخلیقی عمل کو استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کو ایک اپاہج کے احساس کمتری نے قلمبند کیا ہے جو زندگی اور موت کے بیچ لٹک رہا ہے۔ اس افسانے میں وقت کو اس لیے موضوع بحث بنایا گیا ہے کیوں کہ اس اپاہج کے نزدیک وقت ایک عذاب ہے۔

افسانہ 'کرفیو' میں ایک عورت کے اندر پیدا ہونے والی داخلی کشمکش کو تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے جو شہر میں لگے کرفیو میں پھنس جاتی ہے اور ایک مرد کے گھر رات گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اسی طرح مجموعے میں شامل ایک اور افسانہ 'خس آتش سوار' جس میں قدیم ہندوستان کے مٹھوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں مرد اور عورت ساتھ ساتھ گرودیو سے نظری علوم کی جگہ عملی علوم سیکھتے ہیں۔

بہر حال 'متقلل' میں بیگ احساس نے بیانیہ تمثیل کی تکنیک کا اکثر سہارا لیا ہے۔ اس کے افسانوں میں کرداروں کا کوئی حتمی نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنے سیاق و سباق سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس مجموعے میں تفہیمی ساخت کے استعارے زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس کے افسانوں کا تیسرا اور سب سے اہم مجموعہ 'دَخمہ' ہے جو سال 2015 میں عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی سے شائع ہوا۔ یہ افسانوی مجموعہ گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس کا ابتدائیہ مرزا حامد بیگ نے لکھا ہے۔ 'دخمہ' میں شامل افسانوں کی ترتیب اس طرح ہے: سنگ گراں، کھائی، چکرویو، درد کے خیمے، سانسوں کے درمیان، نجات، دھار، شکستہ پر، دخمہ، نمی دانم کہ، رنگ کا سایہ۔

اس مجموعے کے سبھی افسانے فنی پختگی کے غماز ہیں۔ جن میں برجستگی بھی ہے اور تہہ داری بھی۔ اس افسانوی مجموعے میں ستر کی دہائی میں مخصوص جدیدیت کی تحریک کی رو میں اُٹھنے والی آوازوں کا ردِ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ مرزا حامد بیگ 'دخمہ' کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

''بیگ احساس کا تعلق بھی ستر ہی کے دہے سے ہے، لیکن وہ جدیدیت کی تحریک سے الگ تھلگ رہے۔ نہ 'شب خون' الہ آباد میں دکھائی دیے، نہ اوراق، لاہور میں لیکن انھیں صرف و محض سادہ بیانیہ بھی نہیں بھایا۔ یہی سبب کہ انھوں نے سیدھے سجاؤ تشکیل دیے گئے بیانیہ کے اندر پرت در پرت کئی ایک تہیں جما کر کامل علامتی، استعاراتی، کیوبسٹک اور تجریدی افسانہ لکھنے کی بجائے ایک ایسا تہہ دار بیانیہ تشکیل دیا، جس میں معنویت کی کئی ایک پرتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔''

(دخمہ: بیگ احساس، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2015، ص 9)

''دخمہ' کے سارے افسانے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے ندرت رکھتے ہیں۔ خود مجموعے کا عنوان ہی اپنے آپ میں ندرت رکھتا ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ 'دخمہ' میں شامل پہلا افسانہ 'سنگِ گراں' ہے۔ اس افسانے میں عورت کی نفسیات کا بڑی باریکی سے تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ صارفیت کے اس دور میں کیسے ایک مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا انسان زندگی کے فطری عوامل سے خود کو دور رکھتے ہوئے تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ لڑکے کے پاس خود کا مکان نہ ہونے کے سبب وہ لڑکی کو چھوڑ دیتا ہے۔ کچھ مدت بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بیوی کے پیٹ میں بچہ پل رہا ہے تو خوش ہونے کے بجائے وہ اسے اپنا حمل گرا دینے کے لیے کہتا ہے۔ ماں بننا جو عورت کا فطری تقاضا ہوتا ہے وہ بھی شوہر کی مجبوریوں اور حالات کو مد نظر رکھ کر فطرت کے عمل میں رکاوٹ ڈال کر اپنے وجود سے آنے والے بچے کو گرا دیتی ہے۔

مجموعے کا دوسرا افسانہ 'کھائی' ہے۔ جس میں تین نسلوں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ اصلاً یہ کہانی تین نسلوں کے مابین نسلی اور ذہنی اختلافات کو پیش کرتی ہے۔ اس میں امیری اور غریبی کے درمیان بنی کھائی کو خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے۔ افسانے کے تین اہم کردار شوکت علی جاگیردارانہ ذہنیت کا حامل ہے اور کفایت جو اس کا بیٹا ہے کفایت شعار ہے اور ہر وقت کفایت شعاری سے کام لیتا ہے۔ کفایت کا بیٹا شہزادہ شاہانہ رکھ رکھاو اور تصنع کا دلدادہ ہے۔ اس افسانے میں جو تفریق دکھائی گئی ہے وہ اصل میں نئی نسل کی اس سوچ کو پیش کرتی ہے کہ دوسروں کے لیے وہ جھوٹی شان و شوکت کا لبادہ اوڑھتے ہیں لیکن اپنوں سے خلوص نہیں رکھتے۔

مجموعے میں شامل چوتھا افسانہ 'درد کے خیمے' ہے۔ یہ افسانہ 1947 کے بعد بٹوارے سے متعلق ہے۔ اس میں تین اہم کردار بہن، بہنوئی اور ننھی بھانجی کے ذریعے سے ہجرت کے واقعہ کو خوبصورتی اور ڈرامائی طریقے سے دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں حیدر آباد (دکن) سے کھوکھراپار کے راستے سے کراچی تک کی ہجرت کو بیانیہ انداز میں دکھایا گیا ہے۔ اس افسانے میں بیگ احساس نے ناسٹلجیا کی ایک نئی جہت کو یوں شامل کیا ہے کہ ہجرت کرے یا کوئی مرجائے دونوں ایک ہی تجربہ ہے۔

موضوع بحث افسانوی مجموعے میں شامل پانچواں افسانہ 'سانسوں کے درمیاں' ہے۔ یہ افسانہ انسانی رشتوں کی پامالی اور جھوٹی شان و شوکت سے متعلق ہے۔ انسان کے پاس جب دولت ہوتی ہے یا پیسہ ہوتا ہے تب سارے رشتے دار انتہائی قریب معلوم ہوتے ہیں اور جوں ہی ہاتھ سے پیسہ چلا جاتا ہے سب رشتے پرایے ہو جاتے ہیں۔ اس افسانے میں انسانی جذبات کو ابھرتے اور ڈوبتے دکھایا گیا ہے۔

'دخمہ' میں شامل چھٹا افسانہ 'نجات' ہے۔ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار فرحان ہے۔ اس افسانے میں 9/11 کے بعد گلف ممالک سے ان وطن واپس لوٹنے والوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جن کو اپنے ملک میں دوبارہ سیٹ ہونے میں مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ خود کی اور دوسروں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔

مجموعہ 'دخمہ' میں شامل ساتواں افسانہ 'دھار' ہے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی مگر سیاسی نوعیت کا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی جو ستم خوردہ حالت ہے اس کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مجموعے میں شامل آٹھواں افسانہ 'شکستہ پر' ہے۔ یہ افسانہ عورت کی نفسیات اور رشتوں کی نزاکت پر مبنی ہے۔ اس کہانی کے مرکزی کردار، سشما، سمیر اور سمن ہے۔ سشما جو ایک طلاق یافتہ عورت ہے اس کی ایک بیٹی (سمن) بھی ہے۔ سمیر سشما کے ساتھ شادی کر لیتا ہے پھر بیٹی کو اپنانے کا مسئلہ، بیٹی کو اپنانے کے بعد اس کا اپنی ماں کے ساتھ موازنہ کرنا اور اپنے سوتیلے باپ کی جانب راغب ہونا وغیرہ یہ وہ واقعات ہیں جن کو اس افسانے میں دکھایا گیا ہے۔

زیر گفتگو افسانوی مجموعے کا نواں افسانہ خود مجموعے کا عنوان 'دخمہ' ہے۔ دخمہ جس کو پارسی قبرستان یا نعش کے رکھنے کی خاص جگہ کہا جاتا ہے۔ چوں کہ اس افسانے میں پارسی برادری جس میں کسی مرنے والے کو دفن یا جلانے

کے بجائے دخمہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا ہے جہاں اس کی نعش کو گدھ نوچ لیتے ہیں۔ پارسیوں کے یہاں یہ ایک مذہبی عقیدہ ہے اور اسے نیک شگن مانا جاتا ہے۔ یہ افسانہ گاتھی (Gothic) طرز کا افسانہ ہے جس میں عقائد، رسومات، روایات، تاریخ، سیاست اور انسانی میلانات کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

افسانوی مجموعہ 'دخمہ' میں شامل دسواں افسانہ 'نمی دانم' ہے۔ اس افسانے میں خانقاہ کی زندگی اور وہاں ہو رہے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ درحقیقت اندھی عقیدت اور توہم پرستی سے متعلق ہے اور 'دخمہ' کا آخری افسانہ 'رنگ کا سایہ' ہے۔ اس افسانے میں ریاست حیدرآباد میں مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد کی صورت حال کا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔

یہ تھا بیگ احساس کے مختصر مگر فنی و تکنیکی اعتبار سے پختہ افسانوں کا خاکہ۔ مجموعی طور پر بیگ احساس کے افسانے فن کی بلندیوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان اگرچہ دکنی تھی لیکن اپنے افسانوں پر اس کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ زبان سادہ اور برجستہ ہے۔ جملے بھی مختصر استعمال کیے ہیں۔ پلاٹ سیدھے سادے ہیں۔ واقعات کی ترتیب میں تسلسل قائم ہے اور مکالمے نہایت چست اور برمحل ہیں۔ حیدرآبادی فضا کو اکثر افسانوں کی زینت بنایا ہے۔ کرداروں کی تخلیق میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ بیگ احساس کے افسانے جدید حسیت کی فنکارانہ مثال ہیں اور ان کے افسانوں کی سب سے نمایاں خوبی جو ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں، ان کا حزنیہ اختتام ہے۔ انھوں نے جو بھی لکھا تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعاتی اعتبار سے اور تکنیکی اعتبار سے بیگ احساس کے افسانے جدید دور میں نمائندہ حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

'کرشن چندر شخصیت اور فن' بیگ احساس کی پی ایچ ڈی کا موضوع تھا۔ اس کام میں بیگ احساس نے انتہائی باریک بینی سے کام لے کر کرشن چندر کے ان تمام پنوں کو کھنگالنے کی کوشش کی جو تاریخ کے اوراق میں گم تھے۔ یہ کام بیگ احساس نے پروفیسر گیان چند کی فرمائش پر 1979 میں شروع کیا اور 1985 میں مکمل کیا۔ اس کا پہلا باب کرشن چندر کی حالات زندگی پر مشتمل ہے جس میں بیگ احساس نے پیدائش سے متعلق اور ان کی بڑی بہن چندر مکھی کے ساتھ ساتھ سلمیٰ صدیقی سے شادی وغیرہ کی اصل سے قارئین کو آشنا کرانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے باب میں کرشن چندر کے بچپن، لڑکپن، جوانی، عملی زندگی، کھان پان، ملازمتیں، گھریلو زندگی، سیاسی نظریات وغیرہ سے متعلق جانکاری دی گئی ہے۔ تیسرے باب میں بیگ احساس نے کرشن چندر کے فن پر بات کر کے ان کے افسانوں کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 1936 تا 1945 اور دوسرا دور 1945 تا 1977۔ چوتھے باب میں بیگ احساس نے 300 سے زائد افسانوں، 44 ناولوں، ڈراموں، تنقیدی مضامین، مزاحیہ مضامین، رپورتاژ، بچوں کا ادب، خاکوں، خطوط، دیباچوں وغیرہ کی فہرست تیار کی ہے اور ساتھ ساتھ چند تخلیقات کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

'شور جہاں' یہ کتاب 2005 میں مکتبہ شعر و حکمت سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں 21 مضامین ہیں جنھیں بیگ احساس نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ (1) زمیں کھا گئی آسمان کیسے کیسے۔ (2) پھول کی پتی سے۔ (3) ولولہ روح میں افسانہ در افسانہ اٹھا۔ (4) ناخن کا قرض

یہ مضامین مختلف موقعوں پر لکھے گئے ہیں جن میں فکر انگیزی بھی ہے اور باریک بینی بھی۔ اس کتاب کا پہلا مضمون 'امیر مینائی حیدرآباد میں' ہے۔ 'شور جہاں' میں شامل دیگر مضامین اس طرح ہیں:

امجد حیدرآبادی کی نثر، اقبال اور حیدرآباد، مولانا حسرت موہانی ایک بے باک و حق گو مجاہد آزادی، جوش اور فراق کی شخصیتیں، پریم چند کی فکر، آگ کا دریا، جو رہی سو بے خبری، اردو شاعرات کی لسانی حسیت، نیا اردو افسانہ تشکیک سے تشکیل تک، معاصر اردو افسانہ وغیرہ اور ناخن کا قرض میں 6 مضامین جو مختلف تقاریب اور جلسوں میں پڑھے گئے ہیں۔

ہزار مشعل بکف ستارے (مرتب): یہ کتاب 2005 میں استعارہ پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ انتخاب کلام علی ظہیر کو مرتب کر کے بیگ احساس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب بیگ احساس نے شمس الرحمن فاروقی کے نام کی ہے۔ اس کتاب میں بیگ احساس نے علی ظہیر کی سینتیس سالہ شاعری کی 183 نظموں اور چند غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کے پیچھے بیگ احساس کا جو مقصد تھا وہ بقول ان کے یہ تھا:

''علی ظہیر مجھے جدید شاعروں میں ویسے ہی منفرد لگتے ہیں جیسے ترقی پسند شاعروں میں فیض تھے۔ فیض کے یہاں عربی اور انگریزی کا پس منظر تھا تو علی ظہیر کے یہاں فارسی اور انگریزی کا پس منظر ہے۔ فیض نے غم جاناں سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک کو اپنی نظموں میں جگہ دی۔ علی ظہیر نے بھی بین الاقوامی مسائل اور مظلوموں سے ہمدردی کے ساتھ عشق، وصل اور ہجر کی کیفیات کا خوب صورت اظہار کیا ہے۔ علی ظہیر کے یہاں بھی فیض کے موضوع سخن کی طرح کشمکش ہے۔''

(ہزار مشعل بکف ستارے: بیگ احساس (مرتب)، استعارہ پبلی کیشنز، نئی دہلی 2005، ص 11)

پروفیسر بیگ احساس کی صحافتی خدمات:

بیگ احساس کا صحافت سے گہرا تعلق تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز 'فلمی ستارے' سے ہوا۔ ابتدا میں حیدرآباد کے مختلف روزناموں (فلم رہبر، منصف، سیاست وغیرہ) میں فلمی صفحوں کے لیے ہفتہ وار کالم لکھتے تھے۔ پروفیسر مغنی تبسم کے انتقال کے بعد اردو کے مشہور رسالہ 'سب رس' کے مدیر بنے۔ سب رس ملک کا قدیم ماہنامہ ہے جو ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد سے نکلتا ہے۔ بیگ احساس کافی عرصے سے تا حال اس رسالے کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ اقبال اکیڈمی حیدرآباد سے نکلنے والا رسالہ 'اقبال ریویو' کے بھی مدیر رہے۔ اس کے تحت ایک خصوصی شمارہ 'مطالعہ اقبال آہنگ غالب کے پس منظر میں' نکالا جو کافی مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ آن لائن ادبی فورم 'بازگشت' کے سرپرست کے طور پر بھی صحافتی خدمات انجام دیں۔ 'بازگشت' کی جانب سے مختلف موضوعات کے تحت نشستوں کا اہتمام کیا۔

متذکرہ بالا خدمات کے علاوہ پروفیسر بیگ احساس نے دکن کے نامی گرامی شاعر شاذ تمکنت کا مونوگراف بھی لکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم بالغان کے حوالے سے دو کتابیں (مرزا غالب، بوجھ کیوں بنوں) اور ڈاکٹر ایم کے کول کے ساتھ مل کر دکنی فرہنگ بھی ترتیب دی ہے۔

مجموعی طور پر بیگ احساس دیار دکن کے مقبول ترین ادیبوں اور صحافیوں میں سے ایک ہیں جس نے اپنی قابلیت، ذہانت اور متانت سے نہ صرف اپنی تخلیقات کو سجایا سنوارا بلکہ دکنی تہذیب اور دکنی حسیت سے تہہ دار بیانیہ کی صورت ایجاد کر کے انھیں تہذیبی ورثہ بنا دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں اپنی محنت لگن اور علمی صلاحیت سے عثمانیہ یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف حیدرآباد میں اردو طلبا کی ایک بڑی کھیپ تیار کی۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیمناروں کا انعقاد کر کے نہ صرف حیدرآباد بلکہ پورے اردو ادب کی شان بلند کی۔ پچھلی تین چار دہائیوں میں جدید فکشن میں ایسی کہانیاں ترتیب دیں کہ جدید اردو افسانہ کے موضوع پر گفتگو ان کے حوالے کے بغیر ادھوری ہے۔ فن افسانہ نگاری میں اپنا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ تنقید کے میدان میں بھی اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گلشن ادب میں بیگ احساس کی ذات بہار کی مانند تھی۔

■

Shabbir Ahmad Lone
Frisal, Kolgam - 192232 (J&K)
Mob.: 7006942976
Email.: shabberlone2018@gmail.com

طنز ومزاح کا درخشاں ستارہ

ہلال سیوہاروی

سالک دھامپوری

ہلال سیوہاروی طنزومزاح کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی طنزیہ شاعری سے نہ صرف ملکی سیاست بلکہ قائدین اور بدعنوان معاشرے اور رشوت خور افسران کی زندگی کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ گو کہ ہلال سیوہاروی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، ان کا خاندانی پس منظر ضرور ادبی و شعری ذوق کا حامل تھا۔ ان کے دادا قاضی ظہورالحق کا شمار تو فارسی و اردو کے قادرالکلام شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کے والد قاضی فضل حق بھی شعری ذوق رکھتے تھے۔

15 جنوری 1928 کو قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور میں قاضی ظہورالحق کے فرزند قاضی فضل حق کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کو تعلیم دلانے کی بے حد کوشش کی گئی مگر وہ ابتدائی درجات سے آگے تعلیم نہ حاصل کرسکا۔ یہی بچہ بڑا ہوکر طنزومزاح کا ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ثابت ہوا، جس کو لوگ ہلال سیوہاروی کے نام سے جانتے ہیں۔

ہلال سیوہاروی 1946 میں اپنے قصبے کے بڑلا مل میں ایک فٹر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ ان کے مزاج اور ان کی زندگی کے کام کے درمیان گو کہ شاعری کا کوئی میل نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ایک اعلیٰ درجے کے شاعر بن کر ابھرے۔ ان کی شاعری صرف قہقہہ ہی نہیں بلکہ خون دل میں ڈوبی ہوئی انگلیوں سے لکھا ہوا اس دور تشدد و انحطاط کا منظر نامہ بھی ہے جو ہمارے احساسات کے تاروں کو جھنجھنا کر ہمیں کاروان انقلاب کی طرف جانے کی دعوت دیتا ہے۔

1957 میں انھوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر کا امتحان پاس کیا اور اس بہانے میر، غالب، انیس، دبیر اور علامہ اقبال کے علاوہ دوسرے ادیب اور شعراء کو پڑھنے کا موقع مل گیا۔

ہلال سیوہاروی کو میں نے سب سے پہلے بمبئی کے ایک مشاعرے میں دیکھا اور پہلی بار ان کا کلام سنا۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی میں فورٹ میں ہونے والے ایک آل انڈیا مشاعرے میں اپنے اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ اس لیے گیا تھا کہ مشاعرے کے پوسٹر میں ضلع بجنور کے ایک شاعر ہلال سیوہاروی کا بھی نام تھا۔ مشاعرہ اس لحاظ سے بے حد کامیاب رہا کہ اسی مشاعرے میں ہلال سیوہاروی کا نام بحیثیت طنزومزاح شاعر کے طور پر ہندوستان کے گردوپیش میں ابھرا۔ اس کے بعد تو وہ ترقی کی منازل طے کرتے گئے۔

ہلال سیوہاروی سے میری دوسری ملاقات ان کے مکان پر ہوئی۔ میں دہلی سے گھر گیا ہوا تھا۔ اپنے دوست محمد مرتضیٰ آزاد سے ملنے سیوہارہ گیا تو انھوں نے میری ملاقات ہلال سیوہاروی سے کرائی۔ ہم لوگ عصر کے بعد ان

ہلال سیوہاروی نے ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے مشاعروں میں بھی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے پاکستان، روس، برطانیہ، دوحہ قطر وغیرہ ممالک میں منعقد عالمی مشاعروں میں اپنے ملک ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔

کے گھر گئے، وہ بڑے تپاک سے ملے۔ اس وقت وہ عمر کے آخری دور سے گزر رہے تھے۔ لیکن ان کے مزاج اور گفتگو میں وہی شگفتگی اور شیفتگی تھی بات چیت میں بھی مزاح تھا، میں نے ان کو بتایا کہ میں نے آپ کو پہلی بار 1965 میں بمبئی کے ایک مشاعرے میں سنا تھا وہ کہنے لگے کہ ہاں وہ میرا پہلا بڑا مشاعرہ تھا۔

میں نے کہا ہلال صاحب! آپ طنز و مزاح کے شاعر ہیں، زندگی کا بڑا گہرا مطالعہ آپ نے کیا ہے۔ سرد گرم حالات سے گزرے ہیں، کوئی واقعہ اپنی زندگی کا سنایئے۔ انھوں نے کہا کہ جب میری شاعری کی شہرت ملک و بیرونِ ملک ہونے لگی اور قومی پریس میں میرے فوٹو شائع ہونے لگے تو بعض حاسدین نے مل مالک بڑلا صاحب سے میری شکایت کی کہ تمہاری مل کا معمولی فٹر اخبارات میں چھپ رہا ہے۔ غیر ممالک جارہا ہے۔ بڑلا صاحب نے ایک دن مجھے اپنے آفس میں بلایا اور اس بارے میں باز پرس کی۔ میں گھبرا گیا کہ شاید وہ نوکری سے نکال دیں گے، لیکن انھوں نے جو کچھ کہا، اسے سن کر میں حیران رہ گیا۔ انھوں نے کہا ''بیٹا ہلال! تم آرام سے شعر و شاعری کرو۔ مل آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، تمہاری تنخواہ تمھارے گھر پہنچ جایا کرے گی۔ تمہاری شاعری کے ذریعے تم ہی نہیں بلکہ میرے مل کی اور میری بھی پبلسٹی ہورہی ہے۔''

ہلال سیوہاروی کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی دن بھر کی محنت و مشینوں کے ناگوار گوش گراں شور میں شاعری کی خوشگوار لہریں دو متضاد عناصر ہیں مگر ہلال سیوہاروی کی تخلیق اور ترقی کا انحصار اور بنیاد یہی تضاد ہے ہلال صاحب ایک فٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انھیں کسبِ معاش کے لیے دن بھر سخت محنت کرنا پڑتی تھی مگر ان کا شاعرانہ مزاج اور فنکارانہ فطرت اسی غیر شعری ماحول میں بھی مصروفِ عمل رہتی تھی۔ وہ ابتدا میں درجہ تین سے زیادہ نہ پڑھ سکے مگر بعد میں شعری ذوق و شوق کے بعد انھوں نے ادیب ماہر اور ہندی وانگریزی کی تعلیم اپنی محنت اور لگن سے حاصل کی۔

ایک بار ضلع بجنور کے قصبات و شہروں میں بجلی کا بحران ہوگیا تھا، کئی کئی دن تک بجلی نہیں آتی ہے ہر شہر و قصبہ میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا تھا۔ اس ماحول سے متاثر ہوکر ہلال صاحب نے بجنور شہر کے ٹاؤن ہال میں ہونے والے مشاعرے میں ایک قطعہ سنایا تھا۔

تم اپنی غریبی کو مٹاتے نہیں خود ہی
کیا کیا نہ ملے تم سہارا نہیں سمجھے
مدت سے جو ہے شہر کی گلیوں میں اندھیرا
تم پھر بھی حکومت کا اشارہ نہیں سمجھے

ہلال صاحب کے کئی شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں مگر افسوس ان کے وارثان نے ان مجموعوں کی حفاظت نہیں کی کیونکہ ان میں سے کئی اس وقت نایاب ہیں۔ جو مجموعے شائع ہوئے تھے ان میں فریب سحر، فریب نظر، انگوٹھا چھاپ، دھندلا سویرا، اگر برا نہ لگے۔ ہلال سیوہاروی کی مشہور 'جوتا' نظم کو بھی عالمی مشاعروں میں بڑی داد ملتی تھی۔ 'جوتا' نظم میں وہ کہتے ہیں۔

کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی انساں
بل پہ تقدیر کے تدبیر سے لڑسکتا ہے
جس کی ایجاد تھی پیروں کی حفاظت کے لیے
کیا خبر تھی وہ کبھی سر پہ بھی پڑسکتا ہے

ہلال سیوہاروی کا یہ شعر تو بہت ہی مشہور و معروف ہے جو پورے ملک کی سیاست اور سیاسی افراد پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

برباد گلستاں کرنے کو صرف ایک ہی اُلّو کافی ہے
ہر شاخ پہ الّو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

ہلال سیوہاروی کی نظم 'کتوں کی کانفرنس' کے چند اشعار دیکھیے۔

ایک کتا تو یہاں تک کہہ گیا جذبات میں
کیا حماقت کی ہے اس نے آج کے حالات میں
جبکہ ساری قوم کے آگے ہے روٹی کا سوال
آج ہی کے دور میں اس کو دکھانا تھا کمال
اس کو لینا تھا جو ہم کتوں کی صحبت کا اثر
اور بھی کچھ خوبیاں تھیں ان پہ کرنی تھی نظر
سب سے پہلے یہ اصولِ زندگانی سیکھتا
کس طرح ہوتی ہے گھر کی پاسبانی سیکھتا
سب سے پہلے ہم سے لینا تھا اسے درسِ وفا
آج تک یہ جس سے بے بہرہ ہے اور نا آشنا
فقر و فاقہ سیکھتا لیتا قناعت کا سبق
ہم سے پہلے اس کو لینا تھا محبت کا سبق
اشرف المخلوق کیسے پڑ گیا تھا اس کا نام
کیا نہیں اے ساتھیو یہ ڈوب مرنے کا مقام
یہ کرے چوری پتہ ہم سے لگاتی ہے پولس
ہم بتاتے ہیں تو اس کو کھینچ لاتی ہے پولس
کون سی پھر فوقیت ہے آج کے انسان میں
ہم سے آگے کب یہ پہنچا ہے کسی میدان میں
اک ہمارے واسطے قدرت نے رکھا ہے نظام
رات دن ہم نسل سازی کا نہیں کرتے ہیں کام
بات کیا سوچی ہمیں نیچا دکھانے کے لیے
حرص بھی کرنے چلا بچے بنانے کے لیے

سیاسی افراد کو سامنے رکھتے ہوئے بھی ہلال سیوہاروی نے کافی کچھ لکھا اور اپنے طنز و ظرافت کے فن کے سانچے میں بڑی خوبصورتی سے سیاست دانوں کو مشورے بھی دیے۔ ان کی یہ نظم ملاحظہ کیجیے۔

تم ہو کہ ہر اک عیب کو فن کہہ کے چلے ہو
تم دشت و بیاں کو چمن کہہ کے چلے ہو
چنگاری کو سورج کی کرن کہہ کے چلے ہو
جس شام کو تم صبح وطن کہہ کے چلے ہو
وہ صبح نہ رہ جائے کہیں شام میں ڈھل کے
لیکن یہ سیاست ہے مرے دوست سنبھل کے

ہلال سیوہاروی کی نظمیں تاریخی پس منظر کو بھی اجاگر کرتی ہیں، انھوں نے تاریخی حالات کی تبدیلی کو اپنی نظموں میں اس طرح سمویا کہ وہ طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ بن گئیں۔

ہلال سیوہاروی نے ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے مشاعروں میں بھی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے پاکستان، روس، برطانیہ، دوحہ قطر وغیرہ ممالک میں منعقد عالمی مشاعروں میں اپنے ملک ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔ 1987-88 میں ادبی خدمات کے لیے اردو اکادمی دہلی نے ان کو غالب ایوارڈ سے نوازا تھا۔ یہ ایوارڈ اس وقت کے صدر جمہوریہ جناب شنکر دیال شرما نے عطا کیا تھا۔ ان کے مداحوں میں معروف صنعت کاروں کے علاوہ شہنشاہ جذبات دلیپ کمار صاحب اور مزاحیہ اداکار جانی واکر صاحب بھی شامل تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ طنز و مزاح کی شاعری کی جو روایت اکبرالٰہ آبادی سے دلاور فگار تک پہنچی تھی، اسی روایت کو ہلال سیوہاروی نے کافی دور تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طنز و مزاح کی شاعری کی تاریخ ہلال سیوہاروی کے نام کے بغیر ادھوری رہے گی۔ افسوس کہ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں عوام کو قہقہے لگانے پر مجبور کرنے والا یہ منفرد شاعر ہلال سیوہاروی 15 نومبر 2012 کو اپنے لاکھوں مداحوں کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنے حقیقی مالک سے جاملا۔

■

Salik Dhmapuri
E-35/B, Abul Fazal Enclave,
Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi-110025
Mobile: 9868966128
E-mail : salikdhmapuri@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی کے
نظریہ تعلیم کی انفرادیت

آفتاب عالم اعظمی

غدر کی تباہی اور ہولناکی سے ہندوستانی مسلمانوں نے ماضی کی عظمت رفتہ کو نہ صرف یاد کیا بلکہ ان کو اپنے حال و مستقبل کے بارے میں از سر نو سوچنے اور جائزہ لینے کا موقع فراہم کردیا۔ ان ہی حالات میں چند تاریخ ساز شخصیات قوم میں پیدا ہوئیں جنھوں نے احساس کمتری کے شکار مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی ایک نئی روح پھونکی اور قوم مسلم کو ذلت و رسوائی سے نکال کر ان کی زندگی کو وہ وقار بخشا جو کسی حکیم کے نسخۂ کیمیا سے کم نہ تھا۔

ان میں سرسید احمد خان، مولانا محمد قاسم نانوتوی، اور علامہ شبلی نعمانی (4 جون 1857 – 18 نومبر 1914) کی شخصیت بڑی نمایاں رہی ہے ان سبھی مفکرین تعلیم نے مسلمانوں کی ترقی وکامیابی کا راز تعلیم کو بتایا اور ہر ایک نے اپنے اپنے طریقے سے ان کے روشن مستقبل کا حل بھی پیش کیا۔ سرسید نے مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کی وکالت کی اور ہندستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کو عام کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کردی اور مشن کے طور پر کام کیا۔ اس کے بہتر نتائج آئے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ قدیم اور دینی تعلیم کا حامی تھا جس کی قیادت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دیگر علما کررہے تھے وہ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ملت کے سامنے ہے لیکن شبلی نعمانی ایک ایسے مفکر تعلیم تھے جنھوں نے مسلمانوں کی ترقی وکامیابی کے لیے قدیم وجدید تعلیم کو یکساں طور پر مفید اور کارآمد بتایا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی 'حیات شبلی' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''(مولانا شبلی) قدیم وجدید کے ایسے سنگم بنے جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے ....وہ ہمارے قدیم اور مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علوم کے بہت سے آرا وخیالات سے واقف بھی تھے ....ساتھ ہی محقق فن بھی تھے، ادیب بھی تھے، شاعر بھی تھے، انشا پرداز بھی تھے، خطیب بھی تھے، مورخ بھی تھے، متکلم بھی تھے، مفکر بھی تھے، مصلح بھی تھے، سیاسی بھی تھے، ماہر تعلیم بھی تھے اور نئے زمانے کے اقتضاآت اور مطالبات کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انقلابی بھی تھے۔[1]

شبلی نعمانی نے نہ تو سرسید کی جدید تعلیم کی مخالفت کی اور نہ ہی دارالعلوم دیوبند کی۔ صرف قدیم ودینی تعلیم کی موافقت کی بلکہ دونوں طرح کی تعلیم کے حمایتی تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے شبلی نعمانی نے ندوۃ العلما لکھنؤ کا رخ کیا اور ارباب ندوۃ العلما کو نصاب میں اصلاح کا مشورہ دیا لیکن ان کا یہ مشورہ قابل اعتنا نہ سمجھا گیا لیکن جب وہ 1905 میں معتمد تعلیم کی حیثیت سے ندوۃ العلما میں تشریف لائے تو سب سے پہلا کام جو انھوں نے شروع کیا وہ اصلاح نصاب کا تھا اور ایسا نصاب تعلیم مرتب کیا جو قدیم وجدید تعلیم کا سنگم ہے۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ہم نے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب میں ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔''[2]

شبلی نعمانی کو تعلیم وتربیت پر نصاب تعلیم تیار کرنے کا بڑا تجربہ تھا۔ قیام علی گڑھ میں سرسید کی فرمائش پر 'تاریخ بدء الاسلام' مرتب کی جو وہاں کے نصاب میں شامل کی گئی۔ الہ آباد یونیورسٹی کی درخواست پر فارسی امتحانات کے لیے بی اے تک کا نصاب تیار کیا اور اس درمیان ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی کے نصاب کا جائزہ بھی لیا اور اصلاح کے لیے چند نکات پر مشتمل اپنی سفارشات پیش کی۔ جدید تعلیم کے لیے خود انھوں نے ایک اسکول 2 جون 1883 کو 'نیشنل اسکول' کے نام سے قائم کیا۔

شبلی نعمانی کم وبیش 24 سال تک تعلیم وتربیت سے منسلک رہے۔ 1883 تا 1898 علی گڑھ کالج میں پروفیسر کے عہدہ پر تدریسی خدمت انجام دی اور 1905 تا 1913 ندوۃ العلما لکھنؤ میں معتمد تعلیم کی حیثیت سے فائز رہے۔ اس طویل مدت میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم وتربیت کو بہتر کرنے کے لیے عملی جدوجہد کی اور تعلیم وتربیت اور نصاب تعلیم پر مختلف زاویے سے تحقیقی اور علمی بحث کا آغاز کیا۔ اس کی اہمیت وافادیت پر متعدد مضامین لکھ کر اپنے نظریہ تعلیم وطریقہ تعلیم کی وضاحت کی۔ شبلی نعمانی کا پہلا تعلیمی وعلمی مقالہ 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' ہے جس کو انھوں نے 27 دسمبر 1887 کو لکھنؤ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں پیش کیا اور فن کی تعلیم پر زور دیا۔ اس مقالے کی اہمیت وافادیت عہد نو میں اتنی ہی مسلم ہے جتنی ایک صدی قبل تھی۔ تعلیم وتربیت کے نظام کا معائنہ کرنے کے لیے شبلی نعمانی نے بلاد اسلامیہ، روم، مصر، شام اور قسطنطنیہ وغیرہ کے ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے تعلیمی نظام کا مشاہدہ کیا۔ خاص طور سے قسطنطنیہ کے تعلیمی نظام کا ذکر سرسید کو ایک خط میں کیا:

''افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا، اس میں یورپ کا ذرا بھی پرتو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے لیکن دونوں کے حدود جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی، یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے جس کا رونا ہے۔''[3]

شبلی نعمانی اگرچہ جدید تعلیم کو پسند کرتے تھے لیکن وہ قدیم تعلیم کے سخت حامی بھی تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اپنی قومیت ومذہبیت کی شناخت کو زندہ اور قائم رکھنے کے لیے قدیم تعلیم انتہائی ضروری ہے لیکن وہ اس کے نقائص سے بھی بخوبی واقف تھے اور کسی حال میں اسے قبول کرنے کے لیے راضی نہ تھے۔ وہ علما کے جمود سے نالاں تھے وہ ایسے علما تیار کرنا چاہتے تھے جو دینی معلومات کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی فن میں ماہر ہو اور تقاضائے زمانہ کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے بھی باخبر اور واقف ہو بلکہ اس کو فن پر دسترس حاصل ہو۔

شبلی نعمانی نے مرد وخواتین کو وہ تمام علوم حاصل کرنے کی وکالت کی ہے اور پردے کا اہتمام ضروری بتایا ہے لیکن مخلوط تعلیم کے سخت مخالف بھی تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی تعلیم کا کیمپس بھی علاحدہ ہو۔ تعلیم کے معاملے میں لڑکے اور لڑکیوں میں کسی طرح کی تفریق کے خلاف تھے اور یہاں تک کہ نصاب بھی دونوں کے لیے یکساں ہو۔ دونوں

کے لیے الگ الگ نصاب اور کورس کے سخت مخالف تھے۔شبلی نعمانی نے ایک خطاب میں فرمایا:

''عورتوں کو اس حد تک تعلیم دی جاسکتی ہے جس حد تک مردوں کو،اس لیے مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ لڑکیوں کے لیے الگ کورس ہو اور لڑکوں کے لیے الگ، میرے خیال میں دونوں کا نصاب تعلیم یکساں ہونا چاہیے۔'' 5

شبلی نعمانی نے دونوں طرح کے ادارے اور وہاں کے نصاب تعلیم کا جائزہ لیا اور خامیوں کو دور کرنے کے لیے نہ صرف اصلاح کا مشورہ دیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب بھی دریافت کیا اور بتایا کہ جدید تعلیم کا نقص یہ ہے کہ اس میں مذہبی اور قدیم تعلیم کا فقدان ہے اور قدیم تعلیم میں کمی یہ ہے کہ اس میں عصری علوم داخل نصاب نہیں جو معاشی ضرورت کو پورا کرسکے۔ ان اسکولوں میں مذہبی علوم پڑھائے جانے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہیں ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بقدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں........کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہوسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے۔ دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے۔'' 6

شبلی نعمانی نے قدیم وجدید تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی بہت زور دیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اگر ہم ہر جگہ اسلامی مدارس قائم نہیں کرسکتے تو بورڈنگ ہاؤس ضرور قائم کریں۔طلبہ کو اپنی نگرانی اور تربیت میں رکھیں کیوں کہ ان کی تربیت سے بہت کچھ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔تربیت سے طلبہ میں ایک طرح کی خود اعتمادی پیدا ہوگی جس کے اثرات سے ہم ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔اس کا عملی تجربہ بذات خود ندوۃ العلما لکھنؤ کے معتمدی کے دوران کیا۔اس تربیت کے نتیجے میں سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی اور عبد الباری ندوی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کی پود تیار ہوئی جو اپنے آپ میں بحر العلوم کی حیثیت رکھتے تھے۔شبلی نعمانی کے ان ہی شاگردوں نے ان کے باقی ماندہ تعلیمی وعلمی کام اور مشن کو آگے بڑھایا اور ان ہی کی محنت اور لگن سے شبلی نعمانی کی شخصیت ہند وپاک اور بلاد اسلامیہ میں بلند مقام حاصل کرسکی۔

شبلی نعمانی ہر علاحدہ علاحدہ مدرسہ اور کالج میں طلبہ کے لیے یکساں یونیفارم کے بھی قائل تھے اور ان کو خاص خاص موقعوں پر پہننا ضروری سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس سے طلبہ میں سلیقہ مندی، نفاست، اور انفرادی شناخت قائم ہوتی ہے نیز اس سے طلبہ میں مساوات اور قومیت کی روح ابھر کے سامنے آتی ہے۔مختلف مدارس کے معائنہ کے بعد شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ہمارے قومی کالج میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری اور نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ تمام طالب علموں کا لباس، وضع، خوراک، مکان، فرنیچر، کلیۃً ایک کردیا جائے اور جو مختلف سطحیں آج کالج میں قائم ہیں بالکل مٹادی جائیں، اگر یہ نہیں تو کالج میں قومیت کی روح نہیں۔'' 7

شبلی نعمانی نے نصاب میں انگریزی، ہندی اور سنسکرت، زبان بھی شامل کرنے کی حمایت کی ہے۔

مسلمانوں میں بھی طبقاتی عدم مساوات کافی بڑھا ہوا تھا جس سے صرف خاص خاص لوگ ہی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو پاتے تھے۔مفکرین تعلیم میں شبلی نعمانی ہی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے بلاتفریق مذہب وملت، امیر وغریب سب کے لیے یکساں تعلیم کی آواز بلند کی اور تعلیم کو اس کا بنیادی حق قرار دیا۔اس کی حمایت میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک دنیوی تعلیم (انگریزی تعلیم) کو اس قدر پھیلانا چاہیے کہ بچہ بچہ تعلیم یافتہ ہوجائے لیکن ساتھ ہی ہم کو مذہب کی حفاظت پر بھی اپنی تمام قوت صرف کردینی چاہیے۔'' 8

ندوۃ العلما لکھنؤ میں قیام کے دوران شبلی نعمانی نے قدیم وجدید تعلیم میں یکسانیت اور امتزاج پیدا کیا۔ نصاب تعلیم میں جو کتابیں یا مضامین قابل اصلاح تھیں اس کی اصلاح تقاضائے حال کے مطابق کی۔جدید عربی، انگریزی، سنسکرت، اور ہندی زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے نئے نئے شعبہ جات قائم کیے۔طلبہ کی اصلاح وتربیت کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا نظام بنایا۔فن پر مکمل دسترس حاصل کرنے کے لیے لکچر کا اہتمام کیا۔ متعدد مضامین اور مقالات کے ذریعے مسلمانوں کو دونوں طرح کی تعلیم کے حصول کی طرف راغب کیا اور یہ بتایا کہ مسلمانوں کی ترقی وکامیابی کا راز ان ہی دونوں تعلیم میں ہے۔ان میں سے اگر کسی ایک کی طرف سے بھی عدم توجہی برتی جائے گی تو وہ تباہ کن ہوگی اور اس سے نہ صرف ان کے عقائد متزلزل ہوں گے بلکہ وہ تقاضائے حال کا مقابلہ کرنے میں ناکام ثابت ہوں گے۔

''میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں، مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبے تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔'' 9

ارباب ندوۃ العلما لکھنؤ کے درمیان اختلافات بڑھ جانے کے سبب شبلی نعمانی کو معتمد تعلیم کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔اس کے بعد وہ اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ آگئے اور خود کے قائم کردہ 'نیشنل اسکول' کی سرپرستی کی جو اس وقت تک ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ مدرسۃ الاصلاح جس کی سرپرستی ان کو پہلے سے حاصل تھی۔

مختصر یہ کہ تعلیم وتربیت بشمول طریقہ تدریس اور نصاب تعلیم سے متعلق کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں شبلی نعمانی نے اپنی ذاتی رائے نہ دی ہو اور اصلاح کی جدو جہد نہ کی ہو، چاہے وہ علی گڑھ میں سرسید کے رفیق رہے ہوں یا وہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں معتمد تعلیم کے عہدے پر فائز رہے ہوں۔وہ ایک طویل مدت تک درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔اس دوران انھوں نے تعلیم وتربیت کے مختلف مراحل کا مشاہدہ کیا اور کالج ومدارس کے نصاب تعلیم کا مختلف زاویے سے جائزہ لیا ہے اور اس اہم موضوع پر علمی مباحث کا آغاز کیا۔تحقیق وتجزیہ کے بعد تعلیم وتربیت اور طریقہ تعلیم کی افادیت ونقائص کی نشاندہی کی اور اپنے مضامین اور مقالات کے ذریعے اصلاح کی تجاویز پیش کی۔قوم کی بھلائی وترقی کے لیے نیشنل اسکول، مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین کی شکل میں تعلیم وتربیت کی ایک ایسی عمارت تعمیر کردی جہاں شبلی نعمانی کے نظریہ تعلیم کی انفرادیت اس کی بقا تک قائم رہے گی۔

حوالہ جات

1 حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، 2015، ص 39-40
2 مقالات شبلی جلد 3، مرتب سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ 1955، ص 163
3 مکاتیب شبلی جلد اول، مرتب سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2010، ص 16
4 خطبات شبلی مرتب سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2008، ص 87
5 ایضاً، ص 167
6 مقالات شبلی جلد 3 مرتب سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ 1955، ص 141
7 سفرنامہ روم ومصر وشام، شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2015، ص 62
8 مقالات شبلی جلد 8، مرتب سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ 1972، ص 4
9 سفرنامہ روم ومصر وشام، شبلی نعمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ 2015، ص 165

Aftab Alam Azmi
M M K Degree College
Mangrawan
Azamgarh - 276205 (UP)
Mob.:9452411642

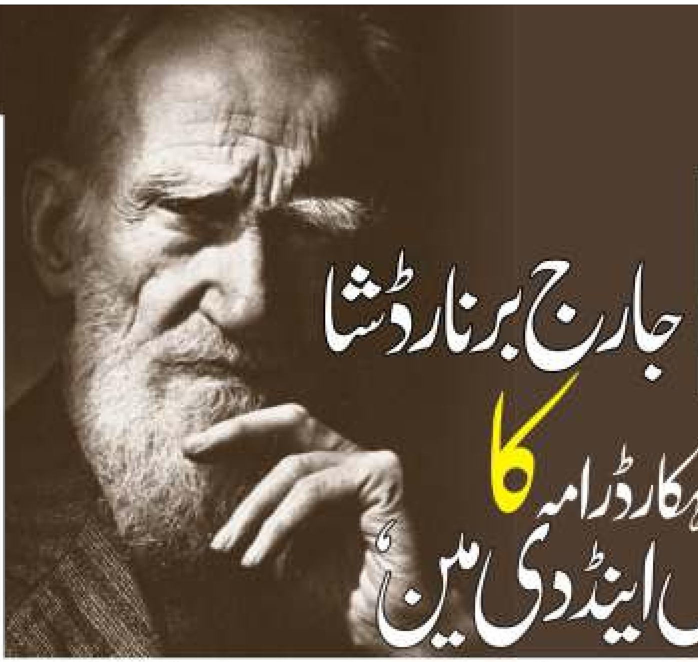

محبوب حسن

جارج برنارڈ شا کا شاہکار ڈرامہ 'آرمس اینڈ دی مین'

نوبل انعام یافتہ جارج برنارڈ شا عالمی ادبیات کا نہایت محترم نام ہے۔ ولیم شیکسپیئر کے بعد انگریزی ڈرامے کی روایت کو پروان چڑھانے والے قلم کاروں میں جارج برنارڈ شا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی پیدائش 26/ جولائی 1856 میں ڈبلن، آئرلینڈ میں ہوئی۔ ان کے والد شراب کی لت میں بری طرح مبتلا تھے۔ ان کی والدہ نہایت مہذب اور ذمے دار عورت تھیں جنھوں نے برنارڈ شا کو اپنے شوہر سے دور رکھا تا کہ بیٹے پر شراب نوشی کا برا اثر نہ پڑے۔ جارج برنارڈ شا کی والدہ نے ان کی تعلیم و تربیت اور ذہنی پرورش پر خصوصی توجہ صرف کی۔ وہ بچپن سے ہی نہایت ذہین تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مس کیرولین نامی استانی سے حاصل کی۔ اپنے والد کی غیر ذمے دارانہ حرکتوں کے سبب انھیں مالی دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ان ناموافق حالات کی وجہ سے ان کی ابتدائی زندگی مشکلات سے دوچار رہی۔ 2/ نومبر 1950 کو یہ ادیب اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا۔

جارج برنارڈ شا کو زندگی کے ابتدائی دور سے ہی علمی، ادبی اور تہذیبی اقدار و روایات سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنی اس ادبی تشنگی کی تسکین کے لیے انھیں لندن آنا پڑا، جہاں ان کا ادبی ذوق رفتہ رفتہ نکھرتا گیا۔ لندن جیسے ادبی مرکز میں بطور ادیب اور ڈرامہ نگار اپنی شناخت قائم کرنے میں انھیں شدید جدوجہد سے گزرنا پڑا۔ انھوں نے ادب کو پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا۔ ادب سے اپنی اس خاص دلچسپی کا سبب بیان کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے کہ ''روزی روٹی کے لیے ادب کو اختیار کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قارئین ادیب کو دیکھتے نہیں بلکہ اس کی تحریریں پڑھتے ہیں۔ اس لیے اچھی پوشاک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر، تاجر، وکیل اور فن کار بننے کے لیے اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ ادب ہی ایک ایسا مہذب پیشہ ہے، جس کی اپنی کوئی مخصوص پوشاک نہیں۔ اس لیے میں نے اس پیشے کا انتخاب کیا۔'' جارج برنارڈ شا کی مذکورہ باتوں سے ان کے ادبی مزاج اور فکری میلان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

جارج برنارڈ شا کو بچپن سے کتب بینی کا شوق تھا۔ انھوں نے ابتدائی عمر میں ہی عالمی ادبیات کا بغور مطالعہ کر لیا تھا۔ جارج برنارڈ شا کی شخصیت بے حد پہلودار اور ہمہ جہت تھی۔ انہوں نے ڈرامہ، ناول، تنقید اور سیاست کے میدان میں اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں انھوں نے "Immaturity""Irrational Knot""Love Among the Artist""An Unsocial Socialist" جیسے ناول تخلیق کیے لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جی بی شا کا پہلا ناول ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ ابتدا میں ہی انھیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ناول نگاری کی دنیا میں ان کا چراغ روشن نہ ہو سکے گا۔ اس لیے وہ جلد ہی ڈرامہ نگاری کی جانب راغب ہو گئے۔ برناڈ شا کی ڈرامہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہوا۔ ان کا پہلا ڈرامہ "Widower's Houses" 1882 میں منظر عام پر آیا۔ اس ڈرامے کو اسٹیج پر پیش بھی کیا گیا۔ جارج برنارڈ شا کا یہ پہلا ڈرامہ در اصل ان کی تخلیقی زندگی کا ایک ایسا موڑ ہے، جہاں سے شہرت اور کامیابی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ان کے دوسرے اہم ڈراموں میں "Arms and the Man""Candida""Man and Superman""The Philanderer""Man and Dstiny""Mrs. Warren's Proffession""The Apple Cart""The Dostor's Dillema""Heartbreak House""The Saint Joan""Devil's Disciple" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں بیشتر ڈرامے لندن، امریکہ، جرمنی، روس اور آسٹریا جیسے ممالک میں اسٹیج کیے گئے۔ ان کی بے پناہ تخلیقی عظمت کے پیش نظر سویڈیش اکادمی نے انھیں ادب کے نوبل انعام سے نوازا۔ انعام کے پیسوں سے انہوں نے "Anglo Swedish Literary Foundation" جیسا اہم ادبی ادارہ قائم کیا۔

ڈرامہ "Arms and the Man" جارج برنارڈ شا کی شاہکار تخلیق ہے۔ ''آرمس اینڈ دی مین'' 1894 میں منظر عام پر آیا جو تین ابواب پر مشتمل رومانی اور طربیہ قسم کی تخلیق ہے، جسے "Anti War Play" یا "Problem Play" بھی کہا جاتا ہے۔ "Problem Play" ڈرامے کی ایک ایسی قسم ہے، جس میں متعلقہ عہد کے سنجیدہ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مسائل کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس نوع کے ڈراموں کا آغاز انیسویں صدی میں انگلینڈ میں ہوا۔ جارج برنارڈ شا کے بیشتر ڈراموں میں یہ خوبیاں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے خیالی اور تصوراتی دنیا سے قطع نظر اپنے دور کے سلگتے ہوئے حالات و مسائل کو کلیدی اہمیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ جارج برنارڈ شا ایک حقیقت پسند قلم کار کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جارج برنارڈ شا نہایت پرآشوب دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس عہد میں عالمی سطح پر کئی جنگیں ہوئیں۔ سماجی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی اعتبار سے دنیا ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ جارج برنارڈ شا نے ایسی غیر معمولی تبدیلیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ جنگ و جدال، قتل و خون، ظلم و استحصال اور سسکتی ہوئی انسانی قدروں نے انھیں شدید طور پر متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے بیشتر ڈراموں میں جنگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کی تخلیقات میں غیر انسانی حرکتوں کے خلاف محبت اور امن و آشتی کا پیغام موجود ہے۔ انھوں نے اپنے کرداروں کے توسط سے طبقاتی کشمکش کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا شاہکار ڈرامہ "Arms and the Man" اس کی عمدہ مثال ہے۔ جارج برنارڈ شا نے اپنے اس ڈرامے میں بلغاریہ اور آسٹریا کے درمیان ہونے والی عالمی جنگ کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ڈرامے کا عنوان بھی اس جانب اشارہ کرتا ہے۔

جارج برنارڈ شا انگریزی زبان و ادب کی دنیا میں ایک روایت شکن تخلیق کار کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ جدت پسند تخلیقی مزاج کے مالک جارج برنارڈ شا نے اپنے تخلیقی امتیازات سے انگریزی ڈرامے کی روایت کو فکر و فن کی نئی بلندیوں سے ہم کنار کیا۔ موصوف نے

اپنے پیش روڈرامہ نگاروں کی تخلیقی روایات کویکسر نظرانداز نہیں کیا بلکہ اسے نت نئی جہتوں سے آشنا کیا۔طربیہ ڈرامہ "Arms and the Man" ان کی جدت پسندی کی عمدہ مثال ہے۔تین حصوں پر مشتمل ڈرامہ ''آرمس اینڈ دی مین'' اپنی موضوعاتی وابستگی اور تکنیکی انفرادیت کے سبب قارئین/ناقدین کی توجہ کا مرکز بنا۔مغربی نقادوں اوردانشوروں کے درمیان ان کی اس تخلیقی کاوش کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ ڈرامہ پلاٹ،کردارنگاری، مکالمہ نگاری، زبان و بیان اور اسلوب کے اعتبار سے خوبصورت فن پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔جارج برنارڈ شانے پلاٹ میں تجسس اور دلچسپی کے عناصر پیدا کرنے کی غرض سے کشمکش/تصادم سے کام لیا ہے۔مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔حسب ضرورت طنزومزاح کے رنگ بھی ہیں۔اس ڈرامے کے اہم کرداروں میں بلنٹشلی، رینا،سرجیس،میجر میٹکاف،کیتھرین اورلوکا، پلاٹ کی ترنگوں پر ہچکولے کھاتے نظرآتے ہیں۔بلنٹشلی اور رینا ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں۔میجر میٹکاف ہیروئن رینا کے والد اورکیتھرین ماں ہیں۔لوکا رینا کے گھر میں نوکرانی ہے۔

ڈرامے کا آغاز ہیروئن رینا کی خواب گاہ سے ہوتا ہے۔ہیروئن رینا اپنی بالکونی پرتنہا بیٹھے بیٹھے رات کی رومانی فضامیں کھوئی ہوئی ہے۔ڈرامے کی ہیروئن رینا کی ماں کیتھرین تیز تیز قدموں سے چل کراس کی خواب گاہ میں داخل ہوتی ہیں۔وہ اسے خوش خبری سناتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اس کے منگیتر سرجیس نے اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کر لی ہے۔اس خبر سے ماں بیٹی بے حد جذباتی ہو جاتی ہیں۔تبھی اچانک گلیوں میں گولیوں کی آوازیں سنائی پڑتی ہیں۔رینااور نوکرانی لوکا تیزی سے کھڑکیاں بند کرتی ہیں۔رینا بلب بجھا کر اپنے بستر پر لیٹ جاتی ہے۔اسی درمیان بلنٹشلی نامی سربیا کا ایک فوجی افسر ہاتھ میں پستول لیے اس کی خواب گاہ میں چپکے سے داخل ہوتا ہے۔اسے دیکھ کر رینا گھبرا جاتی ہے لیکن بلنٹشلی کی منت سماجت پروہ اسے پردے کے پیچھے چھپا دیتی ہے۔بلنٹشلی کی تلاش میں روسی فوج کا ایک افسر رینا کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اورخالی ہاتھ واپس لوٹ جاتا ہے۔نوکرانی لوکا یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے۔تھوڑی دیر بعد بلنٹشلی پردے سے باہر آتا ہے اور رینا سے اپنی حقیقت ظاہر کرتا ہے۔بلنٹشلی رینا سے بتاتا ہے کہ میں آسٹریا اور سربیا کا نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ کا پیشہ ور فوجی ہوں۔میرے پستول میں گولیاں نہیں تھیں۔وہ کہتا ہے کہ'' جنگ میں گولیاں بےکار ہوتی ہیں۔میں ہمیشہ کارتوس کی جگہ چاکلیٹ رکھتا ہوں۔''رینااس کی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے اور اسے چاکلیٹ کا ڈبا تھما دیتی ہے۔بلنٹشلی چاکلیٹ کھا کر اسے ڈبا لوٹا دیتا ہے۔رینا اور بلنٹشلی کے درمیان فوج اور جنگ کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔رینا بلنٹشلی سے کہتی ہے کہ ہمارے فوجی ایسے بالکل نہیں ہیں۔بلنٹشلی اس کے فوجیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ بیوقوف اور ناتجربہ کار ہیں۔دوران گفتگو رینا اسے اپنے منگیتر سرجیس کی تصویر دکھاتی ہے۔تصویر دیکھتے ہی بلنٹشلی اسے پہچان لیتا ہے۔بلنٹشلی سرجیس پرطنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نے دھوکے سے فتح حاصل کی ہے۔رینا کو اپنے منگیتر سرجیس کی تذلیل بالکل پسند نہیں۔رینا اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔اس لیے وہ بلنٹشلی کی باتوں سے ناراض ہوتی ہے۔لیکن وہ بلنٹشلی کی میزبانی اور خاطرتواضع میں کوئی کمی نہیں کرتی۔رینا بلنٹشلی کو Chocolate "Cream Soldier" کہہ کرپکارتی ہے۔

ڈرامے کے دوسرے باب کا آغاز میجر میٹکاف کے باغ میں ہوتا ہے۔میجر میٹکاف ڈرامے کی ہیروئن رینا کے والد ہیں۔وہ جنگ سے واپس ہوتے ہیں۔میجر میٹکاف اپنی بیوی کیتھرین سے جنگ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔صلح کی بات سن کرکیتھرین کوذرا بھی خوشی نہیں ہوتی۔ان کی خواہش تھی کہ جنگ کے ذریعے سربیا پر اختیار حاصل کیا جائے۔ٹھیک اسی درمیان سرجیس کی آمد ہوتی ہے۔کیتھرین محبت آمیز انداز میں اس کا استقبال کرتی ہیں۔انھیں اپنے ہونے والے داماد سرجیس پر ناز ہوتا ہے۔سرجیس اداس اداس نظرآتا ہے۔کیتھرین اداسی کی وجہ پوچھتی ہیں تو وہ بتاتا ہے کہ غلط طریقے سے جنگ جیتنے کی وجہ سے اس کا پرموشن نہ ہوسکا۔اس لیے اس نے استعفا دے دیا ہے۔بلنٹشلی کا جنگ سے بھاگ نکلنے کے متعلق بھی باتیں ہوتی ہیں۔اسی درمیان ہیروئن رینا اور سرجیس ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں۔دونوں میں پیارمحبت بھری باتیں ہوتی ہیں۔ڈرامے میں جگہ جگہ داخلی کشمکش/تصادم بھی نظرآتا ہے۔نوکرانی لوکا سرجیس اوررینا کے درمیان دراڑیں ڈالنے کی کوشش کرتی ہے اور کامیاب بھی ہوتی ہے۔لوکا سرجیس سے بلنٹشلی اور رینا کی ملاقات کا ذکر کرتی ہے۔وہ سرجیس سے کہتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔سرجیس نوکرانی لوکا کی باتوں پراعتبار کرلیتا ہے۔وہ اب لوکا میں دلچسپی لیتا ہے۔ان چاروں کرداروں کے درمیان غضب کی رقابتیں چلتی ہیں۔

جارج برنارڈ شانے واقعات وکردار کی تشکیل میں فنی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ڈرامے کے کرداروں کی آپسی کشمکش اوررقابت سے پلاٹ میں تجسس کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔جارج برنارڈ شانے کرداروں کے حرکت وعمل سے جگہ جگہ طنزیہ ومزاحیہ فضا تخلیق کی ہے۔ان کے بیشتر کرداروں کے قول وعمل میں تضاد نظرآتا ہے۔ہیروئن رینا اپنے منگیتر سرجیس کو چھوڑ کر بلنٹشلی سے شادی کرلیتی ہے جبکہ سرجیس کی زندگی کی ڈور نوکرانی لوکا سے جڑ جاتی ہے۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس ڈرامے کا بنیادی موضوع عشق،محبت اور جنگ ہے۔جارج برنارڈ شا نے پلاٹ اور کرداروں کا تانا بانا عشق اور جنگ کے توسط سے ہی بنا ہے۔ڈرامہ نگار نے اس ڈرامے کے ذریعے محبت اور جنگ کوفلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ظاہر ہے کہ ان کا تعلق نہایت پرآشوب دور سے رہا ہے۔انہوں عالمی جنگوں کے الم ناک نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس لیے انھوں نے اپنی بیشتر تخلیقات میں جنگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ان کا خیال ہے کہ گولیاں انسانی دکھ درد کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔انسانی خوشیوں اورامیدوں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔جارج برنارڈ شا محبت کے ترانوں میں زندگی کی خوشحالی اور کامیابی تلاش کرتے ہیں۔انھیں عشق کا افلاطونی نظریہ اور شدید جذباتیت پسند نہیں۔بلکہ ان کے یہاں ایک نوع کی متانت اور سنجیدگی نظرآتی ہے۔اس لیے ان کے کردار جنگ سے گھبراتے ہیں اور محبت کی گھنی چھاؤں میں پناہ لیتے ہیں۔ڈرامے کا ہیرو بلنٹشلی اس کی عمدہ مثال ہے۔جارج برنارڈ شا ایک حقیقت نگار ادیب ہیں۔وہ زندگی کی سچائیوں سے آنکھ نہیں چراتے۔انھوں نے انسانی سماج کو طبقاتی کشمکش کے برعکس مثبت اورصالح قدروں کا پیغام دیا ہے۔لوکا نوکرانی ہے جبکہ سرجیس کا تعلق سماج کے اعلی طبقے سے ہے لیکن دونوں رشتہ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں۔

روایت شکن مغربی قلم کار جارج برناڈ شا نے انگریزی ڈرامے کی دنیا کوفکروفن کی نئی راہوں پر گامزن کیا۔جارج برنارڈ شا کے ڈراموں میں ان کی تخلیقی جدت پسندی اورفکری انفرادیت آشکارا ہے۔"Arms and the Man" انگریزی زبان وادب کا ایک لافانی فن پارہ ہے۔معروف مغربی نقاد George Orwell نے' آرمس اینڈ دی مین' کو جارج برناڈ شا کے فن کی معراج قرار دیتے ہوئے لکھا ہے "Arms and the man was written when Shaw was at the height of his powers as a dramatist." یہ ڈرامہ ہمیں انسانی زندگی کے فلسفیانہ شعور اور نفسیاتی آگہی سے آشنا کرتا ہے۔اس ڈرامے سے جارج برناڈ شا کی تخلیقی تہہ داری،فکری ہمہ جہتی اورفنی باریک بینی کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔

■

Dr Mahboob Hasan
Asst. Professor, Department of Urdu
Deen Dayal Upadhyay Gorakhpur
University, Gorakhpur- 273009 (UP)
Mob.:8527818385

جن کتابوں نے متاثر کیا

راحت علی صدیقی

کتاب کا عشق وہ حسین اور قیمتی جوہر ہے، جو انسان کے لیے فرحت وسکون کا باعث ہے، اس کے خیالات کو وسعت بخشتا ہے افکار میں تنوع پیدا کرتا ہے، گفتگو میں وقار، تحریر میں شوخی و شگفتگی کا سبب بنتا ہے اور علمی دنیا میں وقار و اعتبار کا سبب ہوتا ہے، کتابوں کا عشق انسان کے لیے تنہائی سے تحفظ کا اہم ترین ذریعہ ہے، کتابوں کا عاشق مطالعے میں ہی شب و روز بسر کرتا ہے، کتابیں ہی اس کے لیے جائے پناہ ہوتی ہیں، جون ایلیا کی نظم رمز بھی کتابوں کے عشق کی صورت حال کو بڑی خوبی سے تعبیر کرتی ہے، بڑی بڑی مشکلیں اذیتیں مطالعے کے وقت ذہن و دماغ سے دور ہو جاتی ہیں، جیسے انسان محبوب کو لمحہ بھر دیکھ کر قرار حاصل کرتا ہے، اسی طرح کتاب کا دیدار بھی باعث قرار ہوتا ہے، علامہ اقبال کہتے ہیں۔

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

حالانکہ کتابوں کا حسن بھی کم نہیں ہے، لیکن کتاب کا عشق ہر کسی کو میسر نہیں ہوتا، اس کے خصائص وخوبیاں ہر شخص پر ظاہر نہیں ہوتیں، وہ قسمت والے ہوتے ہیں، جنھیں یہ نعمت مترقبہ حاصل ہوتی ہے، کچھ کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کے دل میں کتابوں کی محبت کا بیج بو دیتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ یہ بیج جڑ پکڑنے لگتا ہے، اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس کی جڑیں پورے قلب کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں، ایسی ہی کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع مجھے بھی حاصل ہوا ہے، جن سے کتاب کی وقعت دل میں پیدا ہوگئی، اور عشق کتاب کی وقعت کا احساس ہوا، ان کتابوں میں سے اگر شعری کتابوں کا تذکرہ کروں تو احمد فراز کی کلیات کا مطالعہ ہے، جس نے شعری مجموعوں کے ساتھ ساتھ نثری کتابوں کے مطالعے سے بھی قریب کیا، احمد فراز نے جس خوبی سے اشعار میں اپنے جذبات واحساسات کو پیش کیا ہے، اس کا مطالعہ حیرت واستعجاب میں مبتلا کرتا ہے، عشق ومحبت کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، محبوب کی نزاکتوں کا نقشہ کھینچتے ہیں، تو امیجری کے بادشاہ معلوم ہوتے ہیں، رومانی موضوعات کو اختیار کرتے ہیں، تو شاعر رومان محسوس ہونے لگتے ہیں، انقلابی اور سیاسی نظمیں کہتے ہیں، تو رنگ ہی مختلف ہوتا ہے، اور جوش وولولہ قلب میں پیدا کر دیتے ہیں اور شاعر انقلاب محسوس ہونے لگتے ہیں، ہر رنگ اور ہر موضوع میں کمال، پڑھنے بیٹھیے تو دل کرتا ہے ختم کر کے ہی اٹھیے۔ اگر محبوب کی خوبیوں وخصائص پر مشتمل غزل ''سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں'' پڑھیے تو رنگ ہی جدا پائیے اور محبوب میں کیا کیا خوبیاں ہوسکتی ہیں، اس کا دلکش تذکرہ پڑھ لیجیے، مجھ سے پہلے، واپسی، مت قتل کرو آوازوں کو، بن باس کی شام، ہر نظم کا تاثر قلب پر نمایاں تھا، موضوعات مختلف مگر شدت ہر رنگ کی تکمیل کرتی ہوئی، کلیات فراز کی تکمیل کے بغیر دل کو سکون میسر نہیں ہوا، ایک زمانہ ایسا تھا جب مہینوں کلیات احمد فراز تکیہ کے نیچے ہوتی تھی، اور دن تھے سراجی، در مختار، اشباہ پڑھنے کے مگر دل تھا کہ کلیات احمد فراز پر آ گیا تھا، فیض کے اشعار سنے تو ان کی شاعری کی جانب طبیعت مائل ہوئی، اور نسخہ ہائے وفا سے رشتہ وفا استوار ہوگیا، جس کے مطالعے نے اردو شاعری کے حسن سے ملاقات کرادی، جہاں محبت کے دائروں کی وسعت کا اندازہ ہوا محبوب وطن بھی ہوسکتا ہے، انسانیت کی محبت میں بھی دل دھڑک اٹھتا ہے، اور اس قدر کہ شاعر محبوب کو بھی پہلی سی محبت کرنے پر قادر نہیں ہے، 'مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ' 'رقیب سے' 'نثار میں تیری گلیوں کے' 'میرے ہمدم میرے دوست' بہت سی نظموں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے، جن کو نثری کتابوں کی جانب طبیعت مائل ہوئی، زبان وبیان کی خوبیوں سے واقف ہونے کا دل چاہا، بیانیہ کی قوت وطاقت کو دیکھنا چاہا، تو بشری رحمن کے ناول لگن کا مطالعہ کیا، 700 سے زائد صفحات کا یہ ناول تین چار دن میں پایۂ تکمیل کو پہنچا کہانی لاجواب زبان دلکش کرداروں نے متاثر و مانوس کردیا، دیوانگی سی ہوگئی، مطالعہ مکمل کیجیے تو بھی اس کے کرداروں کی صورت حال ذہن ودل کو گرفت میں لیے رہتی ہے، جلدی سے مکمل کیا، اور کئی دنوں بعد اس کے تاثر سے آزادی پائی، اس کے بعد کئی ناولوں کا مطالعہ کیا، جو نصاب میں شامل تھے، لیکن ناولوں کی طوالت کے باعث ناولوں کی دنیا میں زیادہ دل نہیں لگا، البتہ دل چاہتا تھا، اب بھی چاہتا ہے، اسلوب پختہ ہو، نثر شگفتہ ہو، بہتر سے بہتر لکھ سکوں، انفرادیت کا حامل اسلوب ہو، استاذ محترم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب نے مشورہ دیا کہ عبدالماجد دریابادی، شورش کاشمیری اور رشید احمد صدیقی کی کتابوں کا مطالعہ کرڈالو، تحریر میں پختگی اور حسن کا باعث ہوگا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی کا مطالعہ کیا، اس کے اسلوب زبان وبیان کی تعریف ادب کا ہر طالب کرتا ہے، سادہ وشگفتہ نثر انداز بیان دلکش، ان کی زندگی کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا، جیسے ہم ان کے ساتھ ہیں، اور ان لمحات کو جی رہے ہیں، کہیں مسکراہٹ لبوں پر کھیلنے لگی، اور کہیں درد وغم آنکھوں میں اتر آئے، سفر حجاز کا مطالعہ کیا، جس سے مقام مقدس کی سیر کرنے کا موقع ملا، لفظوں سے مولانا نے ایسی تعریفیں کیں ہیں، جن کو پڑھ کر شنیدہ دیدہ بن جاتا ہے، اور حج پر جانے کی اور روضۂ رسول کو دیکھنے کی حسرت اور قلب کو بے چین کر دیتی ہے، معاصرین کا مطالعہ کیا، جس کے بعد خاکے پر مشتمل کتابوں سے انسیت ہوگئی، اور خاکہ نگاری کا شوق دل میں شدت کے ساتھ پیدا ہوا، اور دل چاہا کہ کچھ لوگوں سے تعلقات بنائے جائیں، تاکہ بعد میں ان کے خاکے لکھے جاسکیں، دل تو دل ہے جانے کیا کیا خیالات اس پر وارد ہوتے، بہرحال مولانا عبدالماجد دریابادی نے جس خوبی سے اس کتاب میں شخصیات کے خاکے تحریر کیے ہیں، ان کی خوبیاں وخصائص ذکر کیے ہیں، اور وہ جملے جن میں ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے، پڑھ کر آنکھیں کھلی رہ گئیں، مشکل الفاظ وتعبیرات نہیں سادہ الفاظ ہیں، دل چاہا کہ خاکوں کی کچھ اور کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، جس سے اس صنف کے طریقوں کو سمجھا جاسکے۔

شورش کاشمیری کا نام خاکہ نگاری کا معتبر نام ہے، ان کا اسلوب انتہائی وقیع ہے، ان کی کتاب نورتن پڑھی، لاہور کے نو اہم ترین صحافیوں کے خاکوں پر مشتمل ہے، ان صحافیوں کے کمالات بیان کیے گئے ہیں، ان کی محنت و مشقت سے آگاہ کیا گیا ہے، ان کے چال ڈھال چہرے مہرے کی دلکش تصویریں بنائی گئی ہیں، اسی کے ضمن میں لاہور کی ادبی تاریخ کے اہم پہلو ادبا کی چشمکیں ذکر کی گئیں ہیں، لاہور کے سیاسی احوال کو واضح کیا گیا ہے، صحافت اور سیاست دونوں میں قدیم ترین رشتہ ہے، لہٰذا صحافیوں کے تذکرے میں سیاست کا تذکرہ شامل ہونا قرین قیاس ہے، جو نورتن میں بخوبی کیا گیا ہے، کتاب مختصر ہے، لیکن معلومات کے اعتبار سے وقیع ہے، اور نثر بلا کی خوبصورت ہے جملے پرشکوہ ہیں، الفاظ وقیع ہیں، مطالعہ کیجیے اور شورش کی نثر نگاری کے مداح ہو جایئے۔

'او کھے اولڑ ھے' ممتاز مفتی کی وہ کتاب ہے، جو میری پسندیدہ کتابوں میں سرفہرست ہے، خاکوں پر مشتمل کتاب ہے، جس میں ممتاز مفتی نے چند شخصیات کے خاکے لکھے ہیں، جن میں ڈاکٹر انور سدید، اشفاق احمد، مسعود قریشی، شبنم شکیل، پروین شاکر، نیلوفر اقبال جیسی اہم شخصیات کے خاکے شامل ہیں، ممتاز مفتی کی زبان و بیان بہت دلچسپ ہے، تکلف تصنع دور دور بھی ان کے یہاں نظر نہیں آتا ہے، ان کا اسلوب انفرادیت کا حامل ہے، وہ کسی دوسرے کے مقلد نہیں ہیں، اور نا ہی کوئی دوسرا ان کے اسلوب کی پیروی کر سکتا ہے، ان کی زبان کی دلکشی یہی ہے، کہ وہ نیچرل ہے، اس میں کسی طرح کی ملاوٹ نظر نہیں آتی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے بے ساختہ جملے رقم کر دیے گئے ہوں، بے تکلفی کا عالم یہ ہے کہ کہیں کہیں پنجابی اور انگلش کے الفاظ بیساختہ ان کے جملوں میں آگئے ہیں، یا بعض کہاوتیں اور جملے ہی ان زبانوں کے انھوں نے بے تکلف استعمال کیے ہیں، ایسا لگتا جیسے اول مرحلے میں جو تصور ان کے ذہن پر ابھرتا ہے، اسے زبان عطا کر دی گئی ہے، اس میں تکلف و تصنع کا تڑکا لگانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی، جو او کھے اولڑ ھے کو پڑھتے ہوئے سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے، اور کتاب کے بعض جملوں کو کئی کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے، جس انداز سے ممتاز مفتی بات کہتے ہیں، وہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی بلندی کا احساس کراتا ہے، ہر جملہ ایک نیا مزہ دیتا ہے، ہر بات ایک نئے طرز کی ہوتی ہے، جیسے کوئی پہلوان کشتی کے میدان میں داؤ آزماتا ہے، کچھ اسی طرح ممتاز مفتی اپنی معلومات اور واردات قلب کو نیا رنگ و آہنگ عطا کرتے ہیں، جس کا مشاہدہ 'او کھے اولڑ ھے' میں بخوبی ہو جاتا ہے، 'او کھے اولڑ ھے' کسی شاہکار سے کم نہیں ہے، مطالعہ کیجیے اور ممتاز مفتی کی نثر نگاری کے قائل ہو جایئے، صنف خاکہ نگاری کا وہ بیش قیمتی ہیرا جسے جوہریوں نے پرکھا بھی ہے، اور اس کی قدر و منزلت کو واضح بھی کیا ہے، حالانکہ مجھے لگتا ہے جس مقام اور توجہ کی مستحق 'او کھے اولڑ ھے' ہے، اسے وہ نصیب نہیں ہوا، ممکن ہے یہ میرا تاثر ہو، اور میرے عشق پر مبنی ہو، لیکن مجھے حقیقت لگتا ہے، جو بھی خاکوں پر مشتمل کتابوں کے مطالعے کا یہ سفر جاری رہا، اور ممتاز مفتی کی کتابوں کے مطالعے کے بعد دہلی کتاب میلے میں مجتبیٰ حسین کی کتابوں پر نظر پڑی۔ اب 'آدمی نامہ' کا مطالعہ شروع کیا، مسکراہٹ لبوں پر ناچتی رہی، خاکے مکمل ہوتے ہو گئے، شخصیات کے تذکرے اور ان سے متعلق واقعات میں جس طرح مزاح پیدا کیا گیا ہے، وہ آدمی نامہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، جب کسی شخصیت کی تعریف کرتے ہیں، اس کے لیے بھی ایسے جملے اور تشبیہات تخلیق کرتے ہیں، جن کو پڑھ کر ہر شخص مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے، واقعات کو ذکر کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ واقعات انھوں نے تخلیق کیے ہیں، ہر جملہ باعث مزاح ہوتا ہے، عادت و اطوار اس طور پر ذکر کرتے ہیں، کہ مزہ ہی آجاتا ہے، حلیہ ذکر کرتے ہیں، تو اس کا رنگ بھی نرالا ہوتا ہے، آدمی نامہ پندرہ خاکوں پر مشتمل ہے، مطالعہ کرنے بیٹھے تو مکمل کر کے ہی اٹھے، میں نے جب اس کو شروع کیا تو اسی دن مکمل کیا، اور خاکہ نگاری میں مجتبیٰ حسین کی وقعت دل پر ثبت ہو گئی، اس کے بعد مجتبیٰ حسین کے خاکوں پر مشتمل کتاب 'سو ہے وہ بھی آدمی' بھی پڑھی، اس میں بھی یہی رنگ نمایاں تھا، دل بیحد متاثر ہوا، ہلکے پھلکے جملے، سادہ اور آسان زبان میں مزاح پیدا کرتی تشبیہات ان کتابوں کو متاثر کن بناتی ہیں، اور دل کو ان کے مقام کا معترف کرتیں، مجھے لگتا ہے، ان کتابوں کا مطالعہ کرنے والا جہاں اہم معلومات حاصل کرے گا، وہیں اس کا ذہن تھکاوٹ کے بجائے فرحت محسوس کرے گا یہ میرا ذاتی تاثر اور تجربہ ہے، ہر شخص اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔

'میرے عہد کے لوگ' نسیم اختر شاہ قیصر کے خاکوں کا مجموعہ ہے، جس میں 31 خاکے شامل ہیں، یہ کتاب مذہبی علمی ادبی شخصیات کے خاکوں کا حسین امتزاج ہے، اس میں حفیظ میرٹھی، عامر عثمانی، علامہ انور صابری جیسے ادبا کے خاکے شامل ہیں، وہیں قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر، مولانا سید انظر شاہ مسعودی اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، جیسے علما و ادبا کے خاکے بھی شامل ہیں، اسلوب نگارش انتہائی دلکش و دیدہ زیب ہے، عبارت سلیس اور جاذب، مطالعہ کیجیے تو کرتے جایئے روانی کا عالم یہ جیسے بہے جا رہے ہوں، اس کتاب نے مجھے بہت متاثر کیا، ہر ہر جملہ خوبصورت اور دلکش ہے، کئی مرتبہ اس کتاب کا مطالعہ کیا، اور قلب اس کی خوبیوں کا معترف ہوتا ہو گیا۔

> مذکورہ بالا کتابوں کا مطالعہ انسان کے قلب کو کتابوں کے عشق میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے' بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں ان کتابوں میں سے کسی ایک کا مطالعہ بھی کتابوں سے عشق کا باب کھول سکتا ہے' اور پھر آدمی کی حسرت کچھ اس طرح ہو گی - 'قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو' کتابیں ہی زیست کا حاصل نظر آئیں گی' مطالعے کی وادی میں اتر کر دیکھیے'

خاکوں پر مشتمل کتابوں کے تذکرے میں ایک بہت زیادہ پسندیدہ کتاب کا تذکرہ چھوٹ گیا، جس شخص نے بھی اس کتاب کو پڑھا ہوگا، میرا دعوی ہے، اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہوگا، یہ کتاب جہان دانش ہے، مشہور شاعر احسان دانش کی خودنوشت سوانح حیات جس کو پڑھتے ہوئے، ان کے احوال آبدیدہ کرتے ہیں، اور جب مطالعہ آگے بڑھتا تو حوصلہ پیدا ہوتا ہے، اور یقین ہوتا ہے کہ انسان محنت کے دم پر کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے، اور اگر ان کی نثر پر غور کریں، تشبیہات و تمثیلات کا حسین امتزاج ہر جملہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے، دل اس کے مطالعے سے بے پناہ متاثر ہوا، اور احسان دانش کی زندگی خیالات میں تصویروں کی مانند گردش کرتی رہی۔

مذکورہ بالا کتابوں کا مطالعہ انسان کے قلب کو کتابوں کے عشق میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہے، بلا مبالغہ یہ کہہ سکتا ہوں ان کتابوں میں سے کسی ایک کا مطالعہ بھی کتابوں سے عشق کا باب کھول سکتا ہے، اور پھر آدمی کی حسرت کچھ اس طرح ہوگی۔ 'قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو' کتابیں ہی زیست کا حاصل نظر آئیں گی، مطالعے کی وادی میں اتر کر دیکھیے، اور خود ان دعووں کے معترف ہو جایئے۔

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے وہ سب افسانہ ہے

■

Rahat Ali Siddiqui
Village Mohammad Pur Mafi
Post Office: Khatauli
District: Muzaffar Nagar - 251201 (UP)
Mob.:9557942062

شازلی حسن خان

ماحولیاتی انحطاط اور قابل بقا ترقی

تمہید: موجودہ دور میں تیزی سے بڑھتی آبادی کے سبب خوراک کا مہیا کرنا دنیا کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے نے سب ہی ملکوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ سبھی کو غذا، مکان اور دیگر اشیا کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم نے ترقی کا جو طرز اپنا رکھا ہے اس میں ماحولیات کے پہلوؤں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم نے قدرتی وسائل جیسے، پانی، جنگلات، توانائی وغیرہ کا استعمال غیر ضروری کیا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ بہت سے وسائل قابل تجدید (Renewable) نہیں ہیں۔ قدرتی وسائل کو کافی حد تک ہم نے آلودہ بھی کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم قابل بقا ترقی کے لائق نہیں رہے۔

ماحولیاتی انحطاط: ہمارے اردگرد کے تمام عناصر اور اشیا ماحول کا حصہ ہیں۔ جاندار عناصر میں انسان، مویشی، پیڑ پودے، پرندے، کیڑے مکوڑے اور دوسرے خرد جاندار شامل ہیں۔ جب کہ بے جان عناصر کسی توانائی، ہوا، پانی، مٹی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ قدرتی ماحولیاتی عناصر کے علاوہ انسان کے بنائے ہوئے کارخانے، عمارتیں، سڑکیں، باغ وغیرہ بھی ماحول کا حصہ ہیں۔

قدرت نے ماحول کے مختلف عناصر میں ایک خاص توازن قائم کر رکھا ہے۔ لیکن یہ توازن انسانی سرگرمیوں اور بعض اوقات قدرتی آفات کی وجہ سے بگڑتا جا رہا ہے۔ اسی بگاڑ کو ماحولیاتی انحطاط کہتے ہیں۔ قدرتی وسائل میں کمی یا آلودگی سے انسان، جانور اور پیڑ پودے سب ہی منفی طور سے متاثر ہو رہے ہیں۔ UNO نے ماحولیاتی انحطاط، ماحول میں ایسی کمی کو کہا ہے جس کی وجہ سے سماجی اور ماحولیاتی تکمیل کی مقاصد کی امید کم ہو جائے۔

انسان نے جن مسائل کو خود پیدا کیا ہے ان کی تفصیل ذیل میں دی گئی ہے۔

I **جنگلات کی کٹائی**: انسانی آبادی بڑھنے سے انسان کو رہائش، صنعتی اور کھیتی کے لیے مزید زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے بہت سے جنگل صاف کر دیے گئے۔ لیکن اس حرکت سے انسان نے اپنے لیے نئے مسائل پیدا کر لیے۔

1 جنگلات کچھ حد تک موسم کو بھی اعتدال میں رکھتے ہیں۔ جنگل کے قرب و جوار کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا رہتا ہے۔ وسیع جنگلات کی وجہ سے بارش بھی کافی ہوتی ہے۔

2 جنگلات سے ہمیں کئی طرح کی جڑی بوٹیاں، شہد، گوند، عمارتی لکڑیاں وغیرہ ملتی ہیں۔

3 جنگلات جانوروں کے مسکن ہوتے ہیں۔ یہاں مختلف قسم کے درند و پرند، سانپ وغیرہ رہتے ہیں۔ جنگلات کی کٹائی سے بہت سے جانور اور پرندے ناپید (Extinct) ہو رہے ہیں۔ اکثر اوقات شیر، تیندوے، ہاتھی وغیرہ انسانی آبادی میں آکر جانی و مالی نقصان کرتے ہیں۔

4 بہت سے گھروں میں، بالخصوص دیہاتوں میں لوگ لکڑی کا ایندھن استعمال کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جنگل سے کاٹ کر لکڑیاں لاتے ہیں۔ جنگلات کا تو نقصان ہو ہی رہا ہے لیکن لکڑی کے جلانے سے دھواں پیدا ہوتا ہے اس سے خود لوگ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

II **دھول اور دھواں**: گھروں اور مختلف کارخانوں کی چمنیوں سے جو دھواں خارج ہوتا ہے اس سے ہماری فضا مستقل آلودہ ہو رہی ہے۔ اینٹوں کے بھٹے، وارنش اور کیڑے مار دواؤں کے کارخانے، کوئلے سے چلنے والے بجلی کے بھاری ٹرک اور دوسرے پٹرول و ڈیزل سے چلنے والے ذرائع نقل و حمل سے ہوا زہریلی ہوتی رہتی ہے۔

ہر سال کسان بھی فصلوں کو کاٹنے کے بعد ڈنٹھل، بھوسہ وغیرہ جلاتے ہیں۔ ان کی مقدار لاکھوں ٹن ہوتی ہے۔ اتر پردیش، دہلی، پنجاب اور ہریانہ میں یہ طریقہ عام ہے۔ اس کی وجہ سے فضا میں مضر دھواں سے آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ جس میں کاربن اور گندھک کے آکسائڈ شامل ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے 13 شہروں کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ آلودہ شہروں میں ہوتا ہے۔ ان میں دہلی، کولکتا اور کانپور شامل ہیں۔ یہ ہندوستان کا ہی مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے ممالک بھی اس مصیبت سے دوچار ہیں۔

فضا آلودگی کی وجہ سے انسان کئی بیماریوں کا شکار ہو رہا ہے۔ جس میں دمہ، خون کی کمی، نمونیہ، سرطان جیسی بیماریاں سرفہرست ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق ہندوستان میں 2017 میں 12 لاکھ افراد فضا آلودگی سے پیدا بیماریوں سے ہلاک ہوئے۔ صرف اتر پردیش میں 2017 میں 2.6 لاکھ افراد فضائی آلودگی کا شکار ہوئے۔

III **آبی آلودگی**: ہر سال صنعتی کارخانوں، کھانوں اور گھریلو کچرے اور غلیظ پانی سے تقریباً 25 بلین پونڈ تیزابی آلودکار (Toxic Pollutants) کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ آلودکار رقیق مادّے کی شکل میں (Effuents) آبی ذخیروں کو آلودہ کرتے ہیں۔ یہ دریاؤں، کنوؤں اور کھیتوں میں راہ پا جاتے ہیں۔ اس طرح پانی تو گندہ ہوتا ہی ہے، مٹی کی زرخیزی بھی متاثر ہوتی ہے۔ قومی سبز ٹریبونل (National Green Tribunal) کی ایک تحقیق کے مطابق ''گھروں اور کارخانوں سے جو غلیظ پانی خارج ہوتا ہے اس کا 60 فیصدی حصہ ہمارے پانی کے ذخیروں تک پہنچ جاتا ہے۔ جس سے یہ پانی کسی بھی استعمال کے لائق نہیں رہتا۔ بہت سے لوگ بالخصوص دیہاتی علاقوں میں اس گندے پانی کو استعمال کر کے بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔

ایک تازہ ترین تحقیق کے مطابق 'دنیا میں سب سے زیادہ زمین دوز پانی (Ground Water) کی سطح کی گراوٹ شمالی ہندوستان میں ہو رہی ہے، یہ تحقیق ہندوستان کے مشہور اور ذی وقار ادارے National Geophysical Research Institute (NGRI) نے کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں پچھلے 6 سال میں 300 Cubic Kilometre پانی ختم ہو چکا ہے۔ صرف گنگا کے علاقے سے ہی 100 گیگاٹن (10igaton=1 Billion Metric Ton) پانی ختم ہوا ہے۔ جس کی تھوڑی بہت بھرپائی مانسونی بارش سے ہو جاتی ہے۔ NGRI کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہمالیہ کے علاقے میں

زلزلہ اور دوسری ارضی سرگرمیوں سے بھی پانی کم ہو رہا ہے۔ سینچائی اور تعمیرات میں بڑے بڑے پمپ سے پانی نکالا جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان سے بنگلہ دیش تک تقریباً 2000 کلومیٹر کی زمین پر کروڑوں لوگ بستے ہیں جو کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ایسا اندازہ ہے کہ آبی سطح ہر سال دس سینٹی میٹر (10 CM) نیچے جا رہی ہے۔ ان تمام سرگرمیوں سے پانی گندہ بھی ہو رہا ہے۔ NGRI کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ 10 سال قبل مغربی بنگال اور بہار کے کچھ علاقوں میں آرسینک (Arsenic) سے پانی زہریلا ہو رہا تھا لیکن اب یہ شمال مغرب میں بھی پایا جا رہا ہے۔ یہ آرسینک غذائی فصلوں کو بھی متاثر کر رہا ہے جس کی وجہ سے لوگوں کی صحت کو خطرہ ہے۔

ہندوستان میں زمین دوز پانی کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر حکومت نے NGRI کو پانی کے لیے ذخیرے تلاش کرنے کی ہدایت دی ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر قدرتی وسائل کا خطرناک حد تک کم اور آلودہ ہو جانے کو ہی ماحولیاتی انحطاط کہتے ہیں۔ آلودگی کی وجہ سے جو بیماریاں پھیل رہی ہیں اور جو دوسرے نقصان ہو رہے ہیں ان سے تقریباً ایک لاکھ کروڑ روپے سے لے کر 4.5 لاکھ کروڑ روپے کا سالانہ نقصان ہو رہا ہے۔ ماحولیاتی توازن بگڑنے سے معاشی اور سماجی مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ قدرتی وسائل کی کمی اور آلودگی سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں اس کی چند مثالیں ذیل میں دی گئی ہیں:

(1) گھنی آبادی والے افریقہ، چین اور ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں زیر زمین پانی کی سطح تیزی سے نیچے جا رہی ہے کیونکہ یہاں پانی کی بربادی بہت زیادہ ہے۔

(2) ترقی پذیر ملکوں میں توانائی کے ذرائع کم ہوتے جا رہے ہیں جس سے معاشی ترقی متاثر ہو رہی ہے۔

(3) اوزون پرت دھوئیں اور دھول سے کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ جس سے تپش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ قطب شمال کی برف پگھل رہی ہے۔ جو ملک بڑے دریاؤں کے کنارے آباد ہیں ان کو سیلاب کا خطرہ ہے، جن میں بنگلہ دیش اور مصر شامل ہیں۔ چھوٹے جزیرہ نما ملک جیسے مالدیپ کو غرق آب ہونے کا خطرہ ہے۔

ایسا اندازہ ہے کہ عالمی آبادی کے 25 فیصد قدرتی ایندھن اور 85 فیصد کیمیکل اشیاء پر قبضہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ پانی کا بھی غیر معمولی تصرف کرتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں فی کس سالانہ 2300 کیوبک میٹر، کناڈا میں 1500 کیوبک میٹر پانی کا تصرف ہے جب کہ ترقی پذیر ملکوں میں 20 سے 40 کیوبک میٹر فی کس سالانہ پانی کا خرچہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بجلی اور دوسری اشیاء کا استعمال بھی بہت زیادہ ہے۔

قابل بقا ترقی: 1987 میں UNO نے ماحولیات اور ترقی پر ایک عالمی کمیشن (WCED) بنایا تھا جس کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''اگر ہم معاشی رفتار اور سمت نہیں بدلیں گے تو ہمارا ماحول نا قابل برداشت حد تک بگڑ جائے گا۔''

دسمبر 2009 میں کوپن ہاگن (Copenhagen) کانفرنس میں اپنی افتتاحی تقریر میں پرنس آف ویلس نے کہا تھا کہ انسان اگر قابل بقا ترقی اختیار کرے تو ماحولیات میں توازن واپس آسکتا ہے''۔ RIO چوٹی کانفرنس (1992) میں سب ہی ممالک نے 21 ویں صدی میں قابل بقا ترقی کا طریقہ اپنانے کا فیصلہ کیا تھا جس کو Agenda 21 کہتے ہیں۔

'قابل بقا ترقی' کی تعریف عالمی کمیشن (WCED) نے 1987 میں یہ کی تھی: ''ایسی ترقی جس میں موجودہ نسل اپنی ضرورتوں کو پورا کرے لیکن اس سے مستقبل کی نسلوں کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی اہلیتوں کو کوئی نقصان نہ ہو''۔

اس طرح 'قابل بقا ترقی' کے لیے ذیل میں دی گئی ہدایات کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔

(1) قدرتی وسائل کا احتیاط سے استعمال ہو تاکہ مستقبل کی نسلوں کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں دقت نہ ہو۔

(2) معاشی ترقی ماحول اور سماج کے لیے تکمیل کنندہ ہو نہ کہ مخالفانہ۔

(3) بین الاقوامی اتحاد اور اتفاق قائم ہو جس سے ملکوں میں منصفانہ اور متوازن تعاون شامل ہو۔

2015 میں Addis Ababa میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں 2030 تک قابل بقا ترقی کے نشانوں کو حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ 2018 کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ 175 ملکوں اور پارٹیوں نے معاہدے پر دستخط کر دیے ہیں، جس میں سے 168 (167 ممالک اور یوروپین کمیشن) نے اپنا اپنا تعاون UN میں درج کروایا۔

Addis Ababa کانفرنس میں 2030 تک 17 ہدف حاصل کرنے کا عزم کیا گیا تھا، لیکن 2018 کی رپورٹ میں پایا گیا کہ غریب ممالک میں زیادہ فرق نہیں ہوا جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں بہتری آئی ہے۔ مثلاً آج بھی غریب ملکوں میں 800 ملین غربت سے پریشان ہیں۔ عالمی سطح پر نصف سے زیادہ بچے پڑھنے اور حساب میں کم سے کم سطح کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔

موسمی تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے سب ہی ممالک نے پیرس معاہدے (Paris Agreement 2015) پر اتفاق کیا تھا۔ لیکن اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ امریکہ نے اس معاہدے سے اپنے کو باہر کر لیا۔ ان حالات میں 2030 کے لیے جو ہدف مقرر کیے تھے ان کو حاصل کرنا مشکل ہی نظر آ رہا ہے۔

قابل بقا ترقی کے لیے ضروری اقدام:

مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں ذیل کے اصول اور اقدام کے لیے سفارش کی گئی ہے:

(1) قدرتی وسائل کا استعمال نہایت ذمے داری سے کیا جائے۔ روایتی اور نا قابل تجدید وسائل (کوئلہ، تیل، پانی وغیرہ) کا استعمال کم ہو۔ شمسی توانائی وغیرہ کا استعمال زیادہ ہو۔

(2) ماحول کا تحفظ اور اسے انحطاط سے بچانے کی ذمہ داری سرکار اور عام شہریوں سب کی ہے۔ ماحول کا تحفظ عالمی مسئلہ ہے لیکن اس پر عمل درآمد مقامی سطح پر ہی ہوتا ہے۔

(3) پالیسی بناتے وقت معاشی اور ماحولیاتی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت بہت سے ماحولیاتی قوانین بناتی ہے لیکن ان کے نفاذ میں سختی اور ایمانداری نہیں ہوتی۔ اکثر مصلحتاً یا سیاسی دباؤ میں ایسے پروجیکٹ کو منظوری دے دی جاتی ہے جو ماحول کے لیے مضر ہوتے ہیں۔

(4) لوگوں میں تعلیم و تشہیر کے ذریعے ماحول کے تئیں آگہی اور بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(5) وسائل کا تحفظ اور نئے وسائل کے منصوبے نیز جدید ٹکنالوجی سے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش ہو۔

(6) دنیا کی آبادی اس وقت 68 بلین ہے 2030 تک 83 بلین ہو جانے کا اندازہ ہے۔ غریب ممالک میں اضافے کی شرح کچھ زیادہ ہی ہے جس سے وسائل پر دباؤ بڑھتا ہے اور افلاس اور بیماریوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آبادی کے سلسلے میں ایک قومی پالیسی کی ضرورت ہے۔

اختتامیہ: سبھی ملکوں کو قابل بقا ترقی کے لیے سرگرم ہونے کی ضرورت ہے۔ 2030 تک ہدف حاصل کرنے کے منصوبے کے تحت صرف 9 سال ہی رہ گئے ہیں۔ ماحولیاتی انحطاط کو روکنے اور کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر قابل بقا ترقی ممکن نہیں ہے۔

حوالے:

1 ٹائمس آف انڈیا۔ 7 دسمبر 2018، 6 فروری 2019 اور 24 فروری 2019۔
2 UN ملینیم ڈولپمنٹ گول۔ رپورٹ 2018۔
3 پی راجراور کے جلال۔ قابل بقا ترقی۔ ایک تعارف۔ Eartlescan۔ لندن 2008۔

■

Dr. Shazli Hasan Khan
4/757, Friends Colony
Aligarh - 202001 (UP)

فلم

بالی ووڈ فلمیں اور مشاہیرِ اردو

محمد عارف

اردو ہندوستان میں جنم لینے والی ایک ایسی زبان ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے پر اپنا گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ یہ اس زبان کی شیرینی، سادگی اور سلاست کا ہی کرشمہ ہے کہ جو اس زبان سے نامانوس ہیں انھیں بھی اس زبان سے انسیت ہے۔ اس کا ایک ثبوت بالی ووڈ کی فلمیں ہیں جن میں زیادہ تر ڈائلاگ، نغمے اور مکالمے اردو میں ہوتے ہیں۔ مگر وہ ناظرین کو اتنے بھلے لگتے ہیں کہ زبان کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور نغمے تو کانوں میں اس طرح رس گھولتے ہیں کہ فلم دیکھنے والا کسی اور ہی دنیا میں کھو سا جاتا ہے۔ جہاں زبان سے زیادہ جذبے کی تپش محسوس ہوتی ہے اور حقیقت یہی ہے کہ انسانی جذبات اور احساسات کی بہت ہی خوب صورت عکاسی اسی زبان میں ہوتی ہے۔ اسی لیے اردو زبان نہ جانتے ہوئے بھی لوگوں کو اس زبان سے عشق سا ہو جاتا ہے اور شاید عشق کا یہی وہ جادو ہے جو آج بھی بالی ووڈ میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو غالب پر لکھی ہوئی سعادت حسن منٹو کی مشہور زمانہ کلاسیکل فلم 'غالب' اور گلزار کا تحریر کیا ہوا ٹی وی ڈراما' مرزا غالب' اور دوسری بہت سی فلموں کو اتنی مقبولیت اور شہرت نصیب نہ ہوتی۔

میر و غالب وغیرہ تو سب کی پسند ہیں اور ان کے نغمے پوری دنیا میں گونجتے ہیں۔ بالی ووڈ کی فلموں میں بھی اردو کے کلاسیکی شاعروں کی بہت سی غزلیں ہیں جو بہت مقبول ہیں اور جنھیں گلوکاروں کی آواز نے نئی زندگی سی بخش دی ہے۔ یہ وہ نغمے ہیں جو صرف جذبے کو مہمیز نہیں کرتے بلکہ انسانی وجود کو ایک ایسے آہنگ سے بھر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے ذہن کا انتشار ختم ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی میں ایک نیا احساس جنم لیتا ہے۔ جب کہ ان نغموں میں اردو کی سہل اور سادہ لفظیات کے علاوہ تلاطم، عقوبت، سنگ باری، غمازی جیسے مشکل الفاظ بھی استعمال میں آتے ہیں۔

خالص اردو کے شہکاروں پر بنی فلمیں بھی اردو زبان کی مقبولیت اور قدر و قیمت کا ثبوت ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' پر مظفر علی کی بنائی ہوئی فلم نے اپنا جو اثر ناظرین پر نقش کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی اردو کے تخلیقی ادب میں بڑی قوت اور توانائی ہے۔ یہی وہ فلم ہے جس میں ریکھا نے اپنی اداکارانہ صلاحیت کا لوہا ایک زمانے سے منوایا اور جس کے نغموں کی وجہ سے شہریار نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں شہرت کے ہفت آسمانوں کی سیر کی۔ اس سے بھی پہلے آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے 'یہودی کی لڑکی' پر بنائی جانے والی فلم 'یہودی کی بیٹی' میں دلیپ کمار کے کردار نے اس کہانی کی ڈرامائیت میں چار چاند لگا دیا۔ اسی طرح منشی پریم چند کی کہانیوں پر بھی ہندوستانی فلم نگری میں کئی کہانیاں بنائی گئیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور ہوا ان کے ناول 'گئو دان' پر بنایا ہوا ٹیلی ویژن ڈراما۔ جس کی جذباتیت نے ناظرین کو اس قدر متاثر کیا کہ اسے آج بھی ہندوستانی فلم اور ٹیلی ویژن میں کسی شاہکار سے کم کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اردو معاشرے اور تہذیب پر بنائی جانے والی فلموں اور ٹی وی ڈراموں نے بھی ہندوستان میں خاصی شہرت حاصل کی۔ ایسی فلموں میں شبانہ اعظمی، ارمیلا ماتونڈکر اور دیا مرزا جیسے فنکاروں کو لے کر بنائی جانے والی فلم 'تہذیب' اور امیتابھ بچن اور شری دیوی جیسے اداکاروں سے سجی ہوئی فلم 'خدا گواہ'۔ اس کے علاوہ ٹی وی پر آنے والا مشہور فیملی ڈراما 'حنا' بھی اردو تہذیب کی جلوہ گری کے باعث لوگوں کی نگاہوں میں رچ بس گیا اور اس نے اپنی شہرت کی بنیاد پر دوسرے کئی ہم عصر ٹیلی ویژن ڈراموں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اردو نے ہندی فلم نگری پر ایسا جادو کیا کہ اس کی سحر انگیز نگاہوں کی روشنی نے ایک عالم کو اپنا اسیر بنا لیا۔ اس حوالے سے یہ اقتباس کافی اہم ہے:

''ہندی فلموں نے اردو کی ان تمام مشہور داستانوں کو فلما کر ان کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگا دیے اور اردو کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک دیکھی جانے والی کہانی، پڑھی جانے والی کہانی کی بہ نسبت زیادہ موثر ہوتی ہے کیونکہ ایک کہانی کو بیک وقت ایک ہی شخص پڑھ کر متاثر ہوتا ہے جب کہ وہی کہانی جب فلم کے پردے پر دکھائی جاتی ہے تو بیک وقت ہزاروں اشخاص مثبت یا منفی اثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ اردو ادب کی مشہور اور معرکۃ الآرا داستانوں مثلاً قصہ چہار درویش، قصہ حاتم طائی، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، گل و صنوبر، شہزادی، علی بابا چالیس چور، انارکلی (ڈرامہ)، امراؤ جان ادا (ناول) وغیرہ کو ہندی فلموں نے حیات جاودانی بخش دی۔ آج یہ کہانیاں کتابوں کے صفحات سے اڑ کر عوام کے دلوں میں جا بسی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی کہانیاں اتنی مقبول ہو سکیں گی۔ ان کہانیوں کے علاوہ اردو کے مشہور ناولوں پر مبنی فلمیں بھی بنائی جا چکی ہیں۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی کی 'ایک چادر میلی سی' اور منشی پریم چند کے ناول 'غبن' اور 'کفن' بھی فلم کے پردے کی زینت بن چکے ہیں۔ 'شطرنج کے کھلاڑی' ستیہ جیت رے کی مشہور فلم تھی جو پریم چند کی کہانی سے ماخوذ تھی۔ ان کے علاوہ جتنی بھی کہانیاں لکھی گئیں ان میں بیشتر کے خالق اردو کے ادیب ہی تھے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔''

(ہندی فلموں پر اردو کا جادو از پروفیسر محمد منصور عالم، ص 41، ہندوستانی فلموں کا آغاز وارتقا مولف الف انصاری، مطبوعہ اقبال پبلیکیشنز، کلکتہ)

اردو کے بہت سے ادیبوں نے ہندوستانی فلم انڈسٹری کے لیے خدمات انجام دیں۔ان ادیبوں کے شاعرانہ اور فلمی کریئر کے بارے میں گفتگو کی اسے ادب اور آرٹ کے اس اہم سنگم کا بہت خوبصورت منظر نامہ سامنے آئے گا۔

سعادت حسن منٹو: سعادت حسن منٹو کی شخصیت سے کون واقف نہیں ہے۔انھوں نے اردو دنیا میں اپنے نام اور کام دونوں کا سکہ جمایا۔گو کہ منٹو کو فلمی دنیا میں زیادہ بڑی جگہ نہ مل سکی۔ان کی کہانیاں بہت سی فلمی پلاٹس کی زینت بنیں مگر ان کے جیتے جی وہ ہندوستانی فلم انڈسٹری سے اتنا کچھ حاصل نہ کر پائے جتنا کہ ان کا حق تھا۔اس کی وجہ ہم منٹو کی اس لاابالی فطرت کو بھی کہہ سکتے ہیں جو کہ ہر اصلی تخلیق کار کے یہاں پائی جاتی ہے۔وہ کہیں بھی ٹک کر کوئی کام کرنے سے قاصر رہے۔تاہم انھوں نے اپنی دلچسپی کی بنیاد پر مرزا غالب پر ایک فلم لکھی اور ہندی فلم جگت میں اسے اپنے افلاس زدہ دنوں میں کسی ڈائرکٹر کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر فروخت کر دیا۔نتیجتاً فلمی پردے کی زینت بنی اور اپنے زمانے میں بے حد کامیاب بھی رہی۔اس کے علاوہ منٹو کی مشہور زمانہ کہانی جو کہ تقسیم ہند کے موضوع پر تھی اور جسے دنیا ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نام سے جانتی ہے۔کئی بار ہندوستانی فلم اور ڈراما کمپنیوں کی جانب سے فلمائی اور اسٹیج کی گئی۔

مجروح سلطان پوری: مجروح سلطان پوری کا اصلی نام اسرارالحسن خان تھا۔آپ کا آبائی وطن نظام آباد، اعظم گڑھ تھا۔انھوں نے اپنے فلمی کریئر کا آغاز 1945 میں کیا اور دو دہائیوں کے مقبول ترین نغمہ نگار رہے۔مجروح صاحب کو اس بات پر اپنی پوری زندگی میں فخر رہا کہ انہیں اپنی اردو شاعری کی بنا پر ہی فلمی دنیا میں آنے کا اور ایسی سنہری خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔

مجروح صاحب نے چھبیس سال کی عمر میں اپنے فلمی کریئر کا آغاز کیا اور اپنی اردو شاعری اور زبان کی صلاحیت کی بنیاد پر ایک سے ایک فلمی گیت تخلیق کیے۔مجروح صاحب نے اپنی فلمی زندگی میں نوشاد صاحب، مدن موہن، او پی نیر، شنکر جے کشن، جتن للت اور اے آر رحمن جیسے عظیم میوزک ڈائرکٹرز کے ساتھ کام کیا اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کے دلوں کو اپنے اردو کے خوبصورت الفاظ کے رشتے میں پروتے چلے گئے۔انھوں نے اپنی پہلی فلم 'شاہجہاں' کے ہی گانے اس قدر خوبصورت لکھے کہ ان میں سے بیشتر عوام میں بہت مقبول ہوئے اور پروڈیوسر کے حسب خواہش ان نغموں میں مغلیہ عہد کے زبان و بیان کی اس چاشنی کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ان کی ایسی ہی شاہکار خدمات کی وجہ سے انھیں 1965 میں اپنے مشہور نغمے 'چاہوں گا میں تجھے سانجھ سویرے' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ اور 1993 میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بنام دادا صاحب پھالکے سے نوازا گیا۔مجروح صاحب نے اپنے تمام فلمی گیتوں میں اردو زبان اور اس کی زود اثری سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا۔آج بھی ان کے اشعار فلمی گیتوں اور مکالموں میں استعمال کیے جاتے ہیں اور جس شعر نے انہیں دنیائے ادب اور فلم دونوں میں یکساں طور پر شناخت حاصل کرنے میں مدد دی وہ ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروح سلطان پوری کے مشہور نغمے اس طرح سے ہیں جس پر انھیں فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔

چاند میرا دل چاندنی ہو تم چاند سے ہے دور چاندنی کہاں (ہم کسی سے کم نہیں)، رانجھ کو رانی سے پیار ہو گیا (اکیلے ہم اکیلے تم)، پہلا نشہ پہلا خمار (جو جیتا وہی سکندر)، او میرے دل کے چین (میرے جیون ساتھی)،

یہ ہے ریشمی زلفوں کا اندھیرا (میرے صنم)، آ جا پیا تو ہے پیار دوں (بہاروں کے سپنے)، اے دل ہے مشکل جینا یہاں (سی آئی ڈی)، چھپالو یوں دل میں پیار مرا (ممتا)

ساحر لدھیانوی: ساحر کی تخلیقی صلاحیت کو کون نہیں پہچانتا۔ان کے نغمے آج بھی ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے لوگوں کے گوش گزار ہوتے رہتے ہیں اور وقت کی کئی پرتیں پڑنے کے باوجود ان نغموں کی مہک تازہ ہی رہتی ہے۔وہ بیسویں صدی کے وسط میں لاہور سے ہندوستان آئے اور یہاں آ کر ممبئی میں انھوں نے فلم 'آزادی کی راہ پر' سے اپنے فلمی کریئر کا آغاز کیا۔یہ فلم اپنا کچھ خاص اثر ہندوستانی سنیما پر نہیں ڈال پائی مگر ساحر کی تخلیقی صلاحیت کو ابھی اور چمکنا تھا اس لیے وہ اس راہ پر آگے بڑھے اور انھوں نے 1950 میں فلم 'نوجوان' کے گانے لکھے جو کہ اتنے مقبول ہوئے کہ ساحر کا نام بطور نغمہ نگار ہندوستانی فلم انڈسٹری میں خاصی شہرت حاصل کر گیا۔ساحر کی شخصیت چونکہ خود بھی بے حد رومانی تھی اس لیے انھوں نے جب اپنی رومانویت کو نغموں میں اتارنا شروع کیا تو لوگ اس سحر زدہ لہجے کی تمکنت سے چونک اٹھے۔

ساحر کے فلمی نغمے نہ صرف اپنی غنائیت کی وجہ سے بے مثال ہیں بلکہ ان نغموں کی معنی آفرینی اور معاشرتی حسیت نے انھیں آفاقیت عطا کی ہے۔ساحر کا امتیاز ہے کہ جو باتیں نثر کے پیرائے میں بیان کی جا سکتی ہیں انھیں ساحر نے شعر کے قالب میں ڈھال کر نہایت غنائیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمیں پہ اتارا گیا ہے میرے لیے

ساحر لدھیانوی اپنے عہد کے وہ نازک مزاج نغمہ نگار تھے جنہوں نے دھنوں پر گیت لکھنے سے انکار کرتے ہوئے اپنے قلم کی عظمت کا اعتراف کروایا۔انھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ پہلے گیت لکھیں گے اور اس کے بعد ہی ان کو دھنیں عطا کرنے کے لیے موسیقار کو محنت کرنا پڑے گی۔اس طرح موسیقی اور شاعری کی اس پرانی جنگ میں انھوں نے فلم انڈسٹری کو اپنے عہد تک تو یہ بات ماننے پر مجبور کر دیا کہ گانوں میں بول کی اہمیت دھنوں سے زیادہ ہوتی ہے۔اس کے علاوہ بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر ان کو کس حد تک ناز تھا اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ فلموں میں موسیقاروں کی بہ نسبت پروڈیوسر سے ایک روپیہ زیادہ ہی قیمت وصول کی۔وہ اپنے کلام کی سحر بیانی کی صحیح قیمت سے واقف تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے زندگی بھر کسی بھی طرح کے معاوضے کے لیے معاہدہ کرنا غیر ضروری سمجھا۔ساحر کے چند مشہور نغمے اس طرح ہیں۔

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا

(فلم 'پیاسا')

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا دھتکار دیا

ندا فاضلی: اردو شاعری کے لحاظ سے فلمی دنیا میں ندا فاضلی کا نام ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی شاعری نے اپنے اسلوب اور افکار کی بدولت ایک ایسے لہجے کی بازیافت کی ہے جو بیک وقت میر اور نظیر کی یاد دلاتا ہے۔ندا کے یہاں جو فکری بہاؤ ہے وہ دراصل اودھت گیتا سے مستعار ہے۔

ایک دن اچانک وہ ایک مندر کے پاس سے گزرتے ہیں جہاں انہیں سورداس کا ایک بھجن 'مدھوبن تم کیاں رہت ہرے؟ برہ بیوگ سیام سندر کے ٹھارے، کیوں نہ جرے؟' سنائی دیا۔اس بھجن میں کرشن کے متھرا سے دوارکا چلے جانے پر رادھا اور گوپیاں چمن سے استفسار کرتی ہیں کہ اے چمن! تم کرشن کے بغیر اتنے سرسبز کیوں ہو، ان کی جدائی کے غم نے تمھیں جلا کیوں نہ دیا؟۔۔اس واقعے کو ندا کے لہجے کی تشکیل اور فکر کی

فلم

پرواز کی اساس کہا جاسکتا ہے اور یہاں سے ان کے دور مشق کے بعد ان کا اصل شعری دور شروع ہوتا ہے اور دراصل یہی درمیانی دور ندا کی شناخت کے طور پر مقبول ہوا۔ ندا کی شاعری کا تیسرا دور ان کی بمبئی (موجودہ ممبئی) آمد کے ساتھ 1964 میں شروع ہوا۔ یہاں آنے کے بعد ندا نے اس دور زندگی کا تجربہ حاصل کیا جہاں لوگ ایک دوسرے کے غم آشنا ہوتے ہوئے بھی ان غموں سے بھی فائدہ اٹھانے کی تدابیر میں جٹے رہتے تھے۔ ندا اپنے فلمی کیریئر میں اس قدر کامیاب نہیں ہوئے جتنا انھیں ہونا چاہیے تھا بلکہ ان کی زیادہ شہرت اسی فقیر منش شاعر کے طور پر ہے جس کے اقوال کے آئینے میں لوگ دنیا کی سیدھی سچی تصویر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ معاصر شاعری میں ندا فاضلی نے جدیدیت کے جس رنگ کی جانب اپنے اسلوب شعر کی باگ موڑی تھی خود اس کا وجود اتنا قوی ثابت نہیں ہوا کہ ندا جیسے شاعروں کے خیالات کی ترجمانی کا بوجھ برداشت کرسکتا۔ اس لہر سے جڑنے کی بھی ایک اپنی وجہ گوتم بدھ کے اسی بیان کی سی معلوم ہوتی ہے جس میں وہ خود کو پانی کا مماثل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ'' ان کا رنگ کچھ نہیں ہے بلکہ وہ اوروں کے رنگ میں رنگنے کی اہلیت ضرور رکھتے ہیں۔''ایسا نہیں ہے کہ اور شاعروں نے ندا کی طرح نظموں اور دوہوں میں دنیا کی تفہیم کی اس کوشش کو شامل نہیں کیا بلکہ کئی ایک تو ایسے ہیں جنھوں نے ندا کے یہاں سے خوشہ چینی کو بھی برا نہیں مانا مگر غزل کے قصر میں ندا کا اپنا ایک علیحدہ مقام ہے اور غزل کو سادھوسنتوں کا چولا پہنانے والے ندا کی برابری کرنا کسی بھی شاعر کے بس کی بات نہیں ہے یہ صرف ندا کا ہی حصہ ہے۔ وہ اپنی دھرتی اور اس کی بوباس میں اس طرح رچے بسے ہیں کہ یہاں کے اوتار، ندیاں، مزاریں، گنڈے، تعویذ، درخت اور پرندے ان کی شاعری کی دنیا کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں جس کو بمبئی کی بھیڑ بھی پامال کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی اور سچ پوچھا جائے تو ندا کی بہت بعد تک کی شاعری میں ان کے یہاں کا وہی خالص اور صوفیانہ اسلوب کارگر رہا جس نے انہیں ہجر کی تنہائی میں بھی خدا کے ترحم کا درس دیا تھا اور شہر کی ہاؤہو میں بھی اسی کی کرپا کا پاٹھ پڑھایا۔ البتہ فلمی دنیا میں رومانیت کے سہارے اپنی غزلوں سے فلموں میں چار چاند لگانے والے ندا فاضلی کے جن بولوں نے لوگوں کو متاثر کیا ان میں 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا'، 'ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے' جیسے سدا بہار اور مشہور نغمے سرفہرست ہیں جنھیں ہندوستانی عوام کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

شہریار: مرزا ہادی رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' پر بنائی ہوئی مظفر علی کی یادگار فلم 'امراؤ جان' میں اپنے نغموں سے سحر طاری کرنے والے شاعر شہریار اپنی فنی صلاحیتوں کی وجہ سے ہندوستانی فلمی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ شہریار نے امراؤ جان ادا کے فلمی نغمے واقعی اتنے اچھے تحریر کیے تھے۔ آج بھی وہ نغمے روح کو تازگی بخشتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا مشہور نغمہ

دل چیز کیا ہے آپ مری جان لیجیے
بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے

شہریار اردو ادب میں اپنی فنی بصیرت اور ادبی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری نے بھی ان کے کلام کی پختگی کو قبول کیا اور ان کی انمول اور بے بہا خدمات کی وجہ سے انھیں 2012 میں ہی ان کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے مشہور اداکار امیتابھ بچن کے ہاتھوں سے ایک ایوارڈ سے نوازا گیا۔ شہریار نے فلموں کی طرح اپنی ادبی زندگی میں شاعری سے لوگوں کو متاثر کیا۔

اخترالایمان: اخترالایمان کے اندر چونکہ ایک بہت ہی اہم شاعر وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھ رہا تھا اس لیے وہ بہت جلد ہی روایت شکن بن کر ابھرے اور ان کی یہی روایت شکنی انہیں ممبئی کی فلم نگری کی جانب کھینچ لائی۔ ممبئی میں ان کی آمد 1945 میں ہوئی۔ انھیں اپنی مکالمہ نگاری کے سبب 1963 میں فلم 'دھرم پتر' اور 1966 میں فلم 'وقت' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اخترالایمان نے تیس سے زائد فلموں میں مکالمے لکھے۔

اخترالایمان کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جس قدر کامیابی اپنے ادبی کریئر میں حاصل کی اتنی ہی انھیں فلمی دنیا میں بھی ملی۔ چونکہ وہ زبان و بیان پر قادر تھے اس لیے انھوں نے کئی فلموں میں گیت بھی لکھے اور مکالموں کی ہی طرح ان کے نغمے بھی عوام کے لیے سدا بہار ثابت ہوئے۔

اخترالایمان اپنی شاعری کی ہی طرح بالکل منفرد شخصیت کے حامل تھے۔ انھوں نے فلم نگری میں رہ کر بھی اپنی فنی صلاحیتوں کو کسی بھی طور کم نہیں ہونے دیا۔ وہ ایک باکمال اور باصلاحیت ادیب ہونے کے ساتھ ایک خوبصورت مکالمہ نگار بھی تھے۔ اسی لیے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جب جب اردو اور بالی ووڈ کے رشتوں کا ذکر ہوگا۔ تب تب اردو کے شعرا وادبا کو یاد کیا جائے گا۔

کیفی اعظمی: 14 جنوری 1919 کو آنکھیں کھولنے والے کیفی اعظمی کو آج ہندوستانی فلم انڈسٹری میں کون شخص نہیں جانتا ہوگا۔ ان کا مشہور زمانہ نغمہ ''عجیب داستاں ہے یہ، کہاں شروع کہاں ختم' لوگوں کے لیے آج بھی کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی فلمی خدمات کے لیے انھیں خواجہ احمد عباس کی ہدایت میں بنی ہوئی فلم 'سات ہندوستانی' میں برائے نغمہ نگاری نیشنل فلم ایوارڈ سے 1970 میں نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 1975 میں انہیں فلم فیئر کی جانب سے بہترین مکالمہ نگاری، بہترین منظرنامے اور بہترین کہانی کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ کیفی اعظمی نے اپنی اردو زبان دانی کی بدولت فلمی کریئر میں ایسی کئی فلمیں لکھیں اور ایسے نغمے تحریر کیے جس میں اس زبان کا جادو سننے والے کے سرچڑھ کر بولتا ہوا محسوس ہوا۔ ان کے کچھ سدا بہار نغمے مندرجہ ذیل ہیں۔

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
تو جو بے جان کھلونوں سے بہل جاتی ہے
وقت نے کیا کیا حسیں ستم
تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
زندگی بھر مجھے نفرت سی رہی اشکوں سے
آج سوچا تو آنسو بھر آئے مدتیں ہوگئیں مسکرائے

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نغمے ہیں جو ان کے قلم سے نکلے اور ہندوستانی فلم انڈسٹری کے آسمان پر ستاروں

کی صورت جگمگائے۔

شکیل بدایونی: ساحر لدھیانوی کی طرح شکیل بدایونی بھی اردو ادب کے حوالے سے فلموں میں ایک بہت عظیم نام بن کر ابھرے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی ہی بدولت انھیں فلم انڈسٹری میں سو سے زائد فلموں کے گیت لکھنے کا موقع ملا۔ یوں تو ان کے بہت سے نغمات مشہور و مقبول ہوئے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ مغل اعظم جیسی فلم میں لکھے گئے ان کے نغموں کو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ بھلا کون ہے جو 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' اور 'اے محبت زندہ باد' جیسے گانوں کی کھنک آج بھی اپنے کانوں میں محسوس نہیں کرتا۔ بہترین نغمہ نگار کے طور پر انھیں کئی بار فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ شکیل بدایونی کے تقریباً تمام فلمی نغمے مقبول و محبوب ہوئے ہیں، مثال کے طور پر کچھ مشہور نغموں کا ایک ایک مصرعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے (اڑن کھٹولہ)، تو گنگا کی موج میں جمنا کی دھار (بیجو باورا)، او دنیا کے رکھوالے سن درد بھرے میرے نالے (بیجو باورا)، جب پیار کیا تو ڈرنا کیا (مغل اعظم)

حسرت جے پوری: حسرت کا نام اقبال حسین تھا۔ 15 اپریل 1922 کو جے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا فدا حسین اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے حسرت کو بچپن ہی سے شعر و شاعری میں دلچسپی تھی اکثر اپنے نانا کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ یہیں سے ان کے اندر شعر فہمی کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ممبئی آگئے اور پابندی سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔

ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں پرتھوی راج کپور نے ان کی نظم 'مزدور کی تلاش' سنی تو ان کی ملاقات اپنے بیٹے راج کپور سے کرائی۔ راج کپور نے ان سے کچھ اور غزلیں سنیں تو انھیں اندازہ ہوا کی ان کے اندر نغمہ نگاری کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے اسی ملاقات نے حسرت کی زندگی بدل کر رکھ دی راج کپور کے ہی وسیلے سے ان کو فلموں میں کام مل گیا۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کی راج کپور کی بیشتر فلموں کے نغمے حسرت جے پوری کے تحریر کردہ ہیں۔ راج کپور کی فلموں کے سدا بہار نغمے حسرت جے پوری کی گہری بصیرت اور کمال فن کے مظہر ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر پروڈکشنز کے تحت بننے والی فلموں میں بھی ان کی بڑی حصے داری ملتی ہے۔ ان کے کچھ نغمے جو انھیں بالی ووڈ میں بلند مقام عطا کیے۔

زندگی ایک سفر ہے سہانہ (انداز)، تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے (سسرال)، پنکھ ہوتے تو اڑ آتی رے (صحرا)، احسان تیرا ہوگا مجھ پر (جنگلی)، تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے (پگلا کہیں کا)، بدن پہ ستارے لپیٹے ہوئے (پرنس)

حسرت نے اپنا پہلا فلمی نغمہ 'جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے، آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے' لکھا، ان کے نغموں میں سہل نگاری اور سلاست پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ بہ آسانی زبان زد عام ہوئے۔ کبھی کبھی ہندی تراکیب کا استعمال کر کے اپنے کلام میں ایک نیا آہنگ پیدا کر دیتے ہیں۔

گلزار: ہندوستانی فلمی صنعت میں کم لوگوں کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ جنھوں نے فلم سازی کے مختلف شعبوں میں اپنی انفرادیت اور صلاحیتوں کے چراغ روشن کیے ہیں۔ پورن سنگھ عرف گلزار بھی انھیں لوگوں میں سے ایک ہیں وہ بہترین اور حساس نغمہ نگار، کامیاب ہدایت کار، فطری مکالمہ نویس اور چست اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ بحیثیت نغمہ نگار گلزار کی پہلی فلم 'بندنی' تھی جس کے ایک نغمے نے حسن کی ایک نئی تعریف وضع کی اور وہ نغمہ بہت مقبول ہوا۔ گلزار ایک ایسے نغمہ نگار ہیں جو اپنے نغموں میں نئی لفظیات، اچھوتے خیال اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں۔

ہزار راہیں مڑ کے دیکھیں کہیں سے کوئی صدا نہ آئی
بڑی ادا سے نبھائی تم نے ہماری تھوڑی سی بے وفائی
(فلم: تھوڑی سی بے وفائی)

وہ شام کچھ عجیب تھی، یہ شام بھی عجیب ہے
وہ کل بھی آس پاس تھی، وہ آج بھی قریب ہے
(فلم: خاموشی)

نوشاد: نوشاد صاحب ہندوستان میں موسیقار اعظم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے بیجو باورا سے لے کر مغل اعظم جیسی فلموں تک میں اپنی موسیقی سے جادو جگایا ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف آج بھی ہندوستان کے کم و بیش تمام موسیقار کرتے ہیں۔ نوشاد صاحب کے بارے میں شاید زیادہ تر لوگ یہ بات نہیں جانتے ہیں کہ وہ اردو کے ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے اور ان کا شعری مجموعہ 'آٹھواں سر' کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ نوشاد صاحب کو اردو زبان و ادب دونوں سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے فلم مغل اعظم کی کلاسیکیت کو برقرار رکھنے کے لیے جس طرح نرگسی موسیقی کی دھنیں تیار کی تھیں اس سے یہ بات تو ثابت تھی کہ وہ اردو کے کلاسیکی مزاج سے پوری طرح واقف ہیں اور نہ صرف ان دھنوں کو زبان عطا کرنا جانتے ہیں بلکہ زبان کی دھنوں کا بھی پورے طور پر ادراک رکھتے ہیں۔

کمال امروہی: یہ ہندوستانی فلم سینما کی تاریخ میں اپنی تخلیقی صلاحیت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انھوں نے جو مکالمے لکھے اور جن فلموں میں ہدایتکاری کے فرائض انجام دیے۔ ان میں سے بیشتر کامیاب رہیں۔

کمال صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ ذہنی طور پر اپنا بالکل جداگانہ انداز رکھتے تھے۔ جب ہندوستانی سینما میں تشدد اور عریانیت سے بھرپور فلمیں بنائی جانے کا ایک فیشن چل نکلا تھا تو انھوں نے 'پاکیزہ' جیسی خوبصورت اور پاکیزہ فلم بنائی۔ زبان و بیان کے معاملے میں بھی ابتدا سے ہی کمال صاحب اپنی زبان میں اردو الفاظ کا بھرپور استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی کہانیوں اور مکالموں میں اردو زبان کی چاشنی و شیرینی کو بہت صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پھر مغل اعظم کے مکالموں کو کون شخص بھول سکتا ہے۔ جن کی وجہ سے انھیں فلم فیئر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اصل میں کمال امروہی صاحب صرف اردو زبان سے ہی نہیں بلکہ اس کی تہذیب اور تہذیب کے ہر مخفی و ظاہر گوشوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے فلمی دنیا میں اردو زبان و ادب کی ترویج میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

کمال امروہی صاحب نے بمبئی جوگیشوری (مشرق) میں کمالستان نام کا ایک اسٹوڈیو بھی تعمیر کروایا تھا۔ اس اسٹوڈیو میں خود ان کی ہدایتکاری میں بننے والی فلم رضیہ سلطان کے علاوہ امر اکبر انتھونی، کالیہ، کوئلہ اور حال میں بننے والی فلم دبنگ دوئم کی بھی شوٹنگ ہوئی ہے۔ یہ اسٹوڈیو تقریباً پندرہ ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔

کمال صاحب کی مقبولیت ان کی زندگی میں تو تھی ہی، فلم انڈسٹری نے ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی شخصیت کے اثر کے حصار سے کبھی خود کو باہر محسوس نہیں کیا ہے۔ گزشتہ سالوں میں ان کی شخصیت اور فلم انڈسٹری میں ان کی جدوجہد اور کردار سے متاثر ہو کر 'کھویا کھویا چاند' نام کی ایک فلم بھی بنائی گئی تھی جس میں 'شاہنی آہوجہ' نے کمال امروہی صاحب کا کردار ادا کیا تھا۔

اردو زبان اور ادب سے ان کو گہرا عشق تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب وہ اردو رسائل میں سید امیر حیدر کمال کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے تب سے شہرت کی بلندیوں کو سر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ممبئی کے فلمی طلسم کدے میں ہمیشہ اسی زبان نے اپنی ایک الگ پہچان بنانے میں مدد دی۔

■

Mohammad Arif
62, Paick Road, Ajeet Nagat
Pratapgarth - 230001 (UP)
Mob.:9015799692

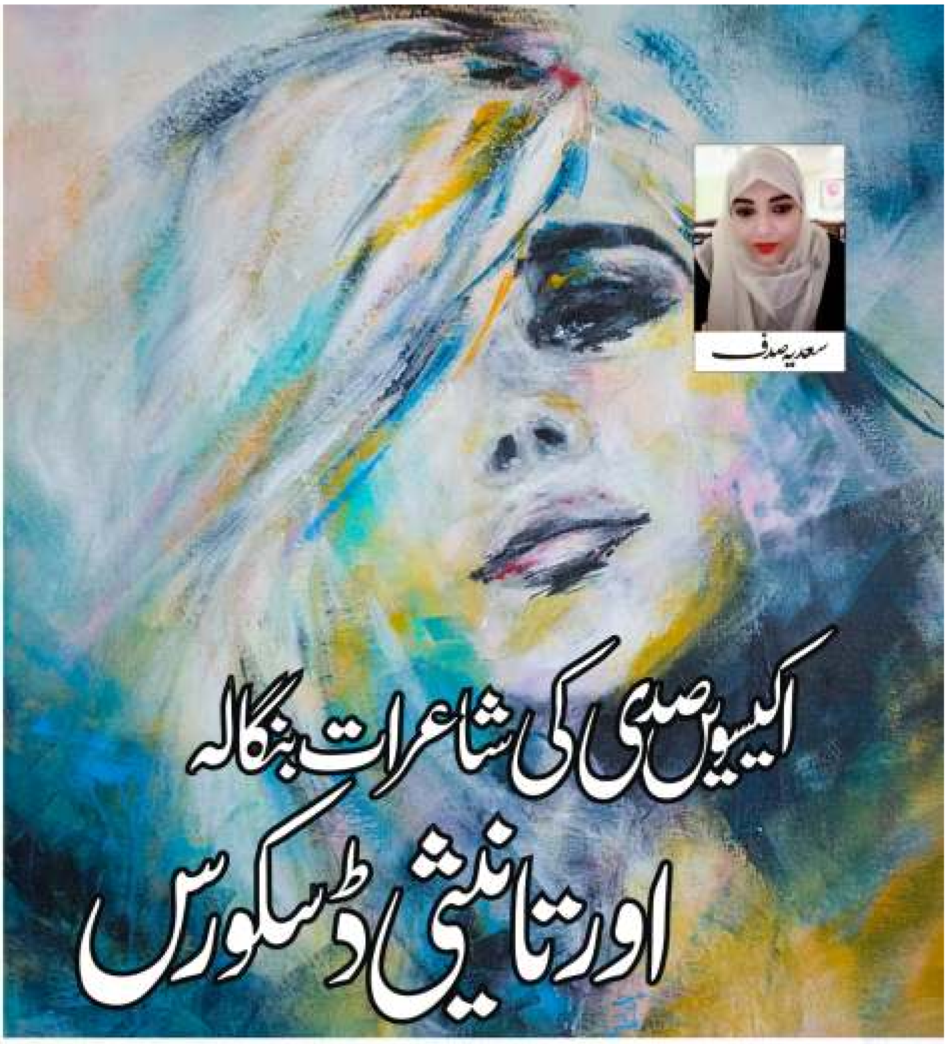

سعدیہ صدف

اکیسویں صدی کی شاعرات بنگالہ اور تانیثی ڈسکورس

عورت قدرت کا حسین شاہکار ہے۔ اس کا وجود فطرت کی دلکشی کا مظہر ہے۔ عورت، خاندان میں پائیدار ترقی اور معیار زندگی کی کلید ہے۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے لیکن ماں کا درجہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ ماں ہونا ایک خدائی اعزاز ہے جو صرف اور صرف عورتوں کو ہی حاصل ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اقبال نے کہا تھا۔

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

گرچہ ایک طویل مدت تک عورت کو اس کے حقوق سے دور رکھا گیا۔ اسے آزادیِ اظہار کے لیے ناقابل اعتنا سمجھا گیا۔ فطرت کی اس معاون کے ساتھ کب تک یہ جبر جاری رہتا؟ آخر وہ وقت آیا جب عورتیں جسم سے ہٹ کر بھی دیکھی گئیں۔ انھیں بھی شعور سے پیراستہ سمجھا گیا۔ اور انھیں مزید خود مختار بنانے کے لیے زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے اپنے فیصلے لینے کے لائق بنانے کا عمل شروع ہوا۔ اس طرح خواتین کے حوصلے بلند ہوتے گئے اور اب وہ سماج میں اپنی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ کیونکہ عورت صرف ثانوی جنس نہیں بلکہ معاشرے کی اکائی کا مساوی حصہ ہے۔ آج women empowerment بھی معاشرے کا اہم موضوع بحث ہے اور کیوں نہ ہو آخر خواتین اب کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ تعلیمی ادارے ہوں، کھیل کی دنیا ہو یا دفتری معمولات، ہر جگہ تانیثیت تذکیریت پر حاوی نظر آتی ہے۔ یہاں پدری و مادری نظام سے بحث مقصود نہیں۔ یہاں مقصد اکیسویں صدی میں خواتین کی شعوری وفکری ارتقا کی ترجمانی ہے۔

اس تیز رفتار دور میں خواتین بھی وقت کی نباض بن چکی ہیں۔ اب وہ نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ سربراہی بھی کر رہی ہیں۔ ادب کے حوالے سے بھی اپنی شناخت قائم کر رہی ہیں اور اپنی تخلیقات کے ذریعے دنیا کو اپنی منفرد فکر سے حیران بھی کر رہی ہیں۔ جو اس بات کا اعلانیہ ہے کہ لو اب ہم نے بھی اپنی زباں کھول دی ہے!۔ یہ اور بات کہ عورت کی بے باکی اور اس کی smartness کو معاشرے کے تنگ نظر افراد بے شرمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خواتین کی ترقی سے خوش نہیں۔ مگر اب وفا و اخلاص کی یہ پتلی زمانے سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ چنڈی، کالی اور درگا کا روپ بھی دھارنا جان چکی ہے۔

زندگی کے تمام شعبوں میں عورت اپنے ہنر کے اختصاص کے ساتھ موجود ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح شاعری میں اور بالخصوص غزلیہ شاعری میں خواتین، نسوانی جذبات کی عکاسی خوب خوب کر رہی ہیں۔ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ماہ لقا بائی چندا سے لے کر پروین شاکر تک، شاعرات کی کم سہی لیکن تعداد موجود رہی ہے۔ ہر زمانے میں شاعرات نے اپنے عہد کے تقاضوں کے تحت شاعری کی ہے۔ ابتدا میں خواتین کی شاعری میں صرف ہجر و وصال، بے وفائی اور تصوف کے موضوعات ملتے تھے۔ تضادات زمانہ سے خواتین بھی متاثر ہوئیں۔ اور انھوں نے ان موضوعات کے ساتھ زندگی کے دیگر مضامین کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ یعنی اب شاعرات نے غزلوں میں اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی شروع کر دی تھی۔ ان روایت شکن شاعرات میں پروین شاکر، کشور ناہید، سارا شگفتہ، ساجدہ زیدی اور فہمیدہ ریاض وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

> آخر وہ وقت آیا جب عورتیں جسم سے ہٹ کر بھی دیکھی گئیں۔ انھیں بھی شعور سے پیراستہ سمجھا گیا۔ اور انھیں مزید خود مختار بنانے کے لیے زیورِ تعلیم سے آراستہ کر کے اپنے فیصلے لینے کے لائق بنانے کا عمل شروع ہوا۔ اس طرح خواتین کے حوصلے بلند ہوتے گئے اور اب وہ سماج میں اپنی شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔

بنگال میں اٹھارہویں صدی سے شاعری کے نقوش ملتے ہیں۔ شعرا کے زیر اثر خواتین نے بھی اپنے جذبوں کی طغیانی کو شعری صورت دینا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنگال کی پہلی شاعرہ شرف النسا ہیں۔ لیکن موجودہ تحقیق کے مطابق بنگال کی اولین صاحب دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز واجد علی شاہ کی زوجہ عالم آرا بیگم کو حاصل ہے۔ کچھ بعد دیگرے شاعرات اپنے خیالات کو پیش کرتی رہیں۔ ضابطے کی پیروی کرتے ہوئے یا اس سے انحراف کرتے ہوئے خواتین برسر اظہار رہیں۔ اکیسویں صدی کی شاعرات قدما سے مختلف ہیں۔ ان کے یہاں غزل کی کلاسکیت کے ساتھ عصری شعور کی عکاسی بھی موجود ہے۔ ذیل میں مغربی بنگال کی نمائندہ شاعرات کے فکری سوتے ملاحظہ فرمائیں۔

1 نغمہ نور

مغربی بنگال کی شاعرات میں نغمہ نور اپنی شوخی کے سبب جانی جاتی ہیں۔ نغمہ کی شاعری اپنے آس پاس کے

ماحول کا احاطہ کرتی ہے۔ متوسط طبقہ اور اس کے مسائل ان کی شاعری میں موجود ہیں۔

ہیں نغمہ اپنی روٹیاں سب سینکنے والے
کہ دل میں جذبۂ خدمات اردو کون رکھتا ہے

نغمہ کے یہاں پراعتمادی کا جذبہ بھی ہے۔ جوان کے عزائم و بلند حوصلگی کو ظاہر کرتا ہے۔ عورت ہونا جن کے نزدیک کمزوری ہے ان کے لیے نغمہ کے یہ اشعار ہی کافی ہیں۔

میرے آنسو مجھے کمزور نہیں کر سکتے
ہمت و عزم کی اک آہنی دیوار ہوں میں

میرے مضبوط ارادوں کا کرشمہ ہے یہ
اک دیا میں نے ہتھیلی پہ جلا رکھا ہے

اب ان کا یہ شعر دیکھیں جو ترقی پسند مزاج خواتین کے رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ اکیسویں صدی میں جہاں کئی ملکوں میں عورتوں کی حالت بدلی ہے وہاں اب بھی کئی ایسے ممالک موجود ہیں جہاں عورت آج بھی اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ نغمہ نے اسی موضوع کے تحت اس شعر میں ان خواتین کی حمایت کی ہے۔ کہ عورت بھی کھلے آسمانوں کی حقدار ہے۔

کھلے موسم میں اڑنے کا مزہ کچھ اور ہوتا ہے
حصارِ قید میں رہ کر تو پر اچھا نہیں لگتا

نسوانیت سے بھرپور یہ شعر ملاحظہ فرمائیں جس میں فطری جذبے کا موثر اظہار ملتا ہے۔

خود کو محسوس میں کرتی ہوں مکمل عورت
جب مرا بچہ لپٹ جاتا ہے آنچل کی طرح

2 شگفتہ یاسمین غزل

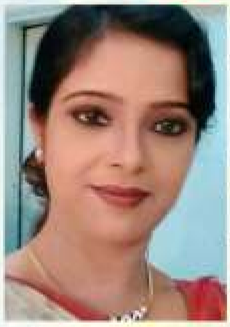

شگفتہ یاسمین غزل نے اپنے انفرادی رنگ سے شاعری کی دنیا میں جگہ بنائی ہے۔ ان کے یہاں ایک عورت کی بلند نظری، رواداری، اعتماد اور زمانے کے تضادات سے آنکھیں ملانے اور مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ کریں جو عورت کی خود کفالت پر دال ہے۔

کنواں کھود سکتی ہوں اپنے لیے میں
مجھے بادلوں کی ضرورت نہیں ہے

شگفتہ کی شاعری میں جہاں خود کفیل عورت زمانے کے سرد و گرم سے نبرد آزما ہوتی نظر آتی ہے وہاں اس کے حوصلے میں تیور بھی شامل ہے۔ اب عورت کو مرد کے بغیر بھی جینا آ گیا ہے اور وہ اس بات کا اظہار کرنے کا ہنر بھی رکھتی ہے۔ ذیل کے اشعار اس بات کے غماز ہیں۔

اب کے روٹھے تو صنم تم کو منائیں گے نہیں
ہم بھی تیار ہیں اب خود کو بدلنے کے لیے

غزل کی شاعری کا وصف ہے سب سے جداگانہ
ادائے فکر نے اسلوب نے جدت نے تیور سے

حوصلے کی انتہا تو دیکھیے کہ عورت رواداری کے ساتھ بھی اپنا بھرم قائم رکھنا جانتی ہے۔

گھر سے باہر اوڑھ لے تو مسکراہٹ کی ردا
آنسوؤں سے بھیگے تکیے چار دیواری میں رکھ

3 صابرہ حنا

عصر حاضر کی شاعرات میں صابرہ حنا بھی نمائندہ ہیں۔ ان کے یہاں عورت کا عزم، اس کی فکر اور اس کا زاویۂ نظر موجود ہے۔ یعنی وہ اوروں کے بنائے اصولوں پہ اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کا اپنا شعور بھی ہے جو اسے غور و خوض کی دعوت دیتا ہے اور اپنی راہ کا تعین بھی کرواتا ہے۔ مجاز نے کہا تھا۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

صابرہ کہتی ہیں۔

مرے ہاتھوں میں وہ پرچم تھما کر
مرے ماتھے پہ آنچل ڈھونڈتا ہے

خواتین کی جانب سے آزادیٔ اظہار کا بیان اس شعر میں صابرہ صاحبہ کس سلیقے سے کرتی ہیں۔

برس پڑے مرے تپتے وجود پر آخر
ہے آرزو کہ وہ چھوٹا سا ابر پارہ ہو

یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں جن میں حوصلے کی اڑان دیدنی ہے۔

غم کا طوفان کیا بگاڑے گا
دل میں جب تک ہے حوصلہ باقی

نہ بال و پر میں ہے سستی نہ حوصلے میں کمی
مری حیات مسلسل ابھی اڑان میں ہے

4 سلمیٰ سحر

عصر حاضر کی شاعرات میں سلمیٰ سحر اپنی خوبصورت نسائیت سے بھرپور شاعری کے سبب جانی جاتی ہیں۔ نسائیت سے بھرپور اور بے باک اظہار کا حامل ان کا یہ

شعر دیکھیں۔

صبا نے، گل نے، کلی نے مجھے چھوا لیکن
تمہاری طرح کسی نے نہیں چھوا مجھ کو

عورت کو ہمیشہ جسم کی حد تک دیکھنے والوں کو سلمیٰ نے کیا خوبصورت انداز میں اس شعر کے ذریعے طنز کیا ہے کہ سرسری نگاہ سے نہیں ہمیں توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

نگاہ جس نے بھی ڈالی ہے سرسری ڈالی
کہاں کسی نے توجہ سے ہے پڑھا مجھ کو

5 زرینہ ذریں

زرینہ زریں کا اختصاص یہ ہے کہ ان کے یہاں مابعد جدید رنگ کلاسیکی رنگ سے ہم آمیز نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی خیالات کی بلندی، ہمت اور حوصلے کا پیغام دیتی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے مغربی بنگال کے ادبی حلقوں میں آپ کا نام محترم ہے۔ چند اشعار اس ضمن میں ملاحظہ ہوں۔

فضا میں تھے ریت کے بگولے
سمجھ رہے تھے کہ آسماں ہے

دوستوں نے مل کے کی تھیں سازشیں
یہ نیا سا تجربہ اچھا لگا

آسماں سے جس گھڑی بجلی گری اچھی لگی
آشیاں میرا، جلا ان کی ہنسی اچھی لگی

6 ریحانہ نواب:

ریحانہ نواب ستر کی دہائی سے شاعری کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری نجی تجربات کا عکس پیش کرتی ہے۔ اعلیٰ ظرفی، بلند حوصلگی، ذاتی کرب ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کے یہاں عورت اپنی تمام محرومیوں

اور مجبوریوں کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔

دامن کی کشیدہ کاری پر دنیا کی نگاہیں ہیں لیکن
یہ کس کو پتہ ہے پھولوں سے دھبوں کو چھپایا جاتا ہے
منزل پہ پہنچنے کی قسم کھائی ہے ہم نے
کچھ غم نہیں رسنے لگے گر پاؤں کے چھالے

نجی تجربات کو سلیقے سے اپنی غزلوں میں سمونے سے شاعرہ خوب خوب واقفیت رکھتی ہیں۔

میں جو ٹوٹ کر گری ہوں تو سبب ہے ٹوٹنے کا
نہ لچک ہو جس میں کوئی وہی شاخ ٹوٹتی ہے

ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بھی آشکارا ہے کہ مجبور و محروم عورت جب اپنی ضد پہ آجائے تو وہ اپنے محبوب سے بدلہ لینے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ یہ وصف روایت سے بغاوت کی علامت بن جاتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

غیروں کی طرح اس سے سلوک اب کے کریں گے
اس بار ملے گا تو مروت نہ کریں گے
جو میری پیاس کو سمجھے جو میرا ظرف پہچانے
ہے جتنی پیاس مجھ کو اتنا پیاسا کوئی تو ہوگا

7 کوثر پروین کوثر

کوثر صاحبہ کلاسک کی گرویدہ نظر آتی ہیں۔ ان کی فکر کلاسک سے کچھ یوں ہم آہنگ ہوئی ہے کہ ان کے تجربات اسی پیکر میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر نمو پاتے نظر آتے ہیں۔ عشق و محبت، ہجر و وصال، خواہش الفت، جہد و عمل، طنز، تلمیح و تصوف، عقل و دل کی کشمکش اور حالات حاضرہ کا بیان ان کی غزلوں کے خاص موضوعات ہیں جنھیں وہ استعاراتی انداز میں کامیابی کے ساتھ غزلوں میں پیش کر دیتی ہیں۔

اب ہواؤں کو جھیلیے کوثر
آپ نے شمع کیوں جلائی ہے
نور جیسے دلوں سے غائب ہو
چہرہ چہرہ بجھا سا لگتا ہے

کوثر پروین روایت کی امین ہیں۔ خالص کلاسیکی انداز کے چند اشعار دیکھیں جس سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

کوثر یہی تو زندہ کرامت ہے شیخ کی
پی عمر بھر شراب مگر پارسا رہا
اجنبی ہے نہ آشنا کوئی
دور تک بے کسی کے سائے ہیں
پی کے کوثر بھی جام بے خودی
آج پیر مغاں ہوگئی

8 شہناز نبی

شہناز نبی، مغربی بنگال میں اردو غزل کو متنوع موضوعات سے رنگا رنگ کرنے والی شاعرہ ہیں۔ کون سا موضوع ہے جو ان کے قلم سے بچ سکا ہے۔ کلاسیکی رنگ ہو کہ جدید موضوعات کا بیان، ذاتی انتشار ہو یا محرومی کا بیان، ان کے یہاں سب موجود ہے۔ عشق کے معاملات میں ان کے یہاں عام شاعرات سی کیفیت نہیں ملتی۔ آپ بچھڑنے کے بعد بھلانا بھی جانتی ہیں اور آگے بڑھنا بھی۔ یعنی ان کے یہاں محبوب کا شکوہ مفقود ہے۔ شکوہ کسی صورت میں ہے بھی تو خدا سے ہے۔ اس سلسلے میں یہ شعر ملاحظہ کریں۔

قسام ازل نے بڑی خست ہے دکھائی
جنت رکھی قدموں میں جہنم سے گزارا

شاعرہ نے تانیثیت کے تمام پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ ان کی شاعری میں عورت کا باغی روپ بھی نظر آتا ہے اور بغیر مرد کے سہارے کے اپنے فیصلے لینے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں عورت نہ صرف خود مختار و خود کفیل ہے بلکہ اپنی سمت بھی متعین کرنا جانتی ہے۔

مٹاتی اور لکھتی ہوں نوشتہ اپنی قسمت کا
کسی تقدیر کی تقدیر ہونے سے ہراساں ہوں
اک آبجو کہ جو تھی اسیر محیط وہ
بہنے لگی ہے اپنی طرح سے طلاق میں

جذبات کے اظہار میں مرد اور عورت کے درمیان کشمکش اب ختم ہو چکی ہے۔ پہلے بھی خواتین اپنے جذبات کو بے باکی سے بیان کرنے سے قاصر ہوا کرتی تھیں۔ لیکن تانیثیت کی لہر نے خواتین کے اندر پوشیدہ عناصر کو کچھ اس طرح مہمیز کیا کہ وہ نہ صرف روشن ہوئیں بلکہ معاملات اظہار میں مردوں پہ سبقت بھی لے گئیں۔

ہم نے بھی تو لفظوں میں نئے رنگ بھرے ہیں
اک تم ہی رہو در پئے اظہار بہت خوب

گلوبل ولیج میں سانس لیتے انسان کی زندگی مشینوں کی مرہون منت بن چکی ہے۔ ایسے میں صنعت کاری کی تیز رفتاری نے نہ صرف فطرت کی خوبصورتی کو متاثر کیا ہے بلکہ انسانی صحت پر بھی مضر اثرات مرتب کیے ہیں۔ شاعرہ کی حساس فکر اس کی ترجمانی یوں کرتی ہے۔

چاروں طرف دھوئیں کی بڑھتی ہوئی لکیریں
یہ شہر ہے کہ جیسے شمشان ہو رہا ہے

شہناز نبی عصری میلانات سے ہم آہنگ ہیں۔ وہ عورتوں کے ساتھ روا مظالم کے خلاف احتجاجی صدا بلند کرتی ہیں۔ انھیں عورت کی ہنر مندی کا احساس ہے جو کہیں نہ کہیں چولہے چوکے کی نذر ہو جایا کرتی ہے۔ ایسی عورتوں کی آواز ان کی آواز میں سنائی دیتی ہے جو کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ جو روایت سے بغاوت کرنا جانتی ہیں۔ درج ذیل اشعار اسی تیور کے حامل ہیں۔

چوکا، چکی، نل اور کل   کب تک برتن باسن میں
مجھے اپنا چہرہ ابھی یاد ہے   ہٹو آئینہ مت دکھاؤ مجھے

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ اکیسویں صدی کی شاعرات بنگالہ کا تانیثی ڈسکورس کس قدر واضح اور بیباک ہے۔ یہ خواتین نہ تو زمانے سے ڈرتی ہیں نہ ہی اس کے ضابطے کی اندھی تقلید کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ وہ اپنی الگ راہ اختیار کر چکی ہیں اور اسی ڈگر پر اپنے آپ کو پانے کی آرزومند ہیں یا یوں کہیے کہ خود کو پا چکی ہیں۔ موجودہ معاشرے کی خاتون تخلیق کاروں کی self discovery کے تناظر میں شہناز نبی صاحبہ اپنی کتاب 'تانیثی تنقید' میں لکھتی ہیں:

''خواتین کی تخلیقی حسیت کا جائزہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ عورتیں بہ حیثیت قلم کار خود کو دریافت کر چکی ہیں۔''

(تانیثی تنقید: شہناز نبی، ص 64، کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، 2009)

مختصر یہ کہ اکیسویں صدی کے تیور سے ہماری شاعرات ہم آہنگ ہیں۔ مزاج کے اختلاف کے باوجود ان کے یہاں، عصری مسائل کی عکاسی، تشکیک، تشخص کا بحران، جیسے مسائل موجود ہیں۔ تانیثیت کے مسائل و مباحث بھی ان کے زیر نظر رہے ہیں۔ یہ اور بات کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ عصر حاضر میں عورت کی زندگی، اس کے مسائل، اس کی خواہشات کی تکمیل اور عدم تکمیلیت کسی نہ کسی صورت میں ان شاعرات کے یہاں مل جاتی ہیں۔ گرچہ کسی کے یہاں عصری شعور کی بہتات ہے تو کسی کے یہاں ذاتیات کا بیان زیادہ ہے۔ کوئی کلاسیکیت سے ہم آہنگ ہے تو کسی کے حوصلے کی بلندی اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ بعض خواتین نے ان تمام موضوعات کو احاطۂ تحریر میں لے لیا ہے جن پر صرف مرد کی نظر ہی جا سکتی تھی۔ شاعرات اپنی اپنی سطح پر کوششیں کر رہی ہیں۔ کچھ کے یہاں روایت کی توسیع ہے تو کچھ شاعرات کے یہاں امکانات روشن ہیں۔

■

Sadia Sadaf
Research Scholar, Dept of Urdu
Aliah University
Kolkata- 700156 (West Bengal)

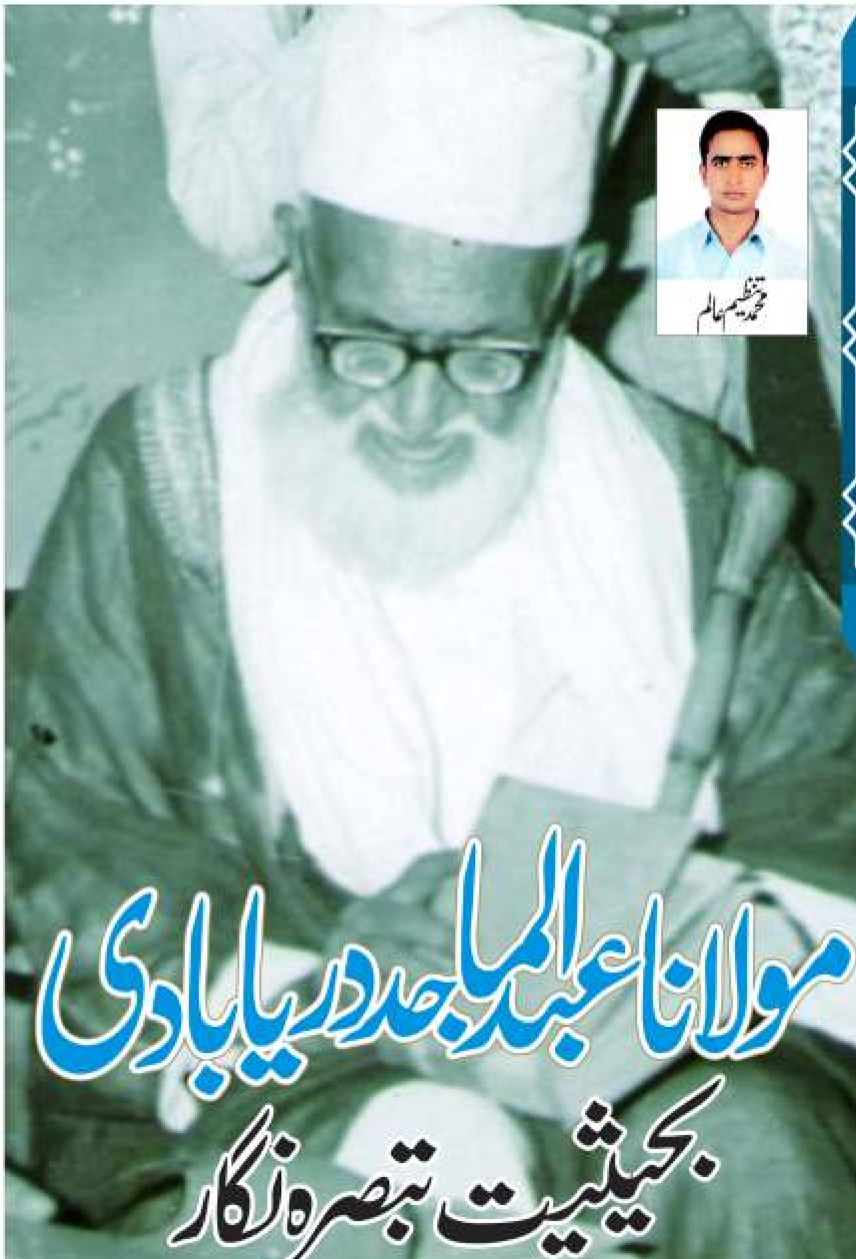

محمد تنظیم عالم

مولانا عبدالماجد دریابادی
بحیثیت تبصرہ نگار

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ ملک کے نامور عالم، ادیب بے مثال، انشا پرداز اور صحافی ہیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ کلام مجید کا ترجمہ وتفسیر ہے جو انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں کر کے علمی ومذہبی حلقوں میں اپنے علمی شغف اور وسعت مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے ادب، انشا، فلسفہ، سوانح، تنقید، سیرت، تفسیر، ترجمہ، تبصرہ نگار اور صحافت ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اسی وجہ سے ان کا شمار برّاعظم صغیر کی موقر شخصیات میں کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے بچپن ہی سے مضمون نگاری شروع کردی تھی، ان کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ان کے دو چھوٹے رسالوں کی شکل میں ہوئی جسے اردو کے مشہور روزنامہ 'وکیل' امرتسر نے شائع کیے۔ مولانا اس وقت انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ آگے چل کر مولانا نے کافی تحریریں لکھیں، ان کی تصانیف کی تعداد بہت ہے۔ چنانچہ انھوں نے فلسفہ، سوانح، سفرنامہ، خطبات اور تفسیر کے علاوہ تبصرہ نگاری کے میدان میں اپنی تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ انھوں نے ادب کے ہر میدان میں طبع آزمائی کی ہے اور تقریباً تمام فن کو اپنے قلم سے سیراب کیا ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھیں، بیسویں صدی کے صاحب اسلوب نثر نگاروں میں ان کا شمار صف اول کے نثر نگار ابوالکلام آزاد، حسن نظامی وغیرہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

زمانہ طالب علمی ہی سے مولانا عبدالماجد دریابادی نے انگریزی ادب کو بھی مرکز توجہ بنایا اور انہماک کے ساتھ انگریزی ادبیات کی ورق گردانی کی۔ انگریزی ادب کے مطالعے کے توسط سے ان کا ذہن فلسفے کی طرف گیا، اور انھوں نے فلسفے پر بھی خوب لکھا، نیز اسی دور میں مولانا کا ذہن تشکیک والحاد کی طرف بھی مائل ہوا۔

مولانا عبدالماجد کی شخصیت کے متعدد پہلو اور متنوع حیثیتیں ہیں، اور ہر حیثیت میں وہ ممتاز نظر آتے ہیں، ان کی ذات قدیم اور جدید علوم کا سنگم ہے۔ مولانا کا شمار اپنے وقت کے جید علما میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں حق گوئی اور صدق نوازی بدرجہ اتم موجود ہے جو انھوں نے ورثہ میں پائی۔

عبدالماجد دریابادی نے علم وادب کے جن مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، ان میں سے ایک صنف تبصرہ نگاری بھی ہے۔ ان کے تبصروں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو ان کے ہفتہ وار اخباروں 'صدق' اور 'صدق جدید' میں شائع ہوئے۔

تبصرہ کے معنی دیکھنے کے ہوتے ہیں یعنی کسی چیز کو دیکھنا اس کا جائزہ لینا، شناخت کرنا یا کسی چیز سے پردہ اٹھا کر اصل صورت واضح کرنا ہوتا ہے۔ گویا تبصرہ نگار کسی کتاب کا مختصر تعارف کراتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ متعارف کرانے کا ہی دوسرا نام تبصرہ نگاری ہے۔ تبصرہ کسی بھی کتاب، رسائل یا ادب پارے کا مکمل طور سے تنقیدی تعارف ہے۔

گیان چند جین تبصرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تبصرہ تنقید کی وہ شاخ ہے جو کسی کتاب یا مختصر تخلیق کے بارے میں کی جاتی ہے۔''

تبصرے کا عمل انسانی زندگی میں کوئی نئی چیز نہیں، جب سے انسان میں شعور پیدا ہوا اس وقت سے ہی کسی بھی چیز کی خوبی اور خامی اس کے پیش نظر رہی ہے۔ اسی طرح جب زبان تحریری شکل میں پیدا ہوئی یا تصنیف کا عمل وجود میں آیا تو تبصروں کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی۔ تبصرے کی روایت دنیا کی ہر زبان میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی ہے۔

اردو میں باقاعدہ اور باضابطہ تبصرہ نگاری کا آغاز 'مخزن'، 'اردوئے معلی'، 'اودھ پنچ'، 'دلگداز' اور 'اردو' وغیرہ رسائل وجرائد سے ہوتا ہے، ان کے مدیروں نے متوازن اور کارآمد تبصرے کیے اور تبصروں کو تلاش کر کے ان سے متعلق موضوعات پر تبصرے کرائے جس سے تبصرہ نگاری جو صرف ایک رسمی چیز ہو کر رہ گئی تھی اس کی افادیت کا احساس پیدا ہوا۔ ان تبصروں سے سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ مثبت اور ٹھوس علمی وادبی مباحث کا آغاز ہوا، جو

سخت وسست تلخ وشیریں انداز لیے ہوئے تھے اس نشیب وفراز کے باوجود ان کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تبصرے میں مختصر طور سے کتاب کے محاسن اور معائب پر روشنی ڈالی جاتی ہے، اوراس میں تصنیف کی اہم خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، اور اسی کے ساتھ مصنف کے نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی جاتی ہے، اس سے قاری کو کتاب کے بارے میں تاثر قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ درحقیقت تبصرہ اصل کتاب، رسالہ یا ادب پارے کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اسی لیے اردو ادب میں تبصرے کی اہمیت مسلم ہے۔

تیز رفتاری کے اس دور میں مختلف چیزوں کی کثرت نے ان کے انتخاب کے عمل کو مشکل تر بنادیا ہے، ضروری اور غیر ضروری اشیا میں فرق کرنا بہت ہی مشکل ہوتا جارہا ہے۔ تیز رفتار اور پیچیدہ عہد میں تبصروں کی اہمیت اور معنویت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اچھی کتابیں اور ذوق رکھنے والے قارئین ہمیشہ ایک دوسرے کی جستجو میں رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمدہ کتابیں گمنام ہوجاتی ہیں اور قارئین تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ اسی لحاظ سے اخبارات اور رسائل میں تبصرے کے کالم اچھی کتاب اور باذوق قاری کے درمیان رابطے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ تبصرے کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے، لیکن اس کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ آج ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پہلے نشر واشاعت کا کاروبار اس قدر وسیع اور آسان نہیں تھا جتنا کہ آج ہے۔ آج تیزی سے کتابیں شائع ہورہی ہیں۔ ان تبصروں کی وجہ سے کتاب کی خرید وفروخت کا سلسلہ بھی تیز ہوجاتا ہے۔ اسی لیے آج تبصروں کی اہمیت بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

تبصرہ نگاری کے اس عمل سے بیک وقت قارئین، مصنفین، اور کتب فروش یکساں طور پر مستفید ہورہے ہیں، ان تمام لوگوں میں سب سے اہم رول تبصرہ نگار کا ہوتا ہے کیونکہ مبصر جس قدر اچھا تبصرہ کرے گا اسی قدر قاری کے لیے آسانی ہوگی۔ تبصرہ نگار کا کام کسی کتاب کا بہ لحاظ موضوع، ہیئت اور ضروری اجزا کا مطالعہ کرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کا ادراک کرنا بھی ہوتا ہے۔ مبصر کا کام قارئین کو کتاب کے بارے میں مطلع کرنا ہے نہ کہ اس کی مخالفت یا موافقت، بلکہ مبصر کتاب کو قاری پر اس طرح منکشف کرتا ہے کہ قاری صحیح اور غلط کا فیصلہ کرسکے۔ یعنی مبصر غیر جانب دار ہوکر خوبیوں اور خامیوں کو بیان کرتا ہے۔ کیونکہ کتاب کی اہمیت اور قدر وقیمت کا اندازہ بھی تبصروں سے ہوتا ہے۔

مختلف مبصرین نے مختلف عمدہ تبصرے لکھے اور تبصرہ نگاری کو بحیثیت فن تسلیم کیا اور اس کو ایک مقام ومرتبہ عطا کیا۔ تبصرہ نگار کی روایت میں عبد الماجد دریابادی کا اپنا ایک الگ مقام ومرتبہ ہے۔ ان کی مبصرانہ شخصیت محتاج تعارف نہیں، انھوں نے جہاں علم و ادب کے مختلف جہات میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تبصرہ نگاری کے فن کو بھی اعتبار بخشا۔ ڈاکٹر سید فضل امام ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولوی عبد الماجد دریابادی ہمارے ان تبصرہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے تبصرہ نگاری کے فن کو ایک مقدس سنجیدگی اور وقار بخشا ہے۔ یوں تو انھوں نے مقدمے، دیباچے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کے قلم کے جوہر تبصروں میں کھلتے ہیں۔ وہ علوم مشرقیہ کے منتہی اور علوم مغربیہ سے بخوبی واقف تھے۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تبصروں میں بھی فلسفیانہ افکار ایک متوازن اور دل چسپ انداز لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولوی عبد الماجد دریابادی انشائیہ نگار اور انشا پرداز بھی ہیں۔ ان کے تبصرے کا اسلوب ایسا ہے کہ انشائیہ کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن انشائیہ نہیں ہے وہ اسی مخصوص اور منفرد انداز سے ایسی گہری اور پتے کی بات کہہ جاتے ہیں کہ دل کشی اور محویت تادیر قائم رہتی ہے۔ وہ ان تبصرہ نگاروں میں ہیں جو بلاوجہ کی قابلیت نہیں بگھارتے بلکہ اپنے موضوع کے پیش نظر رہ کر تصنیف اور تخلیق پر تبصرہ کرتے ہیں''۔

تبصرہ نگاری تنقید نگاری کا بدل نہیں ہے، البتہ تبصرے میں بہت کچھ تنقید کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ تبصرہ نگاری ہلکے پھلکے انداز میں کسی تحریر کا تعارف ہے جس میں موٹے طور پر زیر بحث تحریر کے نقوش واضح کیے جاتے ہیں، اور اسی ضمن میں تحریر کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی گفتگو کی جاتی ہے۔ تبصرہ نگار کی علمی وادبی صلاحیت جس قدر وسیع ہوگی اور اس کی نظر فن وادب پر جتنی گہری ہوگی، اس کا تبصرہ بھی اسی معیار کا ہوگا۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے تبصرہ نگاری کے فن پر باضابطہ کوئی مضمون نہیں لکھا ہے۔ البتہ ان کے تنقیدی مضامین میں تبصرہ اور تبصرہ نگاری کے متعلق خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ چونکہ ان کی نظر میں مبصر بھی نقاد ہی کی طرح ہوتا ہے، لہٰذا زیادہ تر تبصرے تنقیدی نوعیت کے ہیں اور انھوں نے فن پارے کو تنقیدی نظر سے پرکھا ہے۔ اور یہ درست ہے کہ تبصرہ مکمل تنقید تو نہ سہی مگر اس میں بہت کچھ تنقید کا شائبہ موجود ہوتا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ تبصرہ تنقید کا پہلا زینہ ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی ایسے تبصرہ نگار تھے جنھوں نے اس فن کو سنجیدگی اور وقار بخشا ہے۔ یوں تو انھوں نے مقدمے، دیباچے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں لیکن ان کے قلم کے جوہر تبصروں میں کھلتے ہیں۔ ان کے تبصروں کی تعداد بے شمار ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے تبصروں کا ایک مجموعہ 'تبصرات ماجدی' کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں تقریباً ڈھائی سو تبصرے شامل ہیں۔ 'تبصرات ماجدی' کے زیادہ تر تبصرے ان کے اخبار 'صدق' اور 'صدق جدید' میں پہلے شائع ہوچکے ہیں۔ مولانا کے کچھ تبصرے 'رسالہ الناظر' میں بھی شائع ہوئے۔ اس کتاب میں تقریباً بیس اصناف پر تبصرے شامل ہیں، مثلاً افسانے، اقبالیات، تاریخ، تذکرہ، تنقید، حکایت، خاکے، خطوط، داستان، ڈرامہ، روزنامچہ، سفرنامہ، سماجیات، سوانح، شاعری، طنز ومزاح، لسانیات، لغت، مضامین اور ناول وغیرہ۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کے تبصروں کی سب سے اہم خصوصیت ان کا بے تکلف انداز ہے۔ وہ فن پارے سے جس طرح محظوظ ہوتے ہیں اس کا اظہار اپنے تبصرے میں کردیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور ذوق نکھرا اور پختہ ہے۔ ان کی تبصرہ نگاری کے انداز کو اس اقتباس میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے سید فضل احمد کریم کے مجموعہ کلام 'نغمۂ زندگی' کے متعلق تحریر کیا ہے:

''کتاب کہیے یا ننھے منے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ، اردو دیوان ہے ایک آئی۔ سی۔ ایس۔ شاعر کا، اور مجموعہ ہے ایک آکسن کے اردو کلام کا۔ اپنی نوعیت میں شاید پہلی اور انوکھی چیز ...... شیوہ طراز شاعر ہے کہ قدم قدم پر مات دیتا ہے اور بھولا بھالا ناقد ہے کہ مات پر مات کھاتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہوگیا۔ وہی ردیف وار۔ اب کہیں استاد غالب سے مشورے ہورہے ہیں، کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں کہ لیجیے صفحہ 88 آگیا اور اب دو بدو ہونے لگی، فارسی کے استاد منوچہری سے......''۔

مندرجہ بالا تبصرے میں فضلی کی غزل گوئی پر غالب، حافظ اور منوچہری کے اثرات کی طرف واضح اشارے سے مولانا عبد الماجد دریابادی کی شعریات اور ادبیات پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ فضلی کی شاعری پر عالمی ادبیات کے اثرات کی طرف بھی انھوں نے اشارے کیے ہیں۔ اس تبصرے میں مولانا کے اسلوب تحریر کو بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جس میں ان کی انفرادیت صاف طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں برجستگی

اور بے ساختگی کی شان نمایاں ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تبصرہ نگاری کا ایک اور عمدہ نمونہ ملاحظہ ہو جو انھوں نے 'ضرب کلیم از علامہ اقبال' کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ تبصرہ مولانا کے اقبال سے شغف کی واضح مثال ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال مسلمانوں کی قوم کے حکیم اقبال کا سن جوں جوں پختگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے حکمت و شاعری پختہ تر ہوتی جارہی ہے۔ 'خام' تو کبھی بھی نہ تھی۔ شاعری سے مراد رسمی غزل گوئی اور قافیہ پیمائی نہیں۔ مراد وہ شاعری ہے جو رومیؒ کی تھی سنائی کی تھی۔ وہ شاعری نہیں جو حق کی طرف بلاتی، لاتی ہے.........اقبال کا پیام ساری دنیا کے لیے ہے، دنیائے اسلام کے لیے خصوصاً۔ قرآن کی بھی مخاطب ساری نوع انسانی ہے لیکن حقیقتاً فائدہ اٹھانے والے صرف مومنین ہیں۔ اقبال اپنا دردِ دل سناتا تو سب ہی کو چاہتے ہیں۔ لیکن سنتے وہی ہیں جو پہلے سے اقبال کے خدا کی، اقبال کے رسول کی سن چکے ہیں۔ تازہ ترین افادہ کا نام ''ضرب کلیم'' ہے۔ زبان اردو، ضخامت 281 صفحات، طباعت صاف و روشن، قیمت درج نہیں جو کچھ بھی ہے بہر حال کتاب کی معنویت سے کم تر ہی ہوگی۔ عصائے موسیٰ کی قیمت کا اندازہ کوئی صاحب کیا یوں بھی فرمائیں گے کہ اتنے فٹ لمبی اور اتنے انچ موٹی۔ جنگل کی لکڑی کا مول تول بازار میں کیا ہے۔ ضرب کلیم کا وصف امتیاز حکیمانہ ژرف نگاری ہے۔ ہر عنوان وقت نظر کا ایک مرقع، ہر صفحہ نکتہ سنجیوں کا ایک گلدستہ کوئی صفحہ کہیں سے کھول لیجیے ایک ہی چمن کی گلکاریاں نظر آئیں گی''۔

مندرجہ بالا اقتباس مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے کا ایک حصہ ہے، چونکہ تبصرہ طویل ہے اس لیے اس میں ایک حصے کو پیش کیا گیا ہے۔ اس تبصرے کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی جب اقبال پر تبصرہ کرتے ہیں تو وہ اقبال کے اشعار کی خوب داد و تحسین کرتے ہیں، اور یہ لازمی ہے کہ اقبال کا مرتبہ بہت بلند و اعلیٰ ہے جو تمام لوگوں پر اپنا اثر ڈالتا ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ عبدالماجد دریابادی بھی اعلیٰ اسلامی اقدار کے حامل ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ عالم باعمل بھی ہیں۔ مولانا کے نزدیک اقبال کی حیثیت ایک فلسفی یا شاعر سے بڑھ کر ایک 'پیام بر' کی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ 'ضرب کلیم' کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کو اقبالیات سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا، وہ اقبال کے معتقد نظر آتے ہیں، انھوں نے جگہ جگہ اقبال کی شاعری کی خوب دل کھول کر تعریف کرتے نظر آتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اقبال پر لکھنے والا ان کی صلاحیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

مولانا کے اسلوب تحریر کی انفرادیت ایجاز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ فکر اقبال کا تجزیہ بہت سہولت مگر ایجاز و اختصار سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک چھوٹے سے جملے میں کتاب کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصروں کی فہرست کافی طویل ہے، اور ہر تبصرہ اپنی خاص اہمیت و انفرادیت رکھتا ہے۔

> مولانا عبدالماجد دریابادی کا تبصرہ 'ضرب کلیم' کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کو اقبالیات سے ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا' وہ اقبال کے معتقد نظر آتے ہیں' انھوں نے جگہ جگہ اقبال کی شاعری کی خوب دل کھول کر تعریف کرتے نظر آتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اقبال پر لکھنے والا ان کی صلاحیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے تنقیدی اوصاف سے متصف ہیں۔ مولانا کو تنقید کے لوازمات کا بخوبی علم تھا۔ حالانکہ انھوں نے تنقید پر کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی، البتہ تنقیدی مضامین کی ان کے یہاں اچھی خاصی تعداد ہے جس کو پڑھنے کے بعد ان کے تنقیدی افکار کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے اپنے تبصروں میں اپنی تنقیدی صلاحیت کو بخوبی برتا ہے۔ چنانچہ آل احمد سرور کی کتاب 'تنقیدی اشارے' پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کا تبصرہ اس کی واضح مثال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ سولہ ادبی عنوانات پر سرور صاحب کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ مضامین کا تنوع چند عنوانات سے ظاہر ہوگا۔ انداز بیان سلیس و دلچسپ ہے، الفاظ اور ترکیبیں کہیں کہیں ایسی آگئی ہیں جو پرانے ادیبوں کو کھٹکیں گی، تاہم بہ حیثیت مجموعی کتاب اردو ادب کے طلبہ کے مطالعہ میں رہنے کے قابل ہے اور ریڈیائی تقریروں کا جو اصل مقصد ہوتا ہے یعنی تفریح کے ساتھ تعلیم وہ اس مجموعے سے بخوبی پورا ہوجاتا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی جب کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہیں تو اس کتاب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا بھی ذکر قاری کے سامنے کردیتے ہیں۔ کتاب کی اہمیت و افادیت کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ پڑھنے کے لائق ہے یا نہیں۔ اسی طرح اس کی صنف سے متعلق بحث کرتے ہیں کہ اس صنف کا اردو ادب میں کیا مقام و مرتبہ ہے۔

انھوں نے اپنے ہر تبصرے کو ذاتی طعن و تشنیع سے پاک رکھتے ہوئے اسے فن کا درجہ دیا ہے، اور صداقت و حق گوئی کو اپنا شیوہ و طرۂ امتیاز بنایا ہے۔ ان کے تبصروں میں زبان و بیان کی شگفتگی اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ وہ بے جا مدح و تحسین اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کرتے ہیں، انھوں نے اپنے تبصروں کو غیر جانب داری اور ذاتی رعایت و مروت سے پاک رکھا ہے۔ ان کے تبصرے خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی میں توازن و اعتدال کی بہترین مثال ہیں۔ کتاب کے معیار کے تعین میں بھی انھوں نے حق گوئی سے کام لیا ہے۔ ان کے تبصروں سے ان کی وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں ان کی نظری تنقید، اسلامی تصور، سیاسی، سماجی اور ادبی مسائل کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان تبصروں میں ایسی تنقیدی آرا ہیں جو آئندہ آنے والے دور میں بھی اپنی اصلیت قائم رکھیں گی اور قاری کی آبیاری کرتی رہیں گی۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو مولانا عبدالماجد دریابادی کو تبصرہ نگاری کے میدان میں منفرد اور قابل قدر مرتبہ و مقام پر فائز کرتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے تبصروں کے ذریعے نئی نسل کی ذہن سازی بھی کی ہے اور نوجوان ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی

■

Mohd Tanzeem Alam
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9891116438
Email.: tanzeem@gmail.com

معراج الاسلام

جاپان میں اردو
تاریخ و تدریس

جنگ عظیم اول نے دنیا کے بہت سے ممالک کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا جس کے نتیجے میں علم و تحقیق کی بازیافت اور لسانی و ادبی نشر و اشاعت کا ایسا سیل رواں وجود میں آیا جس کی طاقتور موجیں دنیا کے مختلف ممالک سے ٹکرائیں، اس تناظر میں اردو کی اہمیت و افادیت بھی کم مائیگی کا شکار نہیں تھی بلکہ اس کی اہمیت روز فزوں تر ہونے لگی اور یہ زبان اپنے دائرۂ تخلیق سے آگے بڑھ کر دیارِ غیر میں موجود شائقین اردو کے مشام جاں کو معطر کرنے لگی اور بہت سی اردو کی نئی بستیاں آباد ہونے لگیں۔ سردست 'جاپان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ و تدریس' پر روشنی ڈالنا ہے۔

جاپان میں اردو زبان و ادب کے ابتدائی نقوش کی تحقیق و جستجو سے پتا چلتا ہے کہ کوئی ایک صدی سے زائد کے عرصے پر محیط ہے 14 اپریل 1899 کی بات ہے جب ٹوکیو میں ایک اسکول کا قیام عمل میں آیا جس کا نام ٹوکیو گائگو گوگاکو یعنی ٹوکیو اسکول آف فارین لنگویجز تھا۔ بیسویں صدی عیسوی میں جاپان براعظم ایشیا کا وہ واحد ملک تھا جو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شامل تھا۔ جہاں کی جدید ٹیکنالوجی اور تعلیمی و تحقیقی ارتقا کی طرف نباضِ قوم ڈاکٹر اقبال نے 1906 میں اپنے مقالہ 'قومی زندگی' میں اشارہ کیا تھا۔

''حال کی قوموں میں اہل اٹالیہ نو خیز فرنگستانی ہیں۔ جاپانیوں کو دیکھو کہ کس حیرت انگیزی سے ترقی کر رہے ہیں ابھی تیس چالیس سال کی بات ہے یہ قوم قریباً مردہ تھی۔ 1868 میں جاپان کی پہلی تعلیمی مجلس قائم ہوئی۔ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے نئے رموز وحیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے۔''

(قومی زندگی، از ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، جمعدار سیٹم پریس لاہور، 1909، ص 9)

اہالیان جاپان کا اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے کے پس پردہ کون سے محرکات تھے یہ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن امکان اس بات کا ہے کہ ان کو اپنی بڑھتی ہوئی اقتصادیات اور تہذیبی قدر شناسی کی بنیاد پر اردو کی اہمیت کا احساس ہوا ہوگا جو اردو زبان اپنے دامن میں مختلف تہذیبوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس زمانے میں جاپان دنیا کے مختلف علوم و فنون کو حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ 1908 میں ٹوکیو اسکول آف فارین لنگویجز کا علاحدہ قیام عمل میں آیا اور اس میں شعبہ ہندستانی کو ایک مستقل شعبے کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ یہ ایک سالہ کورس تھا اور طلبا کی تعداد محض پانچ تھی۔ اس طرح تین سال گزرے، آخر کار 1911 کا وہ سال آیا اس شعبے کو ترقی دے کر تین سالہ کورس شروع کیا گیا اور طلبا کی تعداد بھی دوگنی کر دی گئی اور یہ شعبہ مستقل بنیادوں پر کام کرنے لگا اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ جاپان میں اردو زبان و ادب کی تدریس کا باقاعدہ آغاز 1911 ہے۔ یہ شعبہ یوں ہی جاری رہا 1927 کا سال شعبہ ہندوستانی کے لیے ایک عظیم انقلاب ثابت ہوا۔ جب اسی سال شعبہ ہندوستانی کے تین سالہ کورس میں مزید ایک سال کا اضافہ کر کے چار سالہ کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اسکول کے نام میں قدرے تبدیلی کے ساتھ تعلیمی دورانیہ بھی تین سال کر دیا گیا۔ دراصل یہ تبدیلی ہنگامی حالات کا تقاضا تھی۔ مجتبیٰ حسین اپنی کتاب 'جاپان چلو، جاپان چلو' میں جاپان میں مزید اردو کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''1883 میں اسے ایک اسکول کے طور پر شروع کیا گیا تھا، مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد اس ادارے کو 1949 میں ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کا نام دیا گیا۔ یہاں دنیا کی بڑی زبان کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اردو،

ہندی تعلیم کا انتظام ہندو پاک مطالعات کے تحت ہے۔''
(جاپان چلو جاپان چلو، از مجتبیٰ حسین، حسامی بک ڈپو مچھلی کمان، حیدرآباد، 1994، ص 60)

1951 تک اس یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے کوئی درجنوں طلبا تعلیم حاصل کر چکے تھے، جس میں ایک بھی لڑکی شامل نہیں تھی کیونکہ کہ شعبے کی روایت رہی تھی کہ یہاں صرف لڑکوں کو داخلہ ملتا تھا، لیکن اس دوران لڑکیوں کو مذکورہ شعبے میں داخلے سے محروم رکھنے کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوئی، لڑکیوں کو بھی داخلہ دینے کے حوالے سے قانون تشکیل دیا گیا جس کی بنیاد پر سال میں ایک لڑکی کو بھی داخلہ دیا جانے لگا لیکن بہ لحاظ تعداد ہمیشہ لڑکوں کا ہی غلبہ رہا۔ لیکن اب حالات، تقاضے اور منظر نامے کافی حد تک مختلف ہیں۔ سوزوکی تاکیشی اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

'' 1951 تک ٹوکیو اسکول آف فارین لنگویجز کے ہندوستانی شعبے سے کل 329 طلبہ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ جن میں ایک طالبہ بھی شامل نہیں تھی۔ اس سال (نئے) جامعہ کے شعبہ ہندستانی میں جس کا سرکاری نام شعبہ سات حصہ اول تھا، پہلی بار ایک طالبہ داخل ہوگئی۔ جب سے ہر سال ایک دو طالبات کو شعبے میں داخلہ ملنے لگا۔''
(جاپان اردو کا وطن ثانی، جامعہ ٹوکیو برائے مطالعات خارجی، ٹوکیو 2008، مضمون: جاپان میں اردو تعلیم کی تاریخ از پروفیسر سوزوکی تاکیشی، ص 268)

تعلیمی سلسلہ یوں ہی جاری رہا اور 1961 کا سال آیا جس سال شعبہ ہندوستانی کو شعبہ اردو اور شعبہ ہندی میں تقسیم کر دیا گیا۔ دونوں شعبے کے اساتذہ اپنے اپنے شعبے کے فروغ و ارتقا اور طلبا کی تعداد میں اضافے کے لیے تگ و دو کرنے لگے۔ 1966 میں ایم اے کا کورس شروع کیا گیا۔ نئی یونیورسٹی کے قیام سے لے کر اب تک سیکڑوں کی تعداد میں طلبہ و طالبات گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن تک کی تعلیم مکمل کر چکے ہیں۔ شعبہ اردو میں ایم اے کے طلبہ کے لیے لازم ہے کہ وہ شعبے کی طرف سے تفویض کردہ موضوع یا اپنی پسند کے موضوع پر مقالہ قلم بند کریں لیکن طلبہ کے انتخاب اور پسند کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اب تک بہت سے موضوعات پر مقالے قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً نذیر احمد اور ان کے کارنامے، سعادت حسن منٹو اور ان کا فن، تمثیلی نثر اور سب رس، کرشن چندر اور ان کی فنی خصوصیات، اردو ادب اور سکھ مصنفین، جدید اردو ادب میں خواتین کا حصہ، اقبال کے جاوید نامہ میں مشرق و مغرب کے نظارے، وغیرہ۔

جاپان میں اردو زبان و ادب کی شمع روشن کرنے میں مقامی اور مہمان اساتذہ کی سعی پیہم، بے انتہا محنت و لگن، اور جذبہ محبت کی بدولت ہے۔ مہمان اساتذہ میں مولانا برکت اللہ، ہر ہر ناتھ تو مر عطار، پروفیسر بدر الاسلام فضلی، پروفیسر معین الدین عقیل اور تبسم کاشمیری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ فضلی کو دسمبر 1947 میں لیکچرر شپ کی دعوت دی گئی، انھوں نے کوئی ڈیڑھ سال تک پروفیسر گاموکی رفاقت میں اردو زبان و ادب کی ترویج کا فریضہ انجام دیا اور وہاں سے جب ہندستان واپس آئے تو جاپان کے متعلق ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس کو حقیقت جاپان کے نام سے انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) نے سلسلہ 79 کے تحت شائع کیا۔ مصنف تمہید میں لکھتے ہیں:

''یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی غیر ممالک کا علم بھی نہایت محدود ہے۔ بالخصوص شرق اقصی یعنی چین و جاپان کے متعلق تو لاعلمی و غلط فہمی حد سے گزر رہی۔''
(حقیقت جاپان، از بدر الاسلام فضلی، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن، 1934، ص 8)

اردو زبان و ادب کی تدریس محض ٹوکیو یونیورسٹی کے احاطے تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ جاپان کی ہی دوسری قابل اعتبار یونیورسٹی 'اوساکا یونیورسٹی میں بھی اردو زبان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ کوئی ایک صدی قبل شروع کیا گیا تھا۔ اوساکا اسکول آف فارین لنگویجز کا قیام 1921 میں ہوا تھا۔

اسی تمہید میں جاپان میں اردو زبان کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''جاپان کے متعلق عمدہ لٹریچر یوں تو ہماری تمام ملکی زبانوں میں موجود نہیں ہے لیکن اس خصوص میں اردو لٹریچر کی بے بضاعتی اور کم مائیگی تو نہایت افسوس ہے۔''
(ایضاً، ص 8)

یہ کتاب ٹوکیو اسکول آف فارن لنگویجز کے تعارف کے حوالے سے بنیادی ماٰخذ کا درجہ رکھتی ہے جس میں بہت سی نئی اور اہم معلومات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور شعبے کے قوانین و ضوابط، نظام داخلہ اور طلبہ کی تعداد کے حوالے سے قدرے خامہ فرسائی کی گئی ہے مصنف تحریر کرتے ہیں:

''ہر شعبے میں داخلہ ہر سال ہوتا ہے مگر ملایا اور ہندستانی شعبہ جات میں ایک سال داخلہ ہوتا تھا اور ایک سال نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح ایک وقت میں صرف دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ آج کل صرف پہلی اور تیسری جماعتیں موجود ہیں۔ پہلی جماعت میں صرف پندرہ طلبا ہیں اور تیسری میں دس۔'' (ایضاً، ص 27)

تدریسی سرگرمیوں اور طلبا کی حصول یابیوں کے حوالے سے مزید تحریر کرتے ہیں:

''پہلی جماعت نے آٹھ ماہ میں کافی ترقی کی ہے۔ اردو کی تیسری کتاب جو یوں ہی رائج ہے، خوب صفائی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ املا صحیح لکھتے ہیں اور کچھ گفتگو بھی کر لیتے ہیں۔'' (ایضاً، ص 30)

مہمان اساتذہ میں پروفیسر نور الحسن کا نام اس حوالے سے اہم ہے کہ وہ اکتوبر 1932 سے 1948 تک ٹوکیو کے شعبہ اردو سے منسلک رہے اور پروفیسر گاموکے تعاون سے اردو بول چال کی کتاب تیار کی۔ ان کا سب سے نمایاں کارنامہ 'جاپانی بچوں کے گیت' ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں 1939 میں انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا تھا۔ شعبے سے وابستہ مہمان اساتذہ میں کیشو لال سبروال اور ہندستانی سفارت کار ستیہ پرکاش ترپاٹھی بھی ہیں۔ لیکن ان کی خدمات پردہ خفا میں ہیں۔

اس یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جن مقامی اساتذہ نے خدمت کا فریضہ انجام دیا ان میں پروفیسر آر گامو، پروفیسر ڈوئی لیکن جب شعبہ ہندستانی کو شعبہ اردو اور شعبہ ہندستانی میں تقسیم کر دیا گیا تو یہ شعبہ ہندستانی سے منسلک ہو گئے۔ پروفیسر کوریا ناگی تسونیو، سوزوکی تاکیشی، ہیروشی ہاگیتا وغیرہ نے اپنی شبانہ روز سعی پیہم سے شعبہ اردو کو عظمت و وقار کی بلندیاں عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو زبان و ادب کی تدریس محض ٹوکیو یونیورسٹی کے احاطے تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ جاپان کی ہی دوسری قابل اعتبار یونیورسٹی 'اوساکا یونیورسٹی میں بھی اردو زبان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ کوئی ایک صدی قبل شروع کیا گیا تھا۔ اوساکا اسکول آف فارین لنگویجز کا قیام 1921 میں ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس اسکول کو قائم کرنے میں اوساکا کے ایک تاجر کی بیوی چوکو پاشی نے دس لاکھ ین (جاپانی کرنسی) کی مدد دی تھی۔ جو اس زمانے میں یقیناً بڑی اور قابل قدر رقم تھی۔ اس دور میں اسکول میں یورپین شعبوں کے علاوہ ایشیائی زبانوں کے محض چار شعبے تھے: چینی، منگولس، ملائی اور ہندستانی – 1944 میں اوساکا کے اسی اسکول کو کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے بعد اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دے کر اس کا نیا نام اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز رکھ دیا گیا۔ اس

کے تحت کچھ عرصے بعد شعبہ ہندستانی کا نام شعبہ ہندو پاک رکھ دیا گیا۔ اسی میں اردو اور ہندی کی تعلیم الگ الگ طور پر شروع کی گئی۔ اس شعبے میں چار سالہ گریجویشن کورس اور دو سالہ ایم اے کورس کا نظام رائج ہے۔ اوساکا یونیورسٹی کے نام کی تبدیلی اور وہاں کے طلبہ و طالبات کی حصول یابیوں کے حوالے سے پروفیسر سوزوکی تاکیشی اپنے مضمون 'جاپان میں اردو تعلیم کی تاریخ' میں تحریر کرتے ہیں:

''اوساکا گائیکو گوگو اسکول کو بھی ٹوکیو کی طرح 1944 میں ایک بار اپنا نام بدلنا پڑا۔ پھر یونیورسٹی بننے کے بعد ہندستانی شعبے کا پرانا نام بھی شعبہ ہندستان و پاکستان میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اپریل 1966 کا واقعہ ہے۔ تین سال بعد اپریل 1966 کا واقعہ ہے۔ تین سال بعد اپریل 1969 میں جنوبی ایشیا کے متعلق مزید مطالعے کے خواہش مند طلبہ و طالبات کے لیے ایم اے کا کورس کھولا گیا۔ شعبہ ہندستان و پاکستان سے اب تک سات سو طلبہ و طالبات بی اے کر چکے ہیں۔ جن میں نصف کے قریب تعداد اردو کی ہے۔'' (ص 267)

اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کے شعبہ اردو کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد اساتذہ نے اپنے خون جگر سے اس شعبے کی آبیاری کی۔ ان میں ٹوکیو یونیورسٹی سے پاس آؤٹ اوگا تاواشی تھے۔ مہمان لیکچرارز میں مہا دیو رائے سراہ تھے، لیکن ان کی خدمت کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ اختصار کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔ محمد کریم کو پانچ سال کے لیے لیکچرار بنایا گیا، مدن لال اور سنت ورما بھی مدعو کیے گئے۔ 1970 میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کو دو سال کے لیے شعبے کی خدمت کی ذمے داری دی گئی۔ ان دو سالوں میں انھوں نے اردو کو جن بلندیوں تک پہنچانے میں اہم فریضہ انجام دیا اس کے معترف اور احسان شناس آج بھی ہیں۔ انھوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر کچھ نئے اور انوکھے کام انجام دیے۔ مثلاً نصاب کو از سر نو ترتیب دینا اور اسی کے مطابق درسی کتاب کی تیاری و فراہمی، درجن بھر سے زائد ٹیپ تیار کرنا اور ایک ادبی جریدے کا اجرا وغیرہ۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا نام بھی شعبے کی گراں قدر خدمات انجام دینے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر چہ ان سے قبل متعدد مہمان اساتذہ مدعو کیے جاتے رہے ہیں، لیکن ان کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ مقامی اساتذہ میں پروفیسر کاگایا کان، پروفیسر باما گوچی تسونیو، پروفیسر ماتسو مورا تاکا میتسو، کاتاؤ کا ہیروجی وغیرہ ہیں۔ آخر الذکر کی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ ہر دو مذکور یونیورسٹیاں سرکاری ہیں۔ اس لیے دونوں میں بہت سی باتوں میں مماثلت پائی جاتی ہے مثلاً نصاب تعلیم، درسی کتابیں، نظام امتحان، اساتذہ اور طلبہ کی تعداد وغیرہ۔ اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز کے علاوہ اوساکا ہی میں ایک دیگر یونیورسٹی روئے مون گاکوین ہے۔ اس میں اردو کا ایک سالہ نصاب 1971 سے پڑھایا جا رہا ہے۔ اردو پڑھنے والے طلبہ جنوبی ایشیا کی تاریخ و ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر سال تقریباً بیس طلبہ اردو کورس لیتے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں جنوبی ایشیا کی تاریخ کے ماہر پروفیسر اوساموکاندا اردو کے استاد رہے ہیں۔

جاپان میں اردو کی تاریخ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے دائتو بونکا یونیورسٹی کو صریحاً نظر انداز کرنا ادبی و لسانی اخلاقیات کے خلاف ہے۔ 1956 میں یہاں اردو کی تدریس کا آغاز ایک مضمون کے طور پر کیا گیا تھا جو اس وقت تک اسی روایت پر گامزن ہے، اور مستقل شعبے کی قیام سے محروم ہے۔ یہاں پر دو سالہ اردو کورس ہے اور اساتذہ بھی زیادہ تر غیر مستقل بنیادوں پر منتخب کیے جاتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کے اساتذہ میں سب سے اہم اور قابل فخر نام ہیروجی کتاؤکا کا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس یونیورسٹی میں اردو بحیثیت مضمون کا آغاز ان کی اردو کے تئیں ان کی بے پناہ محبت، شوق اور جذبہ خیر کی بدولت ہوا تھا۔ پروفیسر کتاؤکا کا اصل میدان جدید اردو ادب ہے۔ اردو کے اہم افسانوں کے تراجم ان کی ابتدائی کاوشیں ہیں۔ وہ سعادت حسن منٹو کی درجن بھر سے زائد کہانیوں کا جاپانی ترجمہ شائع کروا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جدید شعرا جیسے اقبال، فیض، میراجی، راشد، مجاز، اختر شیرانی، ناصر کاظمی اور اکبر الہ آبادی پر مقالات بھی تحریر کر چکے ہیں۔ ان کا سب سے اہم کام غالب اور فیض کا مکمل جاپانی ترجمہ ہے۔

ان جامعات کے علاوہ اردو کے فروغ کا ایک ادارہ 'ریڈیو جاپان' بھی ہے جہاں سے ہر روز جنوبی ایشیا کے لیے پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ نشریاتی اداروں میں جاپان کا NHK اہم مقام رکھتا ہے۔ یہاں سے کوئی بائیس غیر ملکی زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جس میں برصغیر کی دو مقبول ترین زبانیں: اردو اور ہندی بھی شامل ہیں۔ یکم جون 1940 کو ہندی کی نشریات کا آغاز کیا گیا کوئی ڈھائی سال بعد اردو کو شامل کر کے اس کا نام ہندستانی سروس رکھ دیا گیا۔ 1955 سے خاص اردو سروس کے بعد 1991 سے روزانہ کی بنیاد پر صبح میں اردو نشریات کا بلیٹن جاری ہے۔

اردو زبان کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ محض یونیورسٹی کے کیمپس تک محدود نہیں ہے بلکہ شبانہ اسکولوں میں بھی اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ روز افزوں مقبولیت سے اس

دیار غیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا کے باب میں جاپان کو نظر انداز کرنا نہ صرف یہ کہ علمی بد دیانتی ہوگی بلکہ اردو کے تئیں تعصب و تنگ نظری کا پہلو بھی کارفرما ہوگا۔ بر صغیر ہند و پاک کے بعد جاپان کو اردو کا وطن ثانی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا

بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اردو پڑھنے اور پڑھانے کے مواقع میں اب تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ نیز جاپان میں مشاعروں کی وقیع اور طویل روایت بھی رہی ہے جس میں جنوبی ایشیا کے ماہرین کے ساتھ خود جاپانی محبان اردو کا مجمع بھی ہوتا ہے جو اپنی تخلیقی کاوشوں سے سامعین کو لطف اندوز کرنے کے ساتھ زبان کے فروغ و ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جاپانی اردو شعرا کی فہرست میں ہیروجی کتاؤکا کا نام سرفہرست ہے۔

جاپان میں ترجمہ نگاری کی طویل اور قدیم روایت رہی ہے کہ وہ دنیا کے اہم ادبی شہ پاروں کو اپنی زبان میں منتقل کر کے جاپانیوں سے متعارف کراتے ہیں۔ یہی معاملہ اردو زبان کے ساتھ بھی رہا ہے۔ پروفیسر آر گامو سے لے کر سوزوکی تاکیشی، ہیروجی کتاؤکا اور ہیروشی ہاگیتا تک ترجمے کی پاکیزہ روایت رہی ہے جس کا فائدہ اردو زبان و ادب اور اہل جاپان کے حق میں یہ ہوا کہ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس اور خدیجہ مستور وغیرہ اور شاعروں میں ولی دکنی، میر غالب، اور اقبال وغیرہ قد آور نام اب جاپانیوں کے لیے اجنبی نہیں رہے۔

مختصر یہ کہ اب جاپان میں شوقیہ اردو سیکھنے والوں کی قابل قدر تعداد ہے جو پوری عرق ریزی سے اردو کی حلاوت و شیرنی کو پانے میں پیہم مصروف کار نظر آتے ہیں، نیز دیار غیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا کے باب میں جاپان کو نظر انداز کرنا نہ صرف یہ کہ علمی بد دیانتی ہوگی بلکہ اردو کے تئیں تعصب و تنگ نظری کا پہلو بھی کار فرما ہوگا۔ برصغیر ہند و پاک کے بعد جاپان کو اردو کا وطن ثانی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

■

Merajul Islam
Narmada Hostel
Room No-124
JNU
New Delhi - 110067

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ھی کی ایک شکل ھے جس میں کتاب کے مواد' اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ھے- کتاب کے ماله وما علیه اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ھیں- اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رھی ھے' خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ھی مفید تھا- تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ھے اس لیے مبصرین کو چاھیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید' افراط و تفریط' بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اھم اور افادی نکات کی نشاندھی کریں- اردو کے علاوہ انگریزی' ھندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ھوتی ھیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ھو گا-

کلیات ذوق

شاعر: محمد ابراہیم ذوق، مرتبہ: تنویر احمد علوی
صفحات: 456، قیمت: 240 روپے، پانچویں طباعت: 2021
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عبدالرشید، M-109، گلمرگ اپارٹمنٹ
ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ 110025

کتابوں کی اشاعت سے قومی اردو کونسل کا مقصد ومنشا افراد کو خواندہ و تعلیم یافتہ بنانے کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کی تشکیل وتعمیر میں مثبت کردار ادا کرنا ہے تاکہ ملک ہر اعتبار سے ترقی کرے۔ تہذیب وثقافت کو تحفظ فراہم ہو۔ پرامن ماحول میں تخلیقی ذہن کو نئی نئی ایجادات، تخلیقات اور انکشافات کا موقع ملتا ہے جس سے ملکی عوام نئے نئے اصول ونظریات سے واقف ہوتے ہیں۔ نئی روشنی سے سماج آگے بڑھتا ہے۔

قومی اردو کونسل نے تمام شعبہ ہائے حیات کو منور و درخشاں کرنے کے لیے ان تمام علوم نافعہ پر مشتمل کتابوں کی اشاعت کی ہے جو کسی نہ کسی طریق پر تخریبی ومضرت رساں علم کی نفی کرتی ہیں اور سماج ومعاشرے میں فساد و بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔ سائنس، سوشل سائنس، طب اور ادبیات سے متعلق قومی اردو کونسل نے باضابطہ پینل کی تشکیل کی ہے جو بخوبی اپنی اپنی ذمے داریاں نبھار ہے ہیں۔ سماج کو مہذب وشائستہ بنانے کے لیے کلاسیکی و جدید ادب پر مشتمل تخلیقات کی اشاعت قومی اردو کونسل ترجیحی بنیاد پر کرتی ہے۔

'کلیات ذوق' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جو شیخ محمد ابراہیم ذوق کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مرتب تنویر احمد علوی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1980 میں کونسل نے شائع کیا تھا۔ کتاب کی اہمیت وتقاضے کے مطابق یہ پانچواں ایڈیشن ہے۔ اولاً کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا پیش لفظ ہے اس کے بعد تخلیق وشاعری کی قدر واہمیت سے متعلق ذوق کا ایک شعر درج ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے رہے یہی دو پشت چار پشت

اس شعر کے بعد کلامِ ذوق پر مشتمل 22 صفحات کی فہرست درج ہے۔ یہ فہرست الفبائی ترتیب سے دی گئی ہے۔ اولاً بالترتیب حمد، نعت، منقبت کے بعد ذوق کی غزلیہ شاعری اور پھر قصائد شامل ہیں جن کے ماخذ ومنبع کی صراحت بھی کی گئی ہے۔ کلام ذوق 380 صفحات کو محیط ہے۔ جب کہ حواشی 75 صفحات پر مشتمل ہیں۔ حواشی کی ترتیب ردیف الف سے شروع ہے۔ قطعات کے حواشی الگ سے درج ہیں۔ کلام کی ترتیب و تدوین میں مثنوی کے اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔ ترتیب کلیات کا اختتام 9 قصائد کے بعد ایک قطعہ و ابیات اور ایک تاریخ پر ہوا ہے۔ درمیان میں بھی درج قطعات کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ کلیات 456 صفحات کو محیط ہے۔ بیک کور پیج پر کونسل کی طرف سے ذوق کے شعری فن نیز تنویر احمد علوی کی لیاقت و صلاحیت اور کلیات ذوق پر وضاحت درج ہے۔

تنویر احمد علوی نے کلیات کی ترتیب دو حصوں میں کی ہے۔ دوسرے حصے کے آغاز میں لکھا ہے ''ابیات، غزلیات وقصائد بہ روایت آزاد' اس حصے میں ذوق کے سارے کلام مولانا محمد حسین آزاد کے ذرائع سے ماخوذ ہیں جب کہ پہلے حصے میں مولانا محمد حسین آزاد کے برعکس دوسرے ذرائع سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے۔ تنویر احمد علوی نے اپنے مستفادات میں مولانا محمد حسین آزاد کے علاوہ سرسید کی آثار الصنادید، پروفیسر شیرانی، شیخ محمد اسماعیل فوق و دیگر ذرائع کا ذکر کرتے ہوئے قدرے وضاحت سے گفتگو کی ہے۔ تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمہ میں بہادر شاہ ظفر سے متعلق عرف عام میں مشہور ایک گفتگو کا اعادہ کیا ہے کہ ذوق کی متعدد غزلیں بہادر شاہ ظفر کے دیوان میں شامل ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر نقل کی ہے۔

''ظفر کے دواوین میں کلامِ ذوق کا ایک معتد بہ حصہ شامل ہے۔ اس کے حق میں داخلی اور خارجی دونوں طرح کے شواہد موجود ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت بخط ذوق بعض ایسے مسودے ہیں جن میں ظفر تخلص سے غزلیں کہی گئی ہیں۔ ظفر کے دیوان میں شامل ایک غزل۔

مزہ چکھایا ہے کوہ کن کو جو عشق آیا ہے امتحاں پر

کے سلسلے میں مولانا محمد حسین نے لکھا ہے:

''جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپ کر آیا تو مجھے یاد ہے والد مرحوم نے غزل مرقومۃ الذیل کو دیکھ کر مجھ سے کہا تھا یہ غزل بھی بادشاہ کو دے دی۔ والد مرحوم کو پہلے سے ساری یاد تھی۔''

تاہم دوسرے حصے کی ترتیب میں کلی طور پر مولانا محمد حسین آزاد پر انحصار کیا ہے۔ درونِ صفحات علوی صاحب نے قصائد کے چند دستی مرقوم اوراق کے عکس بھی آویزاں کیے ہیں۔ کتاب طلبا واساتذہ کے لیے یکساں مفید وکارآمد ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے قیمت مناسب ہے۔

تعلیم و تدریس

اردو زبان : فن تدریس

مصنف: محمد قمر سلیم
صفحات: 250، قیمت: 154 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: فیروز عالم
شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، گچی باولی، حیدرآباد

تدریس محض ایک پیشہ ہی نہیں، فن بھی ہے۔ اس سے وہی اساتذہ صحیح معنی میں انصاف کر سکتے ہیں جو اسے ایک فن کا درجہ دیتے ہیں اور اس میں نکھار لانے اور خوب سے خوب تر بنانے کے لیے مسلسل مشق اور ریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ موثر تدریس کے لیے گہرے مطالعے اور غور وفکر کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو اپڈیٹ کرتے رہنا ضروری ہے۔ جو اساتذہ تدریس کو دلچسپ اور مفید مطلب بنانے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں، صدق دلی اور خلوص کے ساتھ نوخیز ذہنوں کو علم کی روشنی سے منور کرتے ہیں اور ملک وقوم کی ترقی کی راہ ہموار کرتے ہیں، وہی اساتذہ اصل میں معمار قوم کہلانے کے مستحق ہیں۔ ممتاز ماہر تعلیم اور سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے اساتذہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر محبت کا عنوان درج ہوتا ہے۔ جب کسی طالب علم سے تمام لوگ ناامید ہوجاتے ہیں اس وقت بھی استاد اس سے مایوس نہیں ہوتا اور اس کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں مصروف رہتا ہے۔

معیاری اور موثر تدریس کے لیے ماہرین تعلیم ہمیشہ کوشاں رہے ہیں اور اس کے لیے مسلسل تجربے کیے جاتے رہے ہیں۔ ان تجربات کی بنیاد پر مختلف تدریسی طریقۂ کار وضع کیے گئے ہیں اور ان پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں وقت اور حالات کے پیش نظر بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد قمر سلیم کی تازہ کتاب 'اردو زبان: فن تدریس' اس موضوع پر ایک اہم کتاب ہے جس میں تدریس کے قدیم طریقوں کے ساتھ نئی تکنیکوں، اصول اور نظریات سے واقف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد قمر سلیم چوں کہ خود طویل عرصے سے پیشۂ تدریس سے وابستہ ہیں اس لیے اس کتاب میں انھوں نے مختلف تکنیکوں اور اصولوں کے اطلاق کے ضمن میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔

زیر نظر کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں زبان کی تدریس، تدریس کے بنیادی عناصر، زبان کی تدریس کے اہم نظریات اور تکنیکوں، ماہرین تعلیم کے تعلیمی فلسفوں، طلبا اور اساتذہ کے مسائل، تدریس کو بہتر بنانے کے طریقۂ کار، اردو زبان کی تدریس کی مشکلات اور ان کا حل وغیرہ موضوعات پر وضاحت وصراحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ موجودہ عہد میں اردو زبان کو زندہ رکھنے اور اس کی جڑوں کو مضبوطی عطا کرنے کے لیے نئی نسل کو اردو پڑھانا، اس کے تلفظ اور املا کو درست کرنا اور اپنی زبان کے سرمائے پر فخر کرنا سکھانا ضروری ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اسکولوں میں ابتدائی سے ثانوی سطح تک اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جانا لازمی ہے۔ زبان کی تدریس کے ضمن میں سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارتوں کے فروغ کے علاوہ تدریس کے بنیادی مقاصد کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ دوران تدریس طلبا کی نفسیات کا خیال رکھنا اور اس طرح پڑھانا کہ کمرۂ جماعت میں موجود مختلف ذہانتوں کے حامل تمام بچے اس سے مستفید ہو سکیں، استاد کے لیے ایک بڑی چنوتی ہے۔ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اسے تجربے کرتے رہنا چاہیے اور اپنی خوبیوں اور کمزوریوں کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے۔ وقت اور ضرورت کے لحاظ سے اسے اپنی تدریس وآموزش میں خاطر خواہ تبدیلی لانی چاہیے۔

کتاب کے پہلے باب 'زبان کی تدریس' میں آموزشی عمل کو دلچسپ بنانے کے گر بتاتے ہوئے مصنف نے کلاس کی ابتدا میں طلبا کی سابقہ معلومات کی روشنی میں تمہیدی گفتگو، پھر اعلان سبق اور اس کے بعد موزوں آواز، صحیح تلفظ اور درست لب ولہجے میں سبق کی بلند خوانی کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے بعد نثری یا شعری متن کی مناسبت سے اس کی تفہیم اور تشریح کی جائے۔ اس باب میں تدریس کے بنیادی عناصر مثلاً ملک کی جدوجہد آزادی، آزادی کی تاریخ، آئین ہند میں درج حقوق وفرائض، ملک کے ثقافتی ورثے، ماحول کی حفاظت اور سماجی برابری وغیرہ کی اہمیت سے واقف کرایا گیا ہے۔ اس باب میں فن تدریس یا پیڈاگوجی کے مختلف طریقوں سے بھی روشناس کرایا گیا ہے۔

دوسرے باب 'نظریات اور تکنیکیں' کے تحت زبان کی تدریس اور آموزش سے متعلق پاؤلو فریری، سرسید احمد خاں، گاندھی جی اور ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کے تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں تدریس وآموزش کے مختلف طریقوں مثلاً تدریس بذریعہ نقالی، تخئیری ذہانت اور زبان، تدریس بذریعہ کھیل، تصور کی نقشہ بندی وغیرہ سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں نقشوں کی مدد سے بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے اس باب میں اگر کچھ کھیلوں کو بھی شامل کر لیا ہوتا تو مزید بہتر ہوتا۔ تیسرا باب 'عکس تدریس وآموزش' ہے جس میں جریدۂ عکس یعنی طلبا کے آموزشی تجربات کے ذاتی ریکارڈ اور تدارکی تدریس یا ریمیڈیل ٹیچنگ کی اہمیت وافادیت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں پاؤلو فریری کے تعلیمی نظریے بالخصوص مکالمے کی تکنیک، ڈی بونو کی چھ مفکرانہ ٹوپیوں (سفید، لال، ہرا، پیلا، کالا اور نیلا) روسو کی طفل مرکوز تعلیم، رابندر ناتھ ٹیگور کے آزادانہ ماحول میں طلبا کی تعلیم کے نظریے اور گاندھی جی کے بنیادی تعلیم کے نظریے سے تفصیلی طور پر واقف کرایا گیا ہے۔ پانچویں باب میں تدریس کو دلچسپ اور مسرت آمیز بنانے کے طریقوں کی وضاحت کی گئی ہے اور اس ضمن میں خوش گوار ماحول میں طلبا کی آموزش، انھیں سبق کے انتخاب کا اختیار، گھر کے کام میں اپنی پسند کی اشیا بنانے کی آزادی، ان کے کاموں کی ستائش اور حوصلہ افزائی، قدرتی ماحول میں تدریس، اچھی کتابوں کے مطالعے کی ترغیب اور سرگرمی مرکوز تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔

چھٹے باب کا عنوان 'عام ملحوظات' ہے جس میں تدریس کے عمومی اور خصوصی مقاصد، اسباق کی اقسام، اردو زبان کو بہ حیثیت مضمون اور بہ حیثیت ذریعہ تعلیم درپیش مسائل اور ان کے ممکنہ حل پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے ذیلی باب ''بچہ، زبان اور تدریس'' میں بچوں کی ذہنی، جذباتی اور سماجی نشو ونما میں زبان کی اہمیت، زبان کی تدریس کے اصولوں اور طریقوں کے بارے میں بتایا ہے۔ آخر میں مختلف قسم کے نمونہ سبق دیے گئے ہیں جن میں کمپیوٹر معاون تدریس بھی شامل ہے۔

'اردو زبان: فن تدریس' نہ صرف زیر تربیت معلموں بلکہ تمام اساتذہ کے لیے بھی یکساں سود مند ہے۔ اس میں پیش کردہ افکار وخیالات، تکنیکوں، تجاویز اور مشوروں پر عمل کر کے تدریس کو مزید موثر بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ہمیں اپنی تدریس کا محاسبہ کرنے اور اسے بہتر بنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے اور اس کا سرورق بے حد دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ اساتذہ برادری اس کی خاطر خواہ پذیرائی کرے گی۔

تحقیق و تنقید

تذکرہ شعرائے مراد آباد

مصنف وناشر: ڈاکٹر محمد آصف حسین

صفحات: 544، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2020

مبصر: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی، محلّہ گھیر مناف، امروہہ (یوپی)

اس تذکرے میں ابتدا سے 19ویں صدی تک مرادآباد کے 170 شاعروں کو شامل کیا گیا ہے اور مرادآباد کی ابتدا 1624 سے انیسویں صدی تک کی تاریخ بھی بڑی تحقیق وتلاش اور انتہائی غیر جانب دارانہ انداز میں بیان کی گئی ہے جس کے عناوین ہیں: مرادآباد کی علمی وادبی تاریخ کا مختصر جائزہ، اس حصے کو پانچ ادوار میں بانٹا گیا ہے، پہلا (کٹھیری دور) دوسرا (رستم خانی دور) تیسرا (فاروقی دور) چوتھا (تحریکی دور) اس چوتھے دور میں سات ذیلی عنوانات بھی ہیں جن میں تحریک آزادی 1857 اور مرادآباد۔ مرادآباد میں سرسید کی آمد اور خدمات، سرسید کا قائم کردہ پہلا مدرسہ، مرزا غالب کی مرادآباد میں آمد اور قیام، وغیرہ خاصے معلومات افزا اور تحقیقی مواد پر مشتمل ہیں۔ پانچواں دور جدید دور، کی تاریخ اور تذکرے پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر محمد آصف حسین نے اس تذکرے میں جو تحقیقی حواشی تحریر کیے ہیں وہ آپ کے نہ صرف تحقیقی وتنقیدی ذہن کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں بلکہ اس میدان میں ان کی تلاش اور تحقیق لگن وتاریخی مواد کی فراہمی میں ایک ذمہ دارانے رویے اور حب الوطنی کے بے لوث جذبے کا بھی پتا دیتے ہیں۔

وہ ایک طویل عرصے سے اپنے وطن مرادآباد کی ادبی تاریخی اور علمی تاریخ مرتب کرنے میں انتھک کاوشیں کررہے ہیں جس کے نتیجے میں آج انھوں نے ہمیں ایک انوکھا شاہ کار تذکرہ 'تذکرہ شعرائے مرادآباد' اس اعلان کے ساتھ دیا ہے کہ

دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

واقعی ڈاکٹر آصف حسین صاحب نے اس تذکرے کی تدوین وترتیب میں جو محنت ومشقت، کدوکاوش اور جدوجہد کی ہے، بلاشبہ وہ انھیں کا حصہ انھیں کی محنت اور لگن کا ثمرہ ہے۔

یوں تو یہ تذکرہ مع فہرست اور ماخذ کے کل 544 صفحات پر مشتمل ہے مگر ڈاکٹر آصف حسین نے مرادآباد نامی ادبی سمندر کو کس طرح متھا ہے اور اس سے کیسے کیسے آبدار موتی، لعل وجواہر دستیاب کیے ہیں اس کا اندازہ تذکرہ کے مطالعے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ بھی وہی حضرات لگا سکتے ہیں جنھوں نے اس طرح کا فرہادی کام اپنی محبوب ومطلوب تحریروں کو تلاشنے میں مجنونانہ ذہن، تڑپ اور لگن سے انجام دیا ہو۔ تذکرہ شعراء مرادآباد کے ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر آصف حسین صاحب نے بڑی ہی محنت اور تحقیق وتلاش کے بعد ضلع مرادآباد کی مختصر ادبی، علمی، سماجی وسیاسی اور ثقافتی وصحافتی تاریخ بھی بیان فرمائی ہے جو تذکرے کی اہمیت وافادیت میں ایک خاص قسم کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے ڈاکٹر آصف حسین کے تحقیقی ذہن اور ماخذ کی تلاش وجستجو بالخصوص اپنے بزرگوں کے احوال وآثار کی جمع وتدوین پر بھی اچھی روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے جس خوبصورتی کے ساتھ ضلع مرادآباد کی علمی وادبی، سماجی و سیاسی تاریخ کو بغیر کسی جانب داری کے مرتب ومدون کردیا ہے۔

ڈاکٹر آصف حسین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تمام ہی تذکروں سے شعرائے مرادآباد کے احوال وکوائف صرف جمع کردیے ہیں اس طرح کے کام اگرچہ پہلے بھی ہوئے ہیں مثلاً اسپر نگر کا تذکرہ، یادگار شعرا اور انصار اللہ صاحب کا 'جامع التذکرہ' (شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی) تین جلدوں میں وغیرہ مگر اس میں ڈاکٹر آصف حسین کی خصوصیت یہ رہی کہ ان حضرات نے شعراء کے کوائف تمام تذکروں سے اس طرح جمع کیے کہ ہر ایک تذکرے سے خاص خاص باتیں اخذ کرلیں اور اشعار بھی اسی طرح نقل کیے ہیں آصف حسین نے شعرا کے احوال جمع کرنے میں مکمل ماخذ نقل کیے ہیں۔ اس خوبی میں وہ اسپر نگر سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں کہ اسپر نگر نے اپنے تذکرے میں سوانحی کوائف کا انتخاب کیا ہے یعنی تمام تذکروں میں جو باتیں ایک شاعر کے بارے میں یکساں تھیں، انھیں چھوڑ دیا ہے۔ ہاں مگر اشعار میں وہی طریقہ استعمال کیا ہے کہ صرف ایک ہی تذکرے سے اشعار نقل کیے ہیں اگر دوسرے تذکرہ نگار نے اس شاعر کا کوئی دوسرا شعر دیا ہے تو آپ نے اس کو اپنے تذکرے میں لے لیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر آصف حسین کا یہ تذکرہ شعرائے مرادآباد کے سلسلے میں تمام ماخذ سے بے نیاز کرتا ہے جب کہ متذکرۂ بالا تذکرے تشنگی کا شکار ہیں، اگرچہ اس طرح یہ تذکرہ تکرار کا شکار ضرور ہوا ہے مگر جب ایک محتاط محقق کو کسی ماخذ کی مکمل اصل عبارت درکار ہوتی ہے، اس کے لیے یہ تذکرہ شعرائے مرادآباد ایک خاصے کی چیز قرار پاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں اپنے برادر مکرم جناب ڈاکٹر معصوم مرادآبادی کی رائے سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ آپ کے بقول:

"500 سے زیادہ صفحات کی اس نہایت کارآمد کتاب کا مسودہ دیکھ کر بڑا فخر ہوا کہ میرے شہر میں ایسا ہونہار اور محنتی قلم کار بھی موجود ہے جس نے اپنے محدود وسائل کے باوجود تحقیق وتنقید کی اعلیٰ منزلیں طے کیں اور اسے پورے عجز وانکسار کے ساتھ ناقدین کی خدمت میں پیش کردیا۔"

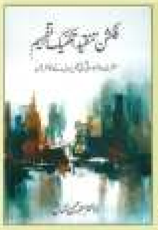

فکشن تنقید، تکنیک تفہیم

مرتب: ڈاکٹر منور حسن کمال

صفحات: 464، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: پروفیسر شہزاد انجم، صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہمارے عہد میں جن چند فکشن نگاروں کو ادبی حلقوں میں اعتبار ووقار حاصل رہا ہے ان میں ایک اہم نام مشرف عالم ذوقی کا بھی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے ادب بالخصوص فکشن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ علم وادب سے ایسی گہری وابستگی اور محویت بہت کم فکشن نگاروں کے حصے میں آئی۔ ان کے کئی ناول اور افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جو ذوق وشوق سے پڑھے گئے علاوہ ازیں ان پر خوب خوب بحثیں بھی ہوئیں۔ انھوں نے اردو کے ساتھ ہندی میں بھی تسلسل سے لکھا۔ وہ ہندی کے بھی مقبول ترین فکشن نگاروں میں تھے۔ افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ محض 59 برس کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ مشرف عالم ذوقی کے فکشن کے تعلق سے کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ تازہ کتاب ڈاکٹر منور حسن کمال کا گرانقدر علمی وتحقیقی کارنامہ 'فکشن تنقید، تکنیک تفہیم: مشرف عالم ذوقی کی تحریروں کے تناظر میں' ہے۔ جو بلاشبہ ان سب میں منفرد وممتاز ہے۔ یہ کتاب کئی معنوں میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔

پیش نظر کتاب منور حسن کمال کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مشرف عالم ذوقی کی تحریروں سے ڈاکٹر منور حسن کمال کو خاص شغف ہے۔ اس کتاب میں مشرف عالم ذوقی کے ناول نیلام گھر،

بیان، پوکے مان کی دنیا، لے سانس بھی آہستہ، آتش رفتہ کا سراغ، نالۂ شب گیر اور مرگ انبوہ پر مستند ادیبوں کے مضامین اور تاثرات شامل ہیں۔ ان ادیبوں میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر سید محمد عقیل، شفیع جاوید، سلام بن رزاق، علی احمد فاطمی، محبوب الرحمن فاروقی، انتخاب حمید، عشرت ظفر، نند کشور وکرم، نورالحسنین، منظر اعجاز، مشتاق احمد، نعمان شوق وغیرہم شامل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ذوقی کے تعلق سے ڈاکٹر ستیہ پال آنند، حقانی القاسمی، غضنفر، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے مضامین بھی شامل ہیں جو دعوت فکر و نظر دیتے ہیں۔ ان تمام مضامین کے علاوہ کتاب کے آغاز میں منور حسن کمال کے دو مضامین اردو ناول کا شعریاتی اسلوب اور اردو ناول کی تکنیک ایک جائزہ شامل ہیں۔ جن کے مطالعے کے بعد ایک خوش گوار احساس ہوتا ہے۔ دراصل ان مضامین میں ناول کی شعریات اور مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی بنیادی خصوصیات پر منور حسن کمال نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ اپنے مضمون 'اردو ناول کا شعریاتی اسلوب' میں ذوقی کے فن کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ان کی تحریریں روشن خیالی کا ایسا جاگتا ہوا آئینہ ہیں جہاں ماضی کی درخشاں روایت تو ہے لیکن اس سے انحراف بھی ہے! لیکن عمدہ اور موقع کی مناسبت سے مفید و کارآمد روایات کو برقرار رکھنا بھی وہ فرض منصبی گردانتے ہیں اور اس کے لیے ان کے یہاں شواہد کی بہتات ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں ذوقی ہمارے لیے دیوار پر کندہ اس تحریر کی طرح ہیں، جس میں اس دور کا سماج جی رہا ہے، کروٹیں لے رہا ہے، لیکن وہ تذبذب کا شکار ہے۔ ذوقی اسے دوراہے پر سوچنے سمجھنے کے لیے چھوڑتے نہیں، بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔''

منور حسن کمال کا یہ تجزیہ ذوقی کی تمام تحریروں کے تعلق سے ہے۔ دراصل مشرف عالم ذوقی کے سینے میں ایک طوفان اور عجیب قسم کا ابال تھا۔ وہ اپنے سماج کی ناہمواریوں سے حد درجہ غیر مطمئن تھے۔ ایک عجیب سی بے چینی اور بے اطمینانی کے ساتھ وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ذوقی روشن خیالی، عقلیت، بے خوفی، انصاف پسندی کے علمبردار تھے اور اپنے فن میں ان احساسات کو بخوبی برتنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں موضوع و اسلوب کی سطح پر نت نئے تجربے بھی کیے۔ ذوقی مابعد جدید مسائل و موضوعات کو اپنے فکشن کے مرکز میں رکھتے تھے۔ ناول کی بنت میں وہ کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں شامل تمام ادبا نے ذوقی کے فن کو سراہا ہے اور انھیں اپنے عہد کا ایک عظیم ناول نگار قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر منور حسن کمال کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ذوقی پر تحریر کردہ عمدہ مضامین کو ایک دھاگے میں پرونے اور ذوقی کے ناولوں کے تمام مباحث کو یکجا کرنے کی بہترین کاوش کی ہے۔ یہ نہ صرف ذوقی شناسی بلکہ ناول کے فن کی افہام و تفہیم کے تعلق بھی سے اہم کتاب ہے۔ مجھے امید ہے کہ علمی و ادبی حلقے میں اس کتاب کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔ بلاشبہ ناول سے دلچسپی رکھنے والوں اور مشرف عالم ذوقی کے پرستاروں کے لیے یہ بیش قیمت تحفہ ہے۔

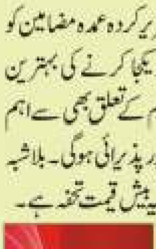

شاهکار

ترتیب و تقدیم: وسیم فرحت (علیگ)

صفحات: 352، قیمت: 208 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: احسن ایوبی، C-4/3، سرور اپارٹمنٹ، سرسید نگر، علی گڑھ۔ 202001 (یوپی)

ہندوستان میں اردو کے ادبی مراکز سے دور رہ کر تحقیق و تصنیف کے میدان میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنا بذات خود ایک بڑا اعزاز ہے۔ وسائل کی قلت اور ادبی ماحول کے فقدان کے باوجود اگر کوئی شخص بطور محقق اپنے وجود کو منوا لیتا ہے تو بلاشبہ یہ اس کے غیر معمولی اہمیت کے حامل کام، دقت نظری اور عرق ریزی کا ثمرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ ماہر یگانہ وسیم فرحت (علیگ) اردو کے سواد اعظم سے دور امراوتی شہر میں بیٹھ کر اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ یقینی طور پر مستحسن ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'شاہکار' ان کے محققانہ مزاج اور تلاش و تفحص کا تازہ ترین نمونہ ہے۔ 72 صفحات کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ کتاب دو ابواب (رشحات عالیہ، انتقادات عالیہ) پر مشتمل ہے۔ رشحات عالیہ کے تحت بارہ مضامین خواجہ حافظ کی فالیں (الطاف حسین حالی)، داغ کی شخصیت (بے خود دہلوی)، غالب: ایک بے نیاز ناظر (فراق گورکھپوری)، مضطر خیرآبادی (جاں نثار اختر)، جوش ملیح آبادی: ایک انٹرویو (نریش کمار شاد)، فیض: ایک تجزیہ (باقر مہدی)، شاد عارفی (ظ انصاری)، کورے کاغذ کی داستان (امرتا پریتم)، شاعری یا کلام موزوں (مشفق خواجہ)، خلیل الرحمن اعظمی (محمد شمی)، سعی نامشکور (عطاء اللہ پالوی) اور مرتب کا مضمون 'مشکور کی فصاحت' شامل ہیں۔ انتقادات عالیہ کے ذیل میں چھ مضمون حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی اہمیت (آل احمد سرور)، جوش کے بعض مابعد الطبعیاتی رجحان (علی جواد زیدی)، پیشہ تو سپہ گری کا بھلا (وارث علوی)، تنقیدی زاویے (فضیل جعفری)، سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور (قمر رئیس) اور معروضی تنقید (وسیم فرحت) جیسے قیمتی مضامین زینت کتاب ہیں۔ ان مضامین کے حوالے سے ۷۲ صفحات پر مشتمل مقدمہ اس کتاب کو تالیف و ترتیب کی فہرست سے نکال کر تحقیق کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ ایک ایک مضمون سے پہلے مضمون کی اولین اشاعت، مکرر اشاعت اور اشاعت کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پتہ ماری کے لیے جس صبر و تحمل، استقلال، مطالعہ، ژرف بینی اور رسائل و جرائد کے پرانے فائل کھنگالنے کی ضرورت ہے وہ 'پیشہ ورانہ ضرورتوں' کے تحت کتاب مرتب کرنے والے کے بس کا کام نہیں۔ مثلاً 'جوش کے بعض مابعد الطبعیاتی رجحان' از علی جواد زیدی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مضمون ہذا ایک قطعی نئے اور اچھوتے عنوان کا احاطہ کرتا ہے۔ 1956 سے تا حال جوش پر جتنے رسائل کے خاص نمبر نکل چکے ہیں، جتنی کتابیں لکھی گئیں، ان تمام میں جوش کے مذکورہ بالا پہلو کے متعلق گفتگو مفقود ہے۔''

'داغ کی شخصیت' از بے خود دہلوی کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

''مذکورہ بالا مضمون میرزا داغ دہلوی کے انتقال 1905 کے پینتیس برس بعد شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلہ 'ساقی' کے شمارہ بابت جون 1940 صفحہ نمبر 5 تا 7 شائع ہوا۔ ظاہر ہے مضمون کے ابعاد سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے داغ کے انتقال کے فوراً بعد لکھا گیا ہوگا۔ ہر چند کہ اس دور میں مطبوعہ نگارشات کی باز اشاعت کفر سے کسی طور کم نہ سمجھی جاتی تھی، خدا جانے پینتیس برس تک یہ مضمون غیر مطبوعہ کیونکر رہ گیا۔''

وسیم فرحت ایک معتبر رسالہ 'سہ ماہی اردو' کے سخت گیر مدیر ہیں، شاہکار کے اکثر مضامین 'اردو' کے مستقل کالم 'ماضی کے جھروکوں سے' میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب یہ مضامین نہایت عالمانہ اور محققانہ مقدمہ کے ساتھ کتابی شکل میں ہمارے سامنے آئے ہیں تو ان کی اہمیت و معنویت دو چند ہو گئی ہے۔ 'شاہکار' تحقیقی مزاج رکھنے والے اسکالرز، طلبا اور اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والے عام قارئین کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ 352 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت محض 208 روپے ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

مضامین

ریزہ کاری

مصنف: اشتیاق سعید
صفحات: 160، قیمت: 107 روپے
مبصر: ریحانہ فاطمہ، شاہین باغ، دہلی

اشتیاق سعید اردو کے معروف افسانہ نگار اور صحافی ہیں۔ بل جوتا، حاضر غائب ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کی ادارت میں ہفت روزہ 'کرلا' خبرنامہ ہفت روزہ 'اردو خبرنامہ' ہفت روزہ 'نیوز ٹائمز' شائع ہو چکے ہیں۔ 'ریزہ کاری' ان کی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں 24 مضامین شامل ہیں۔ انھوں نے تاثراتی انداز میں اپنے ہمعصروں کے حوالے سے مضامین تحریر کیے ہیں، خاص طور پر جن شخصیات سے ان کی قربتیں رہی ہیں انھیں اپنے مضمون کا محور بنایا ہے۔ سلام بن رزاق، عارف خورشید، قلمی نغمہ نگار نقش لائل پوری، ظفر گورکھپوری، تاجدار تاج، م ناگ، ساجد رشید پر ان کے تاثراتی مضامین ہیں جن سے ان فنکاروں کی شخصیت اور فن کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ انھوں نے نہایت بے تکلفی والے انداز میں ان شخصیات کے احوال بھی درج کیے ہیں جن کی وجہ سے مضامین کا لطف دوبالا ہوگیا ہے۔ اشتیاق سعید نے اپنے ہمعصروں کو ایک خاص زاویے سے دیکھا ہے، اسی لیے ان مضامین کی نوعیت ذرا تنقیدی تحریروں سے الگ ہوگئی ہے۔

زیادہ تر مضامین تعارفی نوعیت کے ہیں لیکن ایک خوبی ان مضامین کی یہ ہے کہ ان میں ان شعرا اور افسانہ نگاروں کے ساتھ ملاقات اور تعلقات کو بھی آشکارا کیا گیا ہے۔ وہ مضمون لکھتے ہوئے اپنے ریاضی کے استاد کو بھی یاد کرتے ہیں جو شاعر بھی تھے ان ہی کی ایما پر اشتیاق سعید نے شاعری میں اپنا تخلص زخمی رکھا۔ منٹو کے افسانوں پر دو مضامین ہیں جن میں تجزیاتی انداز اپنایا گیا ہے۔ ان تمام مضامین کے مطالعہ سے مضمون نگار کے ادبی ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مضامین کے عنوانات سے نفس موضوع کا پتہ نہیں چلتا جیسے 'میں تو ہر موڑ پر تجھ کو صدا دوں گا'، 'مجھے زندگی تو کہاں لے کر آئی'، 'کہانی کار خود کہانی ہوگیا'، 'آگے ایک اور مرحلہ ہے'۔

ان کے علاوہ انھوں نے منٹو کے حوالے سے دو مضامین تحریر کیے ہیں ایک کا عنوان ہے 'منٹو کا فن: سیاہ حاشیے کی روشنی میں' اور دوسرا مضمون 'منٹو کے افسانے کے تقسیم کے اثرات' کے عنوان سے ہے۔ اسی مجموعے میں فکشن نگاروں کی گھٹتی تعداد اور افسانچے کی مقبولیت، اردو زبان و ادب اور اکادمیوں کے کردار جیسے مضامین بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے اپنے معاصرین کی کتابوں پر جو پیش لفظ تحریر کیے تھے وہ بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں ان میں عشرت جالندھری، عبرت سروش مچھلی شہری، م ش نجمی، حامد لطیف، سراج دہلوی، ہنر رسول پوری، احسان سیوانی، ارشد جمال، گلشن آرا گل، سراج فاروقی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان کی کتابوں پر اشتیاق سعید نے جو تاثرات تحریر کیے ہیں ان سے ان قلمکاروں کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ممبئی کی بھاگتی دوڑتی دنیا میں اشتیاق سعید نے اردو کی سربلندی اور اس کی بقا کے لیے بھی سرگرم عمل رہتے ہیں۔ وہ اپنے معاشرے کے ایک اچھے پارکھ ہیں اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کو بہت اچھی طرح محسوس کرتے ہیں۔ ریزہ کاری میں انھوں نے ممبئی کی ادبی اور معاشرتی زندگی کی اہم اور غیر اہم شخصیات پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ بعض شخصیات دوسروں کے لیے کم اہم ہو سکتی ہیں لیکن انھوں نے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی مراسم رکھے اور ان کے اندر ادب اور انسانیت کے نغمے تلاش کیے۔ ممبئی میں رہتے ہوئے اشتیاق سعید نے جو زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھے اور ادبی زبوں حالی دیکھی اسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ایک عصری دستاویز بھی ہے اور اس میں ممبئی میں اردو کے حوالے سے اہم شخصیات اور دوسرے ادیبوں کے بارے میں معلومات بھی ہیں۔

ریزہ کاری درحقیقت ادبی ریزہ کاری ہے، جس میں تعارفی نوعیت کی معلومات بخوبی مل جاتی ہیں۔ کتاب کی طباعت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کتاب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار ضرور کریں گے۔

عربی ادبیات

الشاعرات الأردنيات

مرتب: فیصل نذیر
صفحات: 140، قیمت: 110 روپے، سن اشاعت: 2021
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: امتیاز احمد، 64، جبلی ہال، دہلی یونیورسٹی 110007

اردن اور ہندوستان کے ہمیشہ سے بہترین سفارتی تعلقات رہے ہیں، اردن ارض موعود اور ارض مقدس کے دائرے میں آتا ہے، اپنی جائے وقوع اور جغرافیائی اعتبار سے بھی ملکِ اردن بہت اہمیت رکھتا ہے اور امن و آشتی کا گہوارہ ہے۔ تین سال قبل وہاں کے صدر ہندوستان آئے تھے اور ان کی کتاب کا اردو ترجمہ بھی انھیں پیش کیا گیا تھا جو 'اسلام اور امن' کے عنوان سے تھی۔ اسی کڑی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہوئے عربی زبان و ادب کے ریسرچ اسکالر فیصل نذیر نے وہاں کی بیس شاعرات کا انتخاب کیا اور ان کے مجموعہ ہائے کلام میں سے بہترین نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ اردن ایک نہایت ہی ترقی یافتہ اور خوش حال ملک ہے، وہاں کی شاعرات سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیادہ تر آکسفورڈ، ہارڈورڈ، اور ییل (Yale) کی تعلیم یافتہ ہیں اور ان کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ ان کے موضوعات پرانے اور فرسودہ نہیں ہیں، جہاں ایک عورت صرف اپنے پیا کی نگاہوں اور نظر کرم نہ ملنے کا شکوہ کرتی ہے یا اس کے رنگون چلے جانے پر ماتم اور دکھ کا اظہار کرتی ہے یا اس سے ملنے کی آس میں لمبی عمر گزار دیتی ہے بلکہ اردن کی ان شاعرات کے یہاں موضوع کا بڑا تنوع اور توسع ہے۔ ان کی شاعری میں وہ ساری خوبیاں اور موضوعات پائے جاتے ہیں جو کسی بھی عالمی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن مالوف کی محبت جھلکتی ہے، جب وہ وطن سے دور ہوتی ہیں تو اسے یاد کرتی ہیں، اس کے لیے دعائیں کرتی ہیں، ناسازگار حالات اور جنگ کی وجہ سے جو لوگ بے گھر ہوگئے ہیں ان کے کرب کا بھی احساس ملتا ہے، دراصل اردن فلسطین سے متصل ہے اور یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ فلسطین سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے۔

وہاں ان کی رشتہ داریاں بھی بہت ساری ہیں۔ اسی لیے بے گھر اور پناہ گزینوں کا درد بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔ ایسے ہی موجودہ دور کے تہذیبی و سماجی کھوکھلے پن کا ذکر بھی ان کے یہاں ملتا ہے کہ ٹیکنالوجی، ایجادات اور سوشل میڈیا نے زندگی کو مصروف تو کردیا، ظاہری چمک تو بخش دی مگر باطن سے تنہا اور خالی کردیا۔ تنہائی، اور ڈپریشن، جنگ، خودکشی وغیرہ بھی بطور موضوع ان کی شاعری میں برتے گئے ہیں۔

عربی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا مقدمہ بہت اہم ہے جسے ہم بجا طور پر کتاب کا نچوڑ اور حاصل کہہ سکتے ہیں۔ مقدمے میں حضرت خنسا سے لے کر عہد اموی، عہد عباسی اور مغلیہ سلطنت سے لے کر اب تک کی بیشتر عربی شاعرات کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے اُردن کی بیس شاعرات اور ان کے کلام کا تعارف کروایا ہے، ان کا شعری انتخاب بھی سلیقے سے پیش کیا ہے، عربی کے ساتھ انگریزی میں بھی ان شاعرات کا جامع تعارف کروایا ہے۔ یہ کتاب اختصار کے ساتھ ہمیں اردن کی معاصر شاعری خصوصاً وہاں کی خواتین کی شاعری سے آگاہی بخشتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اردنی معاشرے کی خواتین تخلیق کاروں کی سوچ کا زاویہ کیا ہے اور وہ مسائلِ حیات کو کس طرح اپنے ادب و تخلیق کا حصہ بنا رہی ہیں۔ فیصل نذیر نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے مختصراً پورے اردنی نسائی ادبی و شعری منظر نامے کی عکاسی کی ہے۔ عمان میں ہندوستانی سفیر جناب انور حلیم نے کتاب پر اپنے تاثرات میں درست لکھا ہے کہ ''یہ کتاب جدید اردنی ادب کی ثروت مندی کی عکاسی کرتی ہے۔''

کتاب کے دوسرے صفحے پر اردن میں موجود ہندوستانی سفیر جناب انور حلیم صاحب کے انگریزی زبان میں تحسینی کلمات ہیں جس کا عربی ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اردنی شاعرات کے بارے میں لکھتے ہوئے فیصل نذیر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ اردن کی شاعرہ عائشہ خواجہ رازم کی شاعری اور موضوعات سے متاثر ہو کر ترکی حکومت نے دشتہ نامی جگہ پر ایک سڑک ان کے نام سے منسوب کی ہے جو کسی بھی بقیدِ حیات شاعرہ کے لیے یہ نہایت اعزاز کی بات ہے۔ اس کتاب میں جدید تحقیقی نہج اور حوالہ جات کا مکمل خیال رکھا گیا ہے اور منتخب شاعری بہت ہی سہل اور عام فہم ہے، جسے عربی کی شد بد رکھنے والا ہر شخص سمجھ جائے گا۔ مرتب نے مقدمہ میں یہ لکھا ہے کہ میں نے ان طلبہ کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے جو پی ایچ ڈی میں داخلے کے لیے موضوع اور شخصیات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ غرضیکہ یہ کتاب ایک اہم اور منفرد نوعیت کی کتاب ہے اور اس کاوش کے لیے مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

فکشن

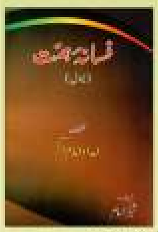

فسانۂ ہمت (ناول)

تصنیف: امداد امام اثر، ترتیب: شتہر امام
صفحات: 384، قیمت: 231 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: ادارہ حسینی سماج، پالی کالونی، پٹنہ (بہار) 800008
مبصر: ابراہیم افسر، وارڈ نمبر-1 مہپا چورا ہا نگر پنچایت سوال خاص، میرٹھ (یوپی) 250501

امداد امام اثر کی شہرت کا مدار ان کے تنقیدی کارنامے 'کاشف الحقائق' (1897) پر ہے۔ ناقدین نے مقدمہ شعر و شاعری (1893) کے بعد اس کتاب کو اُردو تنقید کی اہم کتاب گردانا ہے۔ کاشف الحقائق کے علاوہ اثر صاحب کی فلسفہ، تاریخ، مناظرہ، زراعت، باغبانی، سوانح، ریاضی، شکاریات، اخلاقیات اور معالجات کے موضوعات پر 20 سے زائد کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ موصوف ناقد کے علاوہ، تاریخ داں، ناول نگار اور شاعر بھی تھے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'فسانۂ ہمت' امداد امام اثر کا مشہور مہماتی ناول ہے۔ اس ناول کا کردار کوئی تاریخی ہیرو نہیں ہے بلکہ 'کولمبس' کی شکل میں ایک ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو نئی دنیا کی تلاش بالخصوص ہندوستان کی تلاش میں اپنے ملک سے روانہ ہوا لیکن اس کا جہاز ہندوستان کے ساحلوں کے بجائے اجنبی اور گنجان جزیرے سے جا ٹکرایا۔ اسی جزیرے پر اس نے اپنا لنگر ڈالا اور اپنی دنیا آباد کی۔ امداد امام اثر نے 'فسانۂ ہمت' میں 23 عنوان علم جغرافیہ اور علم تاریخ کی ضرورت، ملک اسفین، آغاز داستان، کولمبس المیڈ اور مس میریا فرڈینڈ، مشورہ ضروری، سفر بحری، مجبورانہ قیام جزیرہ، نو آبادی کا پہلا زینہ، وحشیانہ جزائر سے مقابلہ، الفائری اور اس کے ہم قوم، الفائری کی سود مند صلاحیتیں، لوہے کی ضرورت اور ترقیات آبادی کے بیانات، تاریخی حالات ملک اسفین، عجائبات آسامانی، زمانہ حال کی تجبی ترقیاں، عجائبات قمر یعنی چاند کے وہ عجائبات جو دوربینوں کے وسیلہ سے نمایاں ہوئے ہیں، سرگذشت ڈاکٹر صاحب، تاریخ، امور روحانیت، مسمیرزم، لوہے کی کانیں، ترتیب باغ اور خاتمہ فسانہ کے تحت ناول کو مہماتی انداز میں مکمل کیا ہے۔ امداد امام اثر نے تہذیبوں کے تبادلے سے جو نئی تہذیب پیدا ہوئی ہے اس پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں جدید سائنس، علم فلکیات اور علم کیمیا وغیرہ کا بیان دل چسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ ناول میں جنگلات کی سیر کراتے وقت اثر صاحب نے ایسا ماحول پیدا کیا ہے کہ گویا یہ تمام واقعات قارئین اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

امداد امام اثر نے سولہویں صدی کی تاریخ، وقت اور حالات کے مدِ نظر اس ناول میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس ناول میں مسلمانوں کی فتح بالخصوص اسپین میں مسلم حکومت کے بارے میں تاریخی اور معنی خیز باتیں رقم کی ہیں۔ ناول کے اختتام پر امداد امام اثر نے کولمبس کے ذریعے جو تاریخی تقریر کی ہے وہ سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ موصوف کا کمال یہ ہے کہ ہندوستان میں بیٹھ کر مغربی ممالک کے ایسے مناظر پیش کیے ہیں کہ گمان ہوتا ہے گویا ان تمام علاقوں کی انھوں نے سیر کی ہے۔ انھوں نے اس ناول میں جگہ جگہ یہ ثابت کیا کہ نئی دنیا کی جس کھوج کا سہرا مغربی سیاحوں کے سر باندھا جاتا ہے اس کے پیچھے مسلم سائنسدانوں کی محنت شاقہ کارفرما رہی ہے۔ اثر صاحب نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ جہاز رانی جیسے شعبے میں مسلمانوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے لیکن اس شعبے سے بے اعتنائی کے سبب آج مغربی ممالک اس میدان کے بے تاج بادشاہ بن گئے ہیں۔ نئی نئی ایجادات جو کبھی مسلمانوں کا شیوہ ہوا کرتی تھیں وہ اب مغربی قوم کا شعار بن گئی ہیں۔ آثارِ قدیمہ، جغرافیہ اور تاریخ یہ ایسے شعبے ہیں جن کی وجہ سے ملکوں کی قسمت آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ لیکن اس شعبے میں بھی ہم نے ماضی میں جو کام کیے وہ موجودہ زمانے میں نہیں ہو رہے ہیں۔ معدنیات، جو زمین کے نیچے قدرتی طور پر موجود ہیں ان پر بھی مغربی ممالک نے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ لوہے کی عظمت کے بارے میں امداد امام اثر کا کہنا ہے کہ لوہے کے استعمال سے مسلمانوں نے قوموں کے عروج و زوال کی کہانی لکھی، لیکن اس کا صحیح استعمال نہ کرنے کی وجہ سے لوہا اب ہماری قسمت کا فیصلہ کر رہا ہے۔ تعلیم اور علم جغرافیہ کے بارے میں امداد امام اثر ''فسانۂ ہمت'' کے پہلے باب میں لکھتے ہیں:

''تعلیم یافتگی کے لیے جغرافیہ کی ایسی ضرورت ہے کہ اس علم کے بغیر کوئی آدمی تعلیم یافتہ مانا نہیں جا سکتا ہے۔ ایک وقت میں اہل اسلام اس دنیا میں بڑے جغرافیہ داں سمجھے جاتے تھے اور اب ہندوستان کے پرانی وضع کے مسلمان اہل علم ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ بہت افراد ان کے ایسے ہیں کہ نہیں جانتے کہ چین، دہلی یا دیو بند سے کس سمت کو واقع ہے۔ ایک وقت اہل اسلام کا ایسا تھا کہ ان کے افراد بحور میں جہاز رانی کرتے تھے اور نئے نئے ملک و جزائر کے حالات سے اطلاع پیدا کرتے تھے'' (ص 52)

'فسانۂ ہمت' کے بارے میں کئی ناقدین کا گمان ہے کہ اس ناول میں جو تجسس اور ڈرامائی انداز موجود ہے، اسے ابن صفی اور رومانی فکر کے لوگوں نے اپنے ناولوں کی اساس بنایا۔ دراصل امداد امام اثر نے 'فسانۂ ہمت' میں جدید سائنس اور مستقبل میں سائنس کی افادیت پر تبادلۂ خیال پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس کے لیے قرآن کی اُن سورتوں کا سہارا لیا جن میں سائنسی سوچ اور غور و فکر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کچھ ایسی ہی باتیں ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں میں رقم کی ہیں۔ شتہر امام نے امداد امام اثر اور

ابن صفی کے کرداروں، زبان، اسلوب اور پیش کش کا موازنہ بھی پیش کیا ہے۔ موصوف نے اپنے پیش لفظ میں عارف اقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُردو ادب کے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ عارف اقبال نے ابن صفی کے جاسوسی ناولوں اور ان کی ادبی خدمات کو ہمارے لیے از سرِ نو مرتب کیا۔

زیر تبصرہ کتاب کے بارے میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ شتبر امام نے 'فسانۂ ہمت' کو مرتب کرتے وقت تدوین و تحقیق کے اصولوں کا خیال نہیں رکھا۔ انھوں نے اس بات کی کہیں وضاحت نہیں کی کہ 'فسانۂ ہمت' کب اور کہاں شائع ہوا اور یہ کتنے صفحات پر مشتمل تھا۔ امداد امام اثر نے جب اس ناول کو شائع کیا تو اس میں کس کس کی تقریظ اور کس کس کے تبصرے شامل تھے۔ انھوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ 'فسانۂ ہمت' کے کس نسخے کے متن کو سامنے رکھ کر تدوین کی۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی نہیں کی گئی ہے کہ امداد امام اثر نے 'فسانۂ ہمت' کے نسخے پر آخری بار کب نظر ثانی کی تھی۔ یہاں تک کہ شتبر امام نے کتاب کے آخر میں جو ضمیمے پیش کیے ہیں ان میں سن اشاعت کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ 'فسانۂ ہمت' پر جو تقریظ اور تبصرے شائع ہوئے تھے ان کے سن اشاعت اور رسائل وجرائد کے نام بھی حوالے کے طور پر درج نہیں کیے گئے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوصف میں شتبر امام کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے امداد امام اثر کی ایک اہم تخلیق کو مرتب کرکے قارئین کے سامنے پیش کیا۔

شاعری

موج غبار

مصنف : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

صفحات: 176، قیمت: 200 روپے

ناشر : علیم پبلی کیشنز، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور 440018

مبصر : ابوالبشر، ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو، اے ایم یو، علی گڑھ 202002 (یوپی)

کتاب 'موج غبار' ایک ایسے پختہ اور باکمال ادیب کا شعری مجموعہ ہے جس میں شاعر یعنی ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے غزلیات، منظومات، رُباعیات اور قطعات کو شامل کیا ہے۔ ساحل صاحب کا یہ تازہ شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل دست کوہکن (1983)، شرار جستہ (1985)، حرا کی روشنی (1990)، آئینۂ سیما (1996)، مقدس نعتیں (2003)، آئینۂ حسن یقیں (2008)، آئینۂ تمثال (2014) شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعے میں چند ابتدائی غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ 'اعتقادات' کے عنوان سے حمد اور نعت ہیں جب کہ 'غزلیات' کے باب میں عمدہ غزلیں ہیں اور اس کا آغاز بہت ہی خوبصورت شعر سے ہوا ہے۔

فکر پاکیزہ سے اشعار مزین ہیں مرے　　میں وہ فنکار ہوں معیار ادب جانتا ہوں

اس کے علاوہ کچھ رباعیات و تلمیحات بھی ہیں، قطعات بھی ہیں اور منظومات بھی۔

اس مجموعہ کے مطالعہ سے مجھ کو اس بات کا احساس ہوا کہ ساحل نے اس میں بہت ہی عام فہم اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ جس سے قاری کو ان کے اشعار سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا جو شاعری اور ان کی شاعری کا اختصاص بھی ہے۔

تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف (جن میں بیان میرٹھی: حیات و شاعری، کامٹی کی ادبی تاریخ، ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر، برار کی تمدنی و علمی تاریخ، پراچین ہندوستان عربی پستکوں میں، خاقانی شیروانی حیات و شاعری جیسی اہم کتابیں بھی شامل ہیں)۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنی شاعری کا آغاز 1964 میں کیا۔ اس مجموعہ میں انھوں نے اپنی چند ابتدائی غزلوں اور نظموں کو نظر ثانی کرکے شامل کیا ہے، جس بنا پر شاعر کی فکری تبدیلی کا نمونہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ شاعر نے اس مجموعہ میں 'میرا تخلیقی سفر' کے عنوان سے بہت قیمتی باتیں لکھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''شاعری مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی کوکھ سے وجود میں آتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس عمل میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے جس کے اثرات دل و دماغ پر مرتسم ہوتے رہتے ہیں۔ آج ہم جس تصور و خیال کو احسن سمجھتے ہیں کل وہی ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ شاعر کے تخلیقی سفر میں اس کے لب ولہجہ کی تبدیلی اسی سچائی کی غماز ہے۔ میری شاعری بھی اس حقیقت کی شاہد ہے۔''

اس مجموعے کے ابتدا میں شاعر نے غالب جیسے عظیم شاعر کا ایک شعر نقل کیا ہے جس کے مطالعے سے شاعر کی نزاکت احساس کا اندازہ ہوتا ہے۔

آفرینش کو ہے واں سے طلب مستی ناز　　عرض خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج غبار

غالب

محمد شرف الدین ساحل نے اپنی شاعری کو بادہ و ساغر، عریانیت، بلاغت اور بے ڈھنگے پن سے دور رکھا۔ اس کتاب میں تشبیہ، استعارہ، مجاز، کنایہ، تجنیس وغیرہ کا استعمال بہت ہی عمدگی سے کیا ہے جو کہ اس مجموعے کے مختلف اشعار میں عام طور پر دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

انقلاب وقت ہے اس کی دلیل　　ہے قلم بہتر کہیں تلوار سے
کاسہ لے کر ہاتھ میں اپنے پھرتے ہیں　　تاج رہا کرتا تھا جن کی ٹھوکر میں
مکر سے اس کے جیت کے میداں ہار گئے　　ایک منافق بھی تھا ہمارے لشکر میں
بڑے سکون سے کاٹی ہے زندگی اس نے　　خوشی ملی نہیں قسمت میں جس کو آہ ملی

منظومات میں بہت سی اہم نظمیں ہیں جو آج کے حالات سے ہم آہنگ ہیں۔ خاص طور پر 'کرونا' اور 'وبا' کے عنوان سے بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ان کی نظم 'کرونا' ملاحظہ فرمائیں۔

سکوتِ روز و شب، سنسان راہیں، درمقفل/ تڑپتے، آہ بھرتے پیکرِ خاکی/ بدن سے روح کا لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتا رشتہ/ گریزاں باپ سے بیٹا/ تو بیوی اپنے شوہر سے گریزاں/ یہ منظر دیکھ کر/ معالج دم بخود ہیں/ عروج ماہ و انجم پر کمندیں پھینکنے والے/ پریشاں ہیں/ عظیم الشان طاقت کا طلسم مادی/ بکھر کر رہ گیا ہے/ کرونا ایک بیماری ہے/ یا طاغوت کی یہ بھی شرارت ہے

الغرض اس کتاب کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شاعر محمد شرف الدین ساحل نے اپنے اس شعری مجموعے میں اتنے دل نشین، دل فریب، معنی خیز اشعار جمع کیے ہیں جو قاری کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ یہ دہلی یا لکھنو کی سرزمین یا آس پاس کا اہل زبان و باکمال شاعر ہے۔

رسائل و جرائد

سہ ماہی انتساب عالمی

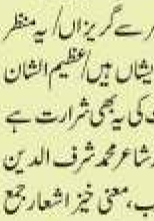

ترتیب: ڈاکٹر سیفی سرونجی

جلد: 9، شمارہ نمبر: 123

صفحات: 335، قیمت: 200 روپے، اپریل تا ستمبر 2021

مبصر: منظور وقار، یداللہ کانی، گلبرگہ۔ 585103 (کرناٹک)

ڈاکٹر سیفی سرونجی شاعر، ادیب، نقاد، محقق، مبصر، صحافی اور انشائیہ نگار ہیں۔ پچھلے پچاس برسوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اتنا لکھا کہ ان کی نثری تحریروں کی

تعداد ہزاروں میں ہے۔ اس قدر تخلیقی کام کرنے کے باوجود آج بھی ان کا قلم تازہ دم ہے۔ لکھنے اور دُنیا بھر کے ادبی رسائل اور اخبارات میں چھپنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علاوہ ازیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ سہ ماہی 'انتساب عالمی' کی اشاعت ہے۔ 'انتساب عالمی' پچھلے 39 برسوں سے بلا ناغہ شائع ہو رہا ہے، ساتھ ہی انتساب پبلی کیشنز کے زیر اہتمام پانچ برسوں سے ماہنامہ 'عالمی زبان' بھی شائع کر رہے ہیں۔ 'انتساب عالمی' کے عام شماروں کے ساتھ ساتھ خصوصی نمبر بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ 'انتساب عالمی' کے بشیر بدر نمبر، خالد محمود نمبر، ظفر گورکھپوری نمبر، ندا فاضلی نمبر، محمد ایوب واقف نمبر، گوپی چند نارنگ نمبر، چندر بھان خیال نمبر اور نرمل سنگھ رائے پوری نمبر مقبولیت کا ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ 'انتساب عالمی' کو بنانے سنوارنے میں ڈاکٹر سیفی سرونجی کی انتھک محنت اور لگن کی تعریف چند لفظوں میں ممکن نہیں۔ 'انتساب' کے ادارتی بورڈ سے منسلک انل اگروال (سرپرست) آفاق سیفی (مدیر) استوتی اگروال (معاون مدیر) کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ خصوصاً تیز و تند جواں سالہ ادیبہ، صحافی استوتی اگروال کا ڈاکٹر سیفی سرونجی اور رسالہ 'انتساب عالمی' کے تئیں جو خلوص، محبت اور اپنائیت ہے اسے دیکھ کر حیرت انگیز مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ ان چند تعارفی سطور کے بعد پیش نظر رسالہ سہ ماہی 'انتساب عالمی' (اپریل تا ستمبر 2021) پر نظر ڈالتے ہیں۔

رنگا رنگ سرورق پر 12 عدد بیرونی ممالک کے ممتاز شعرائے کرام کی تصویریں جگمگا رہی ہیں۔ شکیل شمسی کی حمد اور ف۔ س اعجاز کی نعت کے بعد صفحہ نمبر 6 پر ڈاکٹر سیفی سرونجی کا اداریہ بہ عنوان 'بیرونی ممالک میں اُردو نظم' موجود ہے اداریہ کے تحت ڈاکٹر سیفی سرونجی بیرونی ممالک کے شعرا کی نثری نظموں کا انتخاب قسط وار پیش کر رہے ہیں۔ موجودہ قسط نمبر 7 میں فاروق بٹ، عامر قدوائی، صدف فریدی، نظر بریلوی، منظور۔ک۔ حسرت، اسلم عمادی، سید نظر، یعقوب تصور، مسعود منور، طاہر مجید، شفیق مراد، حیدر قریشی، کنیز فاطمہ کرن، سعید روشن، عبداللہ ساجد اور باقی احمد پوری کی نظمیں شامل ہیں۔ تمام ہی نظمیں نغمگی اور طرب آگیں جذبات کا امتزاج ہیں۔ صفحہ نمبر 19 تا 148 پر بر

صغیر کے ممتاز قلمکاروں کے 21/ عدد تنقیدی مضامین تجزیے تبصرے اور خاکے موجود ہیں قلمکاروں کے نام ہیں پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر رؤف خیر، ڈاکٹر احرار اعظمی، ڈاکٹر نیاز سلطان پوری، کوثر صدیقی، عارف عزیز، ڈاکٹر اشرف آثاری، ڈاکٹر غلام شبیر رانا، وصی اللہ حسینی، پروفیسر عزیز اللہ شیرانی، ڈاکٹر سیفی سرونجی، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر احسان عالم، معین الدین شاہین، محمد اظفر خاں، اتش خالد، زاہد ظفر، ترنم بانو، اور محمد ظفر اقبال مندرجہ بالا تمام قلمکاروں نے اپنے اپنے موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ تمام ہی مضامین تبصرے، تجزیے اور خاکے نہ صرف عمدہ تحریروں کا خزینہ ہیں بلکہ ان میں پختگی اور تہہ داری کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی بھی موجود ہے۔ منظومات کے تحت صفحہ نمبر 160 تا 180 پر تقریباً 24 عدد شعرائے کرام کا کلام موجود ہے۔ تمام غزلیں، نظمیں، قطعات اور ترجمے فنی لوازمات اور کلاسکی رچاؤ سے بھر پور بھی ہیں۔ صفحہ نمبر 181 پر ڈاکٹر پاپولر میرٹھی کا ڈرامہ ہے۔ صفحہ نمبر 188 پر ادب اطفال کے حوالے سے شاہد جمیل سے ہوئی گفتگو میں ادب اطفال کی اہمیت اور ضرورت کے ساتھ ساتھ موجودہ عہد میں ادب اطفال کے تئیں قارئین اور قلمکاروں کی سرد مہری پر حیرت کا اظہار بھی ہے۔ صفحہ نمبر 198 تا 263 پر 14 افسانے اور افسانچے موجود ہیں۔ تمام ہی افسانے اور افسانچے عصری حسیت اور جدید طرز اظہار کی عمدہ مثال ہیں۔ افسانے جہاں قاری کے دل و دماغ کو جھنجوڑتے ہیں۔ وہیں تازگی و تابانی کا احساس دلاتے ہیں۔ تبصرے کے تحت صفحہ 270 تا 305 پر 19 عدد تصانیف اور رسائل پر تبصرے موجود ہیں۔ 'انتساب کی ڈاک' کالم کے تحت صفحہ نمبر 306 تا 332 پر 14 عدد مشاہیر (قارئین) کے خطوط شامل ہیں ان میں چند خطوط۔ مختصر ہیں تو چند تبصرہ نما طویل خطوط تمام ہی خطوط میں نثری اور شعری مشمولات پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ 'انتساب عالمی' رسالہ ہذا ایک رسالہ نہیں، وقیع شعری و نثری تخلیقات کا ایک ضخیم انتخاب بن گیا ہے۔ رسالہ صوری اور معنوی اعتبار سے بے حد پر کشش اور جاذب نظر ہے۔ ■

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

مادرِ وطن کی خدمت ہی مودی جی کا مشن اور منشور ہے: پروفیسر شیخ عقیل احمد

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں وزیر اعظم کے یوم ولادت پر تقریب تہنیت

نئی دهلی: مادر وطن کی خدمت ہی ہمارے ملک کے وزیر اعظم عزت مآب نریندر مودی کی اصل زندگی ہے۔ انھوں نے مادر وطن کو مستحکم کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ اپنے ملک اور مٹی کی محبت میں انھوں نے ایسے کام کیے جس سے ہندوستان کے بارے میں لوگوں کا تصور بھی بدلا اور ہندوستان کی تصویر بھی بدلی۔ مادر وطن کی خدمت ہی مودی جی کا مشن اور منشور ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے وزیر اعظم نریندر مودی کے یوم ولادت کے موقعے پر

قومی اردو کونسل میں منعقدہ تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعظم نے اپنے 7 سال کے عرصے میں ہندوستان کی جامع اور ہمہ جہت ترقی کے لیے ایسے عملی اقدامات کیے جن سے ہندوستان کو ایک نئی شناخت ملی اور دنیا کی بڑی طاقتوں نے بھی ہندوستان کی قوت وعظمت کا اعتراف کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ کووڈ وبا کے دوران وزیر اعظم نے ملک کو ایک بڑے بحران سے نکالا اور آتم نربھر کا خوبصورت اور بامعنی تصور دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ گڈ گورننس کے یہ سات سال سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے کیونکہ وزیر اعظم نریندر مودی نے عوامی فلاح و بہبود کے لیے ایسی اسکیمیں وضع کیں جن سے ہندوستان کے تمام طبقات کو فائدہ حاصل ہو۔ انھوں نے اپنے ملک کی عظیم ثقافتی روایت قدیم علوم وفنون کے احیا وتحفظ پر بھی زور دیا اور قومی تعلیمی پالیسی میں خاص طور سے ان زبانوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ مادری زبان کے فروغ کے بھی اقدامات کیے۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اردو زبان سے وزیر اعظم نریندر مودی کی محبت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس زبان کی سلاست اور سادگی کے ساتھ اس کا رسم الخط بھی انھیں بے حد پسند ہے اور شاید یہ محبت ہی کا فیض ہے کہ ان کے دور حکومت میں قومی اردو کونسل کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا جس سے ملک کے طول وعرض میں فروغ اردو کی اسکیموں کو نافذ کرنے میں ہمیں بہت مدد ملی۔ اس موقعے پر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ وزیر اعظم نریندر مودی کی تمام اسکیموں اور منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور ان کے وژن اور مشن سے پورے ملک کو متعارف کرائیں گے۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایڈمن جناب کمل سنگھ نے بھی وزیر اعظم مودی جی کو مبارک باد پیش کی اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ایسے وزیر اعظم ہیں جو بہت ہی غربت کی سطح سے آئے ہیں۔ تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اتنی روشن تاریخ رقم کرتے ہیں۔ اس تقریب میں قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف نے شرکت کی اور وزیر اعظم کو ان کے یوم ولادت پر صحت، سلامتی اور درازی عمر کی دعاؤں کے ساتھ نیک خواہشات پیش کیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2021

گاندھی جینتی کی مناسبت سے قومی اردو کونسل میں خصوصی لیکچر

نئی دہلی: گاندھی ایک کرم یوگی اور بنیادی طور پر ایک سیاسی انسان تھے، وہ معروف معنوں میں فلسفی یا مفکر نہیں تھے مگر ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر آنے والی مشکل کو دور کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیتے تھے۔ گاندھی جی کی شخصیت کھلی کتاب کی طرح ہے، لیکن دیگر مصلحین کی طرح انھوں نے اپنے فلسفہ ونظریات کو یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بعد والی نسلوں کی ذمے داری ہے کہ وہ ان کی زندگی کو پڑھیں اور سمجھیں۔ ان خیالات کا اظہار اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار دا آرٹس کے صدر پدم شری رام بہادر رائے نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں 'بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی کی نظر میں ہندوستان کا تصور' کے عنوان سے خصوصی لیکچر دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ گاندھی کے سپنوں کا بھارت وہ ہے جو انھوں نے انیس سو بیالیس میں کہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں حکومت ہندوستانیوں کی ہوگی۔ اسی طرح گاندھی کے سپنوں کا بھارت یہ ہے کہ سیاسی

اقتدار محض شہروں تک محدود نہ رہے بلکہ گاؤں تک اس کا دائرہ پھیلایا جائے، جسے گرام سوراج بھی کہا جاتا ہے۔ 'میرے سپنوں کا بھارت' ایک ایسی کتاب ہے جس میں سوراج، حب الوطنی، جمہوریت، قومی زبان اور رسم الخط، رام سوراجیہ، اقلیت، مذہبی رواداری وغیرہ پر گاندھی کے نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ رام بہادر رائے نے گاندھی کی عصری معنویت کے حوالے سے کہا کہ جس طرح گاندھی جی کی اہمیت ان کے دور میں تھی اسی طرح آج بھی قائم ہے اور ان کے نظریات پر عمل کر کے ہم ہندوستان کو ہر سطح پر ترقی یافتہ اور عالمی قیادت کے لائق بنا سکتے ہیں۔ اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اپنی تعارفی گفتگو میں معزز مہمان کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جناب رام بہادر رائے نے صحافت میں طویل خدمت انجام دی ہے، جے پرکاش آندولن میں بھی ان کا کلیدی کردار رہا ہے۔ انھوں نے کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔ بہت سے اخباروں میں ان کے کالم چھپتے رہے ہیں اور انھوں نے متعدد کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اپنی سیاسی، صحافتی وسماجی خدمات کے عوض پدم شری اور دیگر اعزازات سے بھی نوازے جا چکے ہیں۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے موضوع کی مناسبت سے گاندھی جی کی شخصیت اور فلسفے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی جی کے پیغامات و تعلیمات میں وحدت واتحاد، اپنے کام اور نصب العین کے تئیں وفاداری، عدم تشدد، بین مذاہب مکالمہ کی ضرورت، رواداری، ایک دوسرے کو سمجھنا، اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنا جیسی چیزیں اہم ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ماحولیات کے تئیں حساسیت، قدرتی وسائل کا جائز استعمال بھی گاندھی کے اہم نظریات ہیں۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ گاندھی جی کے سیاسی نظریات ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کے لیے آج بھی کارگر ہیں۔ سب کے لیے تعلیم بھی ان کا نظریہ تھا، مودی سرکار کی تعلیمی پالیسی اور آتم نربھر بھارت گاندھی جی کے نظریے سے متاثر ہو کر ہی بنایا گیا ہے۔ اسی طرح گاندھی جی کی تعلیمات کے زیر اثر قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں اخلاقی اقدار کی تعلیم پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح سرکار کا نعرہ سب کا ساتھ سب کا وکاس بھی گاندھی جی کے تصور خدمت سے ہی ماخوذ ہے۔

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 اکتوبر 2021

اردو زبان کے فروغ کے لیے جموں وکشمیر کی سرزمین نہایت زرخیز ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

جموں وکشمیر: اردو زبان وادب سے جموں وکشمیر کا بہت گہرا رشتہ ہے یہاں کے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے نہ صرف فروغ اردو کی کوشش کی بلکہ سرکاری اسکولوں میں بھی اسے ذریعہ تعلیم بنایا۔ اس ریاست میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ بھی حاصل رہا ہے اس لیے یہاں کے سرکاری اعلانیے انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی جاری ہوتے ہیں۔ جموں، کشمیر اور لداخ میں اس سرزمین کے ماضی اور حال کی روشنی میں یہ کہنے میں شاید حق بجانب ہوں کہ فروغ اردو کے لیے جموں وکشمیر کی سرزمین نہایت زرخیز ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے سینٹرل ہال میں CABA-MDTP، کیلی گرافی، اردو، عربی، فارسی کے سرٹیفکیٹ اور ڈپلومہ کورسیز کے سینٹر انچارج اور اساتذہ کے ساتھ ایک انٹریکشن پروگرام میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ جموں وکشمیر میں سینٹروں کی تعداد 181 ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قومی اردو کونسل جموں وکشمیر کے طلبا کی تکنیکی اور تعلیمی تربیت اور ترقی کے لیے نہایت سنجیدہ ہے اور کونسل چاہتی ہے کہ اس علاقے میں فروغ اردو کا دائرہ اور بھی وسیع ہو۔ انھوں نے تمام سینٹر انچارج اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انھیں بھی اپنی ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے طلبا کے مستقبل کے ساتھ ساتھ اردو کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کورونا کا منفی اثر بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے اس لیے کورونا پروٹوکول کا خیال رکھتے ہوئے فزیکل کلاسیز کا جلد از جلد انتظام کرنا سینٹر کے انچارج کی ذمے داری ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے یہ بھی کہا کہ حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں اس لیے ان تمام کورسیز کے امتحانات مستقبل قریب میں وقت پر ہوں گے تاکہ طلبہ کے کیریئر کو محفوظ کیا جا سکے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے یہ بھی کہا کہ جموں وکشمیر کے تمام سینٹرس قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور وزارت تعلیم حکومت ہند کا حصہ ہیں، اس لیے ادبی اور تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنا اور اپنے علاقے میں این۔ سی۔ پی۔ یو۔ ایل کی باوقار موجودگی کا احساس دلانا تمام سینٹرز کے انچارج کا فرض ہے۔ اس موقع پر انھوں نے سینٹرس کے انچارج اور اساتذہ کا شکریہ بھی ادا کیا کہ ان لوگوں کی جدوجہد اور کوششوں سے جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے فروغ کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں اور طلبہ اردو زبان وادب سے نہ صرف دلچسپی لے رہے ہیں بلکہ اپنے مستقبل کے کیریئر کے طور پر بھی اردو زبان میں تعلیم وتربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ ڈاکٹر الطاف انجم نے فروغ اردو کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ جموں وکشمیر میں جو کمپیوٹر سینٹرز قائم ہیں وہ دراصل اردو کے سفارت خانے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سینٹروں کے ذمے داران کو اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے مزید سنجیدگی اور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 24 ستمبر 2021

قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر کو سندھی کونسل کے ڈائریکٹر کا اضافی چارج

نئی دهلی : مرکزی وزارت تعلیم حکومت ہند کی طرف سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کو قومی کونسل برائے فروغ سندھی زبان کے ڈائرکٹر کا اضافی چارج دیا گیا ہے۔ وزارت تعلیم کی ہدایت کے مطابق شیخ عقیل احمد سندھی کونسل کے ڈائرکٹر کے طور پر، باقاعدہ ڈائرکٹر کی تقرری یا قومی اردو کونسل میں اپنی مدتِ کار تک خدمات انجام دیتے رہیں گے۔ قابل ذکر ہے کہ حال ہی میں مرکزی وزارت تعلیم نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کے طور پر ان کی خدمات کے تئیں اظہار اطمینان کرتے ہوئے ان کی مدتِ کار میں توسیع کی تھی اور اب انھیں سندھی کونسل کے ڈائریکٹر کا اضافی چارج بھی سونپا گیا ہے۔

این سی پی ایس ایل کے ڈائریکٹر کا اضافی چارج سنبھالنے کے بعد شیخ عقیل احمد نے کہا کہ وہ وزارت تعلیم کے اعتماد اور امیدوں پر کھرا اترتے ہوئے اپنی نئی ذمے داری کو کماحقہ نبھانے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس طرح ہم نے پورے ملک میں اردو زبان کے فروغ کے لیے مؤثر کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں، اسی طرح سندھی زبان کو بھی ملک کے تمام خطوں میں پہنچانے اور غیر سندھی طبقات کو بھی اس زبان کی طرف راغب کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عنقریب ملک بھر میں چلنے والے سندھی زبان کے سینٹرز اور ٹیچرز کی کارکردگی کا جائزہ لیں گے اور انھیں پہلے سے زیادہ فعال اور نتیجہ خیز بنانے کی سمت میں مؤثر قدم اٹھایا جائے گا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ غیر سندھی خطوں میں بھی سندھی زبان کے فروغ کے لیے خصوصی لائحۂ عمل بنایا جائے گا اور اس کے لیے دستیاب وسائل و ذرائع کے ساتھ مختلف این جی اوز کا بھی تعاون حاصل کیا جائے گا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 ستمبر 2021

تقسیمِ یونانی ادویات کیمپ

نئی دهلی: صحت وہ انمول شے ہے جس کے بغیر اچھی اور پُر لطف زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ ''صحت ہی زندگی ہے''اس لیے صحت مند معاشرے کے لیے جسمانی صحت بھی بہت ضروری ہے۔ ملک کے لوگ جس قدر

صحت مند ہوں گے اسی قدر ملک کی خدمت بہتر طور پر انجام دے پائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی جانب سے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں لگائے گئے تقسیم یونانی ادویات کیمپ میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرکزی وزارت آیوش حکومت ہند کی طرف سے صحت بیداری مہم اور قوت مدافعت میں اضافہ کرنے والی ادویات کی تقسیم کا یہ عمل قابل تبریک و تحسین ہے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ ہندوستانی حکومت عوام کی صحت کے تئیں نہایت حساس اور بیدار ہے۔ اس لیے صحت کے محاذ پر مستعد اور متحرک ہے۔ یوگا اور فٹ انڈیا جیسے پروگرام بھی اسی بیداری صحت کا حصہ ہیں۔ اس مہم سے ہمارے ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی جی کے 'صحت مشن' کا خواب بھی پورا ہوگا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے مرکزی وزارت آیوش حکومت ہند اور سی سی آر یو ایم کے ڈائریکٹر جنرل پروفیسر عاصم علی خان اور ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر راحت رضا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مفت دوائیوں کی تقسیم کے اس عمل کے بہت مفید نتائج سامنے آئیں گے۔ واضح رہے کہ مرکزی وزارت آیوش حکومت ہند کی طرف سے آزادی کا امرت مہوتسو کی مناسبت سے 75 ہفتوں تک قوت مدافعت میں اضافہ کرنے والی یونانی ادویات پورے ملک میں بانٹی جائیں گی۔ قومی اردو کونسل میں ادویات کی تقسیم ڈاکٹر دانش چشتی اور ڈاکٹر نعمان خان کی نگرانی میں عمل میں آئی اور اس میں ذاکر حسین اور محمد صدام نے معاونت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 ستمبر 2021

عالمی وبا نمبر کی تقریب اجرا

نئی دهلی : کورونا وائرس نے پورے عالم اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ ادیبوں، شاعروں، اور صحافیوں نے اس وبا کے اثرات کو اپنی تخلیقات و نگارشات کا موضوع بنایا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں بہت سے ناول، افسانے، نظمیں اور ادبی و صحافتی تحریریں لکھی گئیں۔ عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ

انھوں نے کورونا وبا کے زیر اثر لکھی گئی بہت سی تحریروں اور تخلیقات کو یکجا کرکے کتابی سلسلۂ عالمی جائزہ' کا عالمی وبا نمبر شائع کیا۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ تقریب رسم اجرا میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ نمبر ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہے اور کورونا کے حوالے سے بہت سی تفصیلات و حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ جیسے جیسے وقت بڑھتا جائے گا، اس نمبر کی اہمیت و افادیت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

پروفیسر ابن کنول نے اے رحمٰن کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اہم موضوع پر ایک ضخیم نمبر مرتب کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس نمبر میں کورونا جیسی عالمی وبا کے نتیجے میں پیش آنے والے مسائل کا احاطہ کیا گیا اور ادیبوں وصحافیوں کی تخلیقات اور تحریریں شائع کی گئی ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر اخلاق آہن نے کہا کہ وباؤں کی تاریخ بہت طویل ہے۔ مختلف زمانوں میں مختلف قسم کی وبائیں

آئیں اور بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصانات ہوئے لیکن ان کی تفصیلات مہیا نہیں ہیں، البتہ گزشتہ دنوں کورونا وائرس جیسی عالمی وبا کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے عبدالرحمٰن صاحب کا مرتب کردہ رسالہ 'عالمی وبا نمبر' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک مفید دستاویز ثابت ہوگا۔ پروفیسر محمد کاظم نے عالمی وبا نمبر کو بہترین ادب کا نمونہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس میں عالمی وبا کی تاریخ محفوظ ہوگئی ہے۔

معروف صحافی جناب م۔افضل نے کہا کہ عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ گزشتہ ایک دہائی سے اردو میں بہت کام کر رہے ہیں۔ عالمی وبا نمبران کے کارناموں میں سے ایک ہے۔ جس وسیع پیمانہ پر وہ کام کر رہے ہیں، اسے سراہا جانا چاہیے۔ اطہر فاروقی نے کہا کہ عالمی وبا نمبر پہلی ایسی دستاویز ہے جو دوسری لہر کے بعد شائع ہوئی اور اس کا سہرا عبدالرحمٰن کے سر جاتا ہے جنھوں نے بڑی محنت سے کم وقت میں مرتب کرکے اسے شائع کیا۔ سہیل انجم نے کہا کہ اے رحمٰن ہرفن مولا شخصیت ہیں، وہ مختلف موضوعات کے ماہر ہیں۔ ان کے اندر ہر معاملے میں اولیت حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اس موقع پر پروفیسر عارف الاسلام، شکیل شمسی، شمس اقبال، احمد جاوید، خالد رشید علیگ اور عامر سلیم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مدیر محترم کو مبارک باد پیش کی۔ آخر میں عالمی وبا نمبر کے مدیر جناب اے رحمٰن نے تمام مہمانان گرامی اور شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا اور اس نمبر کے حوالے سے کئی اہم باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی اشاعت کے اسباب کو بیان کیا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے قومی اردو کونسل میں اس نمبر کے اجرا کا موقع فراہم کیا۔ نظامت کے فرائض معروف افسانہ نگار پرویز شہریار نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ادب وصحافت کی متعدد اہم شخصیات کے ساتھ ساتھ قومی اردو کونسل کا پورا اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 ستمبر 2021

سی بی ایس ای کے شعبہ ٹریننگ واسکل ایجوکیشن کے ساتھ قومی اردو کونسل کا معاہدہ

نئی دھلی: مختلف مہارتوں اور ہنر پر مبنی تعلیم کو اردو زبان میں فروغ دینے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے اہم پیش رفت کی ہے جس کے تحت

سینٹرل بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن (سی بی ایس ای) کے ساتھ مل کر نصابی کتابوں کے اردو ترجمے اور اردو اکثریتی علاقوں میں ان کی ترسیل کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس حوالے سے آج سی بی ایس ای کے ٹریننگ اینڈ اسکل ایجوکیشن کے ڈائریکٹر ڈاکٹر بسواجیت ساہا اور ڈپٹی سکریٹری محترمہ شوبی سرکار کے ساتھ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کی میٹنگ ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ کونسل اور سی بی ایس ای کے مابین ایک تحریری یادداشت تیار کی جائے گی اور اس کی روشنی میں مزید اقدامات کیے جائیں گے۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہمارا مقصد ہے کہ اردو کے طلبہ وطالبات کو بھی اسکل ایجوکیشن (مہارت پر مبنی تعلیم) دے کر انھیں ہمہ جہت صلاحیتوں سے لیس کیا جائے تاکہ وہ چیلنجز کا آسانی سے مقابلہ کرسکیں اور عملی دنیا میں آنے کے بعد ان کے سامنے ایک سے زیادہ متبادل ہوں۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل کے ذریعے سی بی ایس ای کی شائع شدہ اسکل ایجوکیشن سے متعلق کتابوں کا مرحلہ وار اردو زبان میں ترجمہ کرواکر انھیں ہندوستان کے علاوہ اردو کی نئی بستیوں تک بھی پہنچانے کا اہتمام کیا جائے گا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ موجودہ دور علمی وعملی مسابقہ آرائی کا دور ہے جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایک سے زیادہ علمی وعملی شعبے میں اختصاص اور مہارت کی ضرورت ہے، اسی مقصد کے پیش نظر ہم نے یہ پیش رفت کی ہے اور اس سے یقیناً اردو طلبہ وطالبات کی پیشہ ورانہ استعداد سازی اور سرٹیفکیشن کی راہیں ہموار ہوں گی۔ قابل ذکر ہے کہ اس سمت میں عملی قدم اٹھاتے ہوئے جموں وکشمیر میں شروع ہونے والے چھ ماہ کے پیپر میشی کورس کے لیے سی بی ایس ای کی ورک بک کا اردو ترجمہ قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر شاہنواز محمد خرم کے ذریعے تیار کرایا گیا ہے۔ کونسل ملک کے طول وعرض میں اسکل ایجوکیشن کی تربیت اور تعلیم کا بطور خاص اہتمام بھی کرے گی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 ستمبر 2021

ابوظبی میں مقیم ادیب وشاعر جناب جاوید صدیقی اور مشہور صحافی ڈاکٹر سلیم خان کو استقبالیہ

نئی دھلی: موجودہ دور میں اردو زبان کی محبوبیت کا دائرہ روز بروز پھیل رہا ہے اور برصغیر ہندوپاک کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ ان

خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے ابوظبی سے تشریف لائے مشہور شاعر جناب جاوید صدیقی اور مشہور فکشن نگار وصحافی ڈاکٹر سلیم خان کے اعزاز میں منعقد استقبالیہ تقریب میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ خاص طور پر خلیجی ممالک میں اردو زبان کے تئیں لوگوں میں غیر معمولی محبت اور دلچسپی پائی جاتی ہے اور جب ہم وہاں کسی سیمینار یا پروگرام میں جاتے ہیں تو اردو کے پرجوش محبین کو دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوتی ہے۔ شیخ عقیل احمد نے جناب جاوید صدیقی کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف ایک بہترین شاعر ہیں اور ابوظبی میں ادبی وثقافتی مجلسوں کے انعقاد میں پیش پیش رہتے ہیں، ان جیسے اردو کے بے لوث خادموں کی بدولت ہی غیر اردو خطوں میں اردو کا چراغ روشن ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر سلیم خان کی ادبی وصحافتی سرگرمیوں کی ستائش کی اور کہا کہ تازہ ترین موضوعات پر ان کے تجزیے اور تخلیقات قابل

قدر ہوتی ہیں۔ معزز مہمانوں نے قومی کونسل کے ڈائریکٹر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ پروفیسر شیخ عقیل احمد کی سربراہی میں کونسل اردو زبان کی گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس موقعے پر ایک مختصر شعری نشست بھی ہوئی جس میں جناب جاوید صدیقی نے سامعین کو اپنی غزلیں سنائیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، جناب منیر انجم، ڈاکٹر یوسف رامپوری، محترمہ آبگینہ عارف اور جناب محمد انصر نے بھی اپنے اشعار سے حاضرین کو محظوظ کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 اکتوبر 2021

مالیگاؤں کتاب میلے کا بنیادی تھیم 'نوجوان نسل اور ادب اطفال' ہے

نئی دہلی: اردو کے تئیں مالیگاؤں کے شائقین زبان و ادب کی محبت اور انجمن محبانِ اردو کتب مالیگاؤں کی درخواست کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے اپنا چوبیسواں اردو کتاب میلہ مالیگاؤں میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو

زبان، نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے بتایا کہ اس بار کتاب میلہ 9 دن کے بجائے 10 دن (3 تا 12 دسمبر 2021) تک جاری رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ کووڈ 19 سے پورا ملک متاثر ہوا تھا جس کی وجہ سے گذشتہ سال کتاب میلے کا انعقاد ممکن نہ ہوسکا، مگر اب حالات قدرے سازگار ہو رہے ہیں اور بیشتر سرگرمیاں معمول پر لوٹ رہی ہیں، اس لیے کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ اور بالخصوص نئی نسل کو کتابوں سے جوڑنے کی مہم کے تحت مالیگاؤں میں کتاب میلہ منعقد کرنے جا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میلے میں حکومت کی جانب سے جاری ہونے والی کووڈ 19 سے متعلق بھی احتیاطی تدابیر اور ہدایات پر عمل کیا جائے گا۔

میلے کے مقام کے تعین اور دیگر انتظامی امور کے تعلق سے صلاح و مشورہ کی غرض سے میلے کے انچارج جناب اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) نے مالیگاؤں کا دورہ کیا اور وہاں کے اعلیٰ سرکاری افسران اور مقامی تنظیموں کے سربراہان سے ملاقات کی جس کی رپورٹ انھوں نے ڈائریکٹر قومی اردو کونسل کو سونپی۔ مالیگاؤں کے ایڈیشنل ایس پی، ایس ڈی ایم اور معزز شخصیات کو میلے کی تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ سبھی افسران اور ذمہ داران حکومت نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کو مبارکباد دیتے ہوئے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی ہے۔

واضح ہو کہ 2014 میں مالیگاؤں ریجنل اردو کتاب میلے کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے قومی اردو کونسل نے مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کے تعاون سے چوبیسواں کل ہند اردو کتاب میلہ اے ٹی ٹی ہائی اسکول اور مراٹھا ہائی اسکول مالیگاؤں میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میلے کے دوران کتابوں کے اسٹال مراٹھا ہائی اسکول میں لگیں گے جبکہ ثقافتی پروگرام کا انعقاد اے ٹی ٹی ہائی اسکول میں کیا جائے گا۔ کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کے مطابق اس کتاب میلے کا بنیادی تھیم نوجوان نسل اور ادب اطفال ہے اور اس میں ادب اطفال پر مشتمل کتابوں کی نمائش پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ انھوں نے مالیگاؤں ایجوکیشن سوسائٹی سمیت اردو کی سبھی فعال اور سرگرم شخصیات اور مقامی تنظیموں سے جڑے ہوئے افراد سے کتاب میلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل کی اور امید ظاہر کی ہے کہ گذشتہ میلے کی طرح اس بار بھی مالیگاؤں کے شیدائیان اردو زبان و ادب کتاب میلے کو کامیابی سے ہم کنار کرانے میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 12 اکتوبر 2021

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشان دہی ضرور فرمائیں۔ اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورتِ حال، تاریخ، آثارِ قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، علاقائی ادبی صورتِ حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

فروغ اردو اور ہماری ذمے داریاں

بھاگلپور: بھاگلپور کے جگدیش پور بلاک کے کھیری باندھ گاؤں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند دہلی کے مالی تعاون سے نصرت ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام 'فروغ اردو اور ہماری ذمہ داریاں' کے موضوع پر سوسائٹی کے صدر مولانا امین احمد خان چترویدی کی صدارت میں ایک روزہ سمینار مدرسہ دارالعلوم اسعدیہ کھیری باندھ کے وسیع کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔ نصرت ویلفیئر سوسائٹی بھاگلپور کے جنرل سکریٹری مولانا زاہد حلیمی نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یاد رکھنا ہے کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے پہلے ہم کو اپنے گھر میں اسے زندہ رکھنا ہوگا، ہم حکومت سے مطالبہ تو کرتے ہیں لیکن خود اردو کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں، انھوں نے کہا کہ ہمیں اردو کے اخبارات و رسائل خود خرید کر پڑھنے چاہئیں۔ مولانا زاہد حلیمی نے کہا کہ قومی اردو کونسل اردو کے فروغ اور بقا کے لیے لگاتار اپنا موثر کردار ادا کر رہی ہے۔ مونگیر یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر شاہد رضا جمال نے کہا کہ یقیناً اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ کا جو اہم کردار رہا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے اور آج بھی اردو انھیں مدارس سے زندہ ہے۔ اس موقعے پر خانقاہ پیر دمڑیا شاہ خلیفہ باغ کے سجادہ نشین مولانا سید شاہ فخر عالم حسن مظاہری نے کہا کہ اردو میں خط و کتابت کے ساتھ نجی یادداشتیں لکھنے کا مزاج بنانا چاہیے۔ مولانا حسن نے کہا کہ گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ گفت و شنید اردو میں ہی کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ معیاری اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر مدرسہ عربیہ احیاء العلوم ناتھ نگر کے مہتمم اور جمعیۃ علما بھاگلپور کے جنرل سکریٹری مولانا امجد ناظری نظر نے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے اتحاد قومی یکجہتی کو بھی فروغ دینا ہوگا۔ اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے ابتدائی طور پر بچوں کو اردو کی تعلیم دلانی ہوگی۔ اس موقعے پر ڈی ایس پی لا اینڈ آرڈر گورو کمار نے کہا کہ میں آبائی طور پر بھاگلپور کا باشندہ ہوں لیکن میں دہلی کی سرزمین پر رہا ہوں، وہاں آج بھی لوگ اردو زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ آج بھی بالی ووڈ، فلموں، سنیما وغیرہ میں اردو کے ہی الفاظ ملیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے اندر کم الفاظ میں زیادہ باتیں کہنے کا سلیقہ موجود ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خالدہ ناز نے کہا کہ انگلش اسکولوں میں بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دی جارہی ہے، والدین اس کے لیے کوشش کریں کہ ان کے بچوں کو اردو کی تعلیم دی جائے۔ اس زبان کو روزگار سے جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ آصف الرحمٰن الجامعی علیگ اررایہ اور پروفیسر کلیم اللہ مدھوبنی نے اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 ستمبر 2021

تحقیق کے طریقۂ کار پر ایک روزہ ورکشاپ

حیدرآباد: تلنگانہ ریاستی اردو اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے حیدرآباد کے پرانے شہر میں واقع اردو مسکن، خلوت میں طلبہ واسکالرس کیلئے ایک روزہ قومی ورکشاپ منعقد ہوا۔ ورکشاپ میں حیدرآباد کی مختلف جامعات عثمانیہ، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، مانو اور دیگر یونیورسٹیوں کے طلبہ واسکالرس نے شرکت کی۔ یہ ورکشاپ تحقیق کے میدان میں کام کرنے والے افراد اور خاص کر اسکالرس کے

لیے نہایت ہی کارآمد رہا۔ تحقیق کس طرح کی جاتی ہے۔ مقالہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے اور تحقیق کے میدان میں کس طرح کی تکالیف پیش آتی ہیں اس کا حل پیش اور کئی اہم معلومات پیش کی گئیں۔ پاور پوائنٹ پرزنٹیشن کے ذریعہ پریکٹیکلی بتایا گیا۔ کنوینر ورکشاپ و ڈائرکٹر اردو اکادمی ڈاکٹر محمد غوث نے صدارت کی۔ پروفیسر مظفر شہہ میری (سابق وائس چانسلر عبدالحق یونیورسٹی کرنول)، پروفیسر صدیقی محمود (رجسٹرار مانو)، نسیم الدین فریس (مانو)، پروفیسر فضل اللہ مکرم (صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی)، ڈاکٹر عابد معز، حفیظ الرحمٰن، پروفیسر افروز عالم (صدر شعبہ سیاسیات، مانو)، پروفیسر سلیم محی الدین، پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی (مانو)، ڈاکٹر صلاح الدین سید (مانو)، پروفیسر سید نجی اللہ (مانو)، ڈاکٹر آمنہ تحسین (مانو)، ڈاکٹر اسلم فاروقی، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر اسری سلطانہ نے مختلف سیشن میں طلبہ کو ریسرچ کے طریقے بتائے۔ ڈاکٹر جہانگیر احساس نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ تمام مقررین کے خطابات پر طلبہ واسکالرس نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس طرح کے کارآمد ورکشاپ کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ طاہر رومانی، محمد آصف علی، محمد مجاہد علی (مانو)، سید مبارک برکت، جہانگیر قیاس، ڈاکٹر عبدالمغنی، محسن خان کے علاوہ اسکالرس ڈاکٹر نجمہ سلطانہ (مانو)، شیخ محمد سراج الدین، محمد یحییٰ، تبسم آرا (عثمانیہ)، فریدہ بیگم (عثمانیہ)، محمد محبوب (عثمانیہ)، محمد شفیع (عثمانیہ)، محمد شوکت فہیم (عثمانیہ)، مقبول حسین (عثمانیہ) وغیرہ نے ورکشاپ میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: محسن خان، حیدرآباد، 28 ستمبر 2021

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

اردو، فارسی کی مشترکہ تہذیبی روایت

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کے مشترکہ اجلاس میں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے 'اردو، فارسی کی مشترکہ تہذیبی روایت' کے موضوع پر خصوصی لیکچر پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ اس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس میں دنیا کی کئی بڑی تہذیبی روایات شامل ہیں۔ فارسی زبان وادب اور تہذیب کا راست اثر ہندوستانی کلچر پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال تاج محل بھی ہے۔ اردو شاعری کی بیشتر اصناف فارسی کے وسیلے سے ہی آئی ہیں اور ہندوستان آنے کے بعد یہاں کے مقامی رنگ جب ان میں شامل ہوئے تو ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے۔ تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ گذشتہ 5 جولائی سے آن لائن کلاسز کا سلسلہ جاری ہے۔ اس میں دنیا کے مختلف گوشوں سے طلبہ حصہ لے رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ چند ماہ میں انھوں نے خاصی واقفیت حاصل کرلی ہے۔ ہم نے ان کلاسز کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ ہر ماہ کسی علمی یا ثقافتی موضوع پر ایک پروگرام منعقد کرتے ہیں جس میں کسی ممتاز شخصیت کے افکار یا فن سے استفادے کا موقع ملتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 ستمبر 2021

قومی ترقی میں ہندی زبان کی اہمیت

نئی دھلی: نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے زیر اہتمام یوم ہندی کے موقعے پر پندرہ روزہ ہندی تقریب کے تحت قومی ترقی میں قومی زبان ہندی کی اہمیت پر لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ لال بہادر شاستری قومی سنسکرت یونیورسٹی کے چانسلر اور مرکزی ہندی ڈائرکٹریٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر رمیش کمار پانڈے کے ذریعے دیے گئے اس لیکچر میں زبان کی اہمیت اور افادیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ ہماری تہذیب وثقافت میں یہ مانا جاتا ہے کہ یہ زبان شخصیت سازی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس موقعے پر نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے صدر پروفیسر گوبند پرساد شرما نے کہا کہ جب تک ہماری فکر میں انگریزی زبان ترجیحی طور پر قائم رہے گی تب تک ہندی زبان قومی زبان کے طور پر قائم نہیں ہوسکے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندی زبان کو سائنسی علم و دیگر میں ریسرچ کے طور پر اختیار کرتے ہوئے اس کی تشہیر کی جائے۔ پروگرام کی ابتدا ٹرسٹ کے چیف ایڈیٹر اور جوائنٹ ڈائرکٹر نیرا جین کے ذریعے راج بھاشا کے استعمال کرنے اور اس کو فروغ دیے جانے کی قسم دلائے جانے کے ساتھ کی گئی جس میں ٹرسٹ کے سبھی افسران وملازمین شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2021

ہندوستانی زبانوں میں غالب کی مقبولیت مراٹھی کے خصوصی حوالے سے

نئی دھلی: 'ہندوستانی زبانوں میں غالب کی مقبولیت مراٹھی کے خصوصی حوالے سے' کے موضوع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے آن لائن توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی نے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب ہم کلام غالب کے تراجم کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صرف اردو ہندی ہی نہیں ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بھی غالب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ شاید یہ کہنا درست ہوگا کہ تمل میں انھیں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ تلگو جغرافیائی اعتبار سے اردو سے سب سے زیادہ قریب زبان رہی ہے۔ تلگو اور اردو میں ادبی لین دین کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ستیو مادھو راؤ پگڑی اور غالب سے ہر مراٹھی گھرانا واقف ہے۔ ان کے عاشقوں میں عوام و خواص دونوں ہی شامل ہیں۔ دو یادھر گوکھلے غالب سے متعلق ستیو مادھو راؤ کے اکثر مضامین 'لوک ستا' میں شائع کرتے تھے۔ لوک ستا کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ دو یادھر گوکھلے اپنے اداریوں میں غالب کے اشعار کثرت سے استعمال کرتے تھے جس سے مراٹھی زبان میں غالب کی مقبولیت عام ہوئی۔ پروفیسر دلوی نے اپنے عالمانہ خطبے میں مراٹھی زبان میں غالبیات کی روایت کو تفصیل سے بیان کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی (سکریٹری غالب انسٹی ٹیوٹ) نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عبدالستار دلوی ہمارے عہد کے ممتاز ادیبوں اور محققین میں شمار ہوتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عبدالستار دلوی ہمارے عہد کے ممتاز ادیب، محقق، ماہر لسانیات اور مترجم ہیں۔ انھوں نے ممبئی کی تہذیب پر جو کام کیا ہے وہ دستاویزی شناخت رکھتا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 14 ستمبر 2021

موجودہ نظام تعلیم اور انفارمیشن ٹکنالوجی

نئی دھلی: جدید ٹکنالوجی کو تعلیم کے تمام شعبوں میں خندہ پیشانی سے قبول کرنا چاہیے، اسی راہ سے موجودہ تعلیمی نظام میں انقلاب پیدا ہوسکتا ہے، آئندہ کل آج سے بہتر ہونا چاہیے، طلبہ کو زبان کے ساتھ اسکل اور ٹکنالوجی بھی اختیار کرنی چاہیے، تاکہ موجودہ کمرشیل مارکیٹ میں ان کی قدر ومنزلت کو محسوس کیا جائے، ان خیالات کا اظہار پروفیسر حبیب اللہ خان نے اسلامک فقہ اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد ایک روزہ قومی سمینار کی افتتاحی نشست میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ انھوں نے ہیومن انقلاب پر بھی سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ یہ انقلاب زندگی کے تمام شعبوں میں آیا ہے، تعلیم و حرفت، زراعت وصنعت اور سیاست و معاشرت میں غیر متوقع ترقی حاصل ہوئی، پروفیسر موصوف نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ مدارس و یونیورسٹیز کے نصاب موجودہ چیلنجز اور تقاضوں کو پورا نہیں کر پا رہے ہیں، ہم صرف کورس پڑھاتے ہیں نالج و معرفت ٹرانسفر نہیں کرتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے، لیکن ہم اساتذہ اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ افتتاحی نشست کے چیف گیسٹ ڈاکٹر ارشد اکرام شعبۂ ایجوکیشن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیم و تدریس میں آئی ٹی کی اہمیت وضرورت پر اپنی مختصر گفتگو میں کہا کہ یہ تعلیم و معرفت کا دور ہے، اس لیے آج کی انفارمیشن ٹکنالوجی کو اختیار کرکے ہی ترقی کی منزلیں حاصل کی جاسکتی ہیں، اگر آج ہم وہی تعلیم دیں اور وہی چیزیں سکھائیں جو ماضی میں پڑھاتے اور سکھاتے تھے تو گویا بچوں کے سنہرے مستقبل کو تباہ کررہے ہیں۔ افتتاحی

نشست کے مہمان اعزازی ڈاکٹر عبید الرحمٰن فلاحی نے اسلام میں علم ومعرفت کی اہمیت پر خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام نے علم کو سب سے زیادہ اہمیت دی، قیدیوں کی رہائی کے لیے شرط لگائی گئی کہ وہ چند لوگوں کو تعلیم اور لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ پروگرام کا افتتاح قرآن کریم کی تلاوت سے ہوا اور ڈاکٹر مولانا صفدر زبیر ندوی نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی تعلیم اور انفارمیشن کے میدان میں خدمات کا بھرپور تعارف کرایا اور مہمانوں اور شرکاء سمینار کا استقبال بھی کیا، جب کہ اس نشست کی خوبصورت نظامت اس قومی سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد اجمل قاسمی نے کی۔ سمینار کی پہلی نشست ڈاکٹر حبیب اللہ خان کی صدارت میں منعقد ہوئی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبید الرحمٰن فلاحی نے انجام دیے، اس نشست میں کل 8 مقالات پیش کیے گئے۔ ظہر کے بعد دوسری نشست ڈاکٹر مولانا اویس صدیقی نانوتوی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی، جب کہ نظامت کی ذمے داری ڈاکٹر قاسم عادل ندوی نے سنبھالی، اس نشست میں کل 11 مقالات پیش کیے گئے۔ اختتامی نشست کی صدارت بھی ڈاکٹر مولانا محمد اویس صدیقی نے کی اور نظامت ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی نے کی۔ مولانا اویس صدیقی نے اپنے صدارتی کلمات میں اس پروگرام کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اکیڈمی کے علمی اور تحقیقی کاموں کو سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 ستمبر 2021

اردو پر فارسی زبان وتہذیب کے اثرات

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے ستیہ وتی کالج میں آن لائن لیکچر بعنوان 'اردو پر فارسی زبان وتہذیب کے اثرات' کا انعقاد کیا گیا۔ اس خطبہ کے لیے شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی کے معروف اسکالر، سابق صدر پروفیسر علیم اشرف کو مدعو کیا گیا۔ پروفیسر نرمل جندل صاحبہ، پرنسپل ستیہ وتی کالج نے اس موقعے پر شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ موضوع ہندوستانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ فارسی زبان وتہذیب نے ہمارے یہاں صدیوں تک حکمرانی کی ہے۔ آج بھی فارسی زبان و تہذیب کے اثرات ہماری زبان وتہذیب، خاص طور سے اردو پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ستیہ وتی کالج کے شعبۂ اردو کے ٹیچر انچارج، ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر قمر الحسن نے مقرر کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ انھوں نے زبان فارسی میں ایم اے کے دوران کلاس روم لیکچر میں ہمیں فارسی زبان کی تہذیب و تاریخ پڑھائی اور ہماری تربیت بھی کی۔ پروفیسر علیم اشرف نے بہت ہی پرمغز خطبہ پیش کیا، جس سے نہ صرف طلبہ کے علم میں اضافہ ہوا بلکہ اساتذہ نے بھی استفادہ کیا۔ اس پروگرام میں نظامت ڈاکٹر عارف اشتیاق ندوی نے انجام دی۔ اس پروگرام میں کثیر تعداد میں اساتذہ اور دانشوروں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 ستمبر 2021

سرسید احمد خان کل اور آج: احمد امین کی تحریروں کی روشنی میں

نئی دھلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'سرسید احمد خان کل اور آج: احمد امین کی تحریروں کی روشنی میں' کے عنوان سے آن لائن بین الاقوامی توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر معروف ترجمہ نگار، عربی اردو کے محقق اور دانشور جامعہ ازہر، مصر کے استاذ پروفیسر محمد احمد عبد الرحمٰن المعروف بہ احمد القاضی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سرسید نے صرف طرز تحریر ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے طرز احساس کو بھی تبدیل کیا ہے۔ ان کے اس طرز کو صحیح معنوں میں سائنٹفک طرز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جدید علم کلام کی داغ بیل ڈالنے کا سہارا بھی انھی کے سر ہے۔ سرسید کی زندگی، شخصیت اور فکر و عمل سبھی کچھ حقیقت پسندی اور روشن خیالی سے عبارت ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے عرب قلم کاروں کو بھی متاثر کیا ہے۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے صدارتی کلمات میں سرسید شناسی کے حوالے سے کرنل گریہم، منشی سراج الدین سے لے کر خلیق احمد نظامی، اصغر عباس، شان محمد اور افتخار عالم خان تک کی تحقیقات کا از سر نو جائزہ لینے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ سرسید جیسا عبقری اور دیوقامت قائد برصغیر نے شاذ و نادر ہی پیدا کیا ہو۔ مہمان خصوصی پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے مہمان مقرر پروفیسر احمد القاضی کی پذیرائی کرتے ہوئے کہا کہ ان کا یہ خطبہ صحیح معنوں میں وقیع اور بلیغ تھا۔ اس خطبے سے سرسید شناسی کے کئی مخفی گوشے روشن ہوتے ہیں۔ توسیعی خطبے کے کنوینر ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید نے پروفیسر احمد القاضی اور خطبے کے موضوع کا مفصل تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر احمد القاضی ہند عرب تہذیب وثقافت کے گہرے رمز شناس ہیں۔ ان کے تراجم، کتابیں اور لیکچرز سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہند و عرب کلچر کے مایۂ ناز سفیر ہیں۔ اظہار تشکر میں ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے سرسید اور ان کے کارناموں کو نوآبادیاتی مطالعات کی روشنی میں دیکھنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ سے لے کر جامعہ تک کے اس تاریخی سفر کو استعمار شناسی کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے ڈاکٹر خالد مبشر نے کہا کہ یہ پرمغز خطبہ سرسید کے حوالے سے عرب دانشوری کے نقطۂ نظر کا بہترین ترجمان ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 ستمبر 2021

اکبرالہ آبادی صدی تقریبات

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام اکبرالہ آبادی صدی تقریبات کا انعقاد ہوا جس میں آف لائن اور آن لائن محبان اردو وطلبہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سمینار کا آغاز آرٹس فیکلٹی کے ہال میں ہوا۔ تقریبات کے افتتاحی کلمات صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف

آرٹس پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پیش کیے اور اکبرالہ آبادی کے حوالے سے کہا کہ اکبرالہ آبادی کی شخصیت لافانی ہے۔ ان کی اہمیت اردو ادب میں ہیرے کی مانند ہے کہ اسے جس طرح سے بھی تراشا جائے، اس کی اہمیت بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔ مہمان خصوصی کے طور پر لندن سے آیت اللہ علامہ عقیل الغروی نے آن لائن شرکت کی اور اکبرالہ آبادی کے حوالے سے پرمغز گفتگو کی اور کہا کہ موجودہ وقت میں جہاں اخلاقی قدریں کم ہو رہی ہیں۔ تہذیب وثقافت پر بھی اس کا اثر ہو رہا ہے۔ ایسے وقت میں اکبرالہ آبادی کو پڑھنا اور ان کے افکار و خیالات کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ پہلے اجلاس کا کلیدی خطبہ پروفیسر احمد محفوظ نے دیا اور اکبرالہ آبادی کو ان کے اشعار کے حوالے سے پیش کیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ موجودہ عہد میں اکبرالہ آبادی کی تفہیم بے حد ضروری ہے۔ دیگر صدور پروفیسر قدوس جاوید اور پروفیسر اعجاز علی ارشد نے بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ دہلی یونیورسٹی اس طرح کے کام میں ہمیشہ فعال رہی ہے اور مبارکباد کی مستحق ہے۔ دوسرے اجلاس کا آغاز ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کیا۔ اس اجلاس میں دہلی

یونیورسٹی کے وائس چانسلر پی سی جوشی کے بدست دو کتاب 'اکبر الہ آبادی (کتابیات)' اور 'کربل کتھا' کا اجرا عمل میں آیا۔ وائس چانسلر نے مبارکباد دیتے ہوئے ہمت افزائی کی اور کہا کہ اس وبائی اور پر آشوب دور میں آف لائن پروگرام منعقد کر کے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی بالخصوص پروفیسر ارتضی کریم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب ہم جلد ہی آف لائن درس و تدریس کے فرائض انجام دے سکیں گے۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ آخر میں شعبہ کے استاد ڈاکٹر متھن کمار نے تمام شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ تیسرے اجلاس کا آغاز 22 ستمبر کو ہوا، صدارت کے فرائض پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، پروفیسر اعجاز علی ارشد نے انجام دیے۔ نظامت کے فرائض پروفیسر ابوبکر عباد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے بخوبی انجام دیے۔ پروفیسر قدوس جاوید، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ثاقب فریدی، ڈاکٹر عطیہ رئیس اور ڈاکٹر مستمر نے بڑے ہی پر مغز تحقیقی اور علمی مقالے پیش کیے۔ چوتھے اجلاس میں پانچ مقالے پیش کیے گئے جس میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر شاہدہ فاطمہ وغیرہ نے اکبر الہ آبادی کی حیات و شخصیت پر مدلل گفتگو کی۔ آخر میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک و بیرون ملک کے معروف و مشہور شعرا نے آف لائن اور آن لائن شرکت کی۔ پروگرام کے اختتام پر شرکا اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انھیں اسناد سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 ستمبر 2021

ترجمہ: نظریہ اور تطبیق

نئی دہلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام 'ترجمہ: نظریہ اور تطبیق' کے موضوع پر پروفیسر عبدالماجد قاضی، صدر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں تیسرے توسیعی خطبہ کا آن لائن انعقاد کیا گیا، جس میں مہمان خطیب کی حیثیت سے شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے استاد اور معروف ادیب پروفیسر ثناء اللہ ندوی نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں توسیعی خطبوں کے کنوینر ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے مہمان خطیب، اساتذۂ کرام، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر ثناء اللہ ندوی کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر نسیم اختر کے بعد مہمان خطیب پروفیسر ثناء اللہ ندوی نے خطاب کیا اور فن ترجمہ نظریہ اور تطبیق کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی، آپ نے ترجمہ کی مختلف تعریفوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دوران ترجمہ مترجم بیرونی یا اپنے ثقافتی اثرات سے متاثر ہو سکتا ہے، لہٰذا ایک اچھے مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے اور متن کا خیال رکھتے ہوئے ترجمہ کرے، فاضل خطیب نے کہا کہ ترجمہ کا یہ حسن ہے کہ اس میں ترجمہ کی بو نہ آئے، آپ نے اپنے خطاب میں کہا کہ ایک مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جب کسی دوسرے فن کی کتاب کا ترجمہ کرے تو وہ اس فن کی اصطلاحات سے واقف ہو نیز دوران ترجمہ وقت کا خیال کرے۔ خطاب کے بعد شعبہ کے ریسرچ اسکالر آفاق قریشی، اشرف اخلاق اور سمیہ ہدایت نے سوالات کیے جن کے جوابات مہمان خطیب نے دیے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر نسیم اختر ندوی نے پروفیسر ثناء اللہ ندوی، اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، طلبہ و طالبات اور تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 ستمبر 2021

دور حاضر میں غالب کے فارسی کلام کی معنویت، اہمیت اور افادیت

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں دوسرا آن لائن غالب توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور ادیب و محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ غالب کی فارسی شاعری کا وہ پایہ تو نہیں جو ان کی اردو شاعری کا ہے لیکن یہ اپنی نوعیت کا منفرد کلام ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم غالب کے فارسی کلام پر بھی خاطر خواہ توجہ دیں۔ غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اور وہ فارسی خطوط بڑے اہتمام سے لکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی میں بڑی کامیاب مثنویاں کہیں جن میں 'چراغ دیر' اور 'سرمۂ بینش' سب سے زیادہ مشہور ہوئیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بلند ترین فنی معیار کو پہنچتی ہیں۔ ان کے فارسی کلام میں معنیٰ آفرینی کے ایسے نمونے پنہاں ہیں، جن کی مثال آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔ خطبے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اگرچہ موضوع بڑا وسیع تھا، لیکن ڈاکٹر تقی عابدی کا علمی تبحر ایسا ہے کہ انھوں نے غالب کے فارسی کلام کے مختلف پہلوؤں پر معنی خیز گفتگو کی ہے۔ غالب کے فارسی آثار پر بھی اگرچہ خاصی گفتگو کی جا چکی ہے لیکن ابھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاطر خواہ مواد سامنے نہیں آ سکا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی ہمارے عہد کے ممتاز ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے کلاسیکی شعرا پر خصوصاً جو کام کیا ہے۔ اس سے ادبی دنیا بخوبی واقف ہے۔ انھوں نے کلیات غالب فارسی کو بڑی محنت اور تحقیقی تقاضوں کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ آج کے توسیعی خطبے بعنوان 'دور حاضر میں غالب کے فارسی کلام کی معنویت، اہمیت اور افادیت' کے موضوع پر جس عالمانہ انداز میں گفتگو کی وہ انھی کا حصہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 اکتوبر 2021

اتر پردیش

یوم اساتذہ

میرٹھ: ایک اچھا استاد ہمیشہ اپنے طلبہ و طالبات کے بہتر مستقبل کی فکر میں لگا رہتا ہے اور اپنی کاوشوں سے نہ صرف ان کی بہترین تربیت کرتا ہے بلکہ اپنے طلبہ کا مستقبل بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں یوم اساتذہ کے تعلق سے منعقدہ پروگرام میں صدارتی خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ استاد ہی اپنے طلبہ کے ذریعے معاشرے میں پھیلی برائیوں کو دور کر سکتا ہے۔ اس موقعے پر سعید احمد سہارنپوری نے غالب کی غزل اپنی مترنم آواز میں پیش کر کے سماں باندھا تو وہیں ایم فل کی طالبہ سیدہ مریم نے اساتذہ پر اپنی بہترین تخلیق پیش کر کے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ بعد ازاں سبھی طلبہ و طالبات نے اساتذہ کرام کا پھولوں کے ذریعے استقبال کیا۔ نظامت کے فرائض فیضان ظفر اور فرح ناز نے مشترکہ طور پر انجام دیے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شعبہ کی استاد ڈاکٹر شاداب علیم نے کہا کہ یوم اساتذہ ہمارا قومی دن ہے جس کو ہم ہر سال 5 ستمبر کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مناتے ہیں۔ ڈاکٹر آصف علی نے کہا کہ حروف شناسی کے ساتھ ساتھ تربیت بھی لازمی ہے۔ آج کا تعلیمی نظام محض حروف شناسی یا حصول ڈگری تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس موقعے پر ارشاد سیانوی نے کہا کہ روز اول سے ہی استاد کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ موجودہ صورت حال میں بھی اساتذہ کو اپنی ذمے داریوں اور طلبہ و طالبات کی رہنمائی کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر الکا وششٹھ نے کہا کہ ابتدا سے ہی میرے اساتذہ نے میری اچھی رہنمائی کی۔ ان کی دعاؤں کے طفیل میں آج آپ کے سامنے ہوں اور میں سبھی طلبہ و طلبات کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 ستمبر 2021

جنگ آزادی اور اردو ادب

بنارس: اردو کے نعرے انقلاب زندہ باد، بسمل عظیم آبادی کا شعر 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے' اور علامہ اقبال کی بہت سی نظمیں ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک

نیا جوش پیدا کرتی تھیں۔ ان خیالات کا اظہار عزت مآب عارف محمد خاں (گورنر کیرالہ) نے اس قومی ویبنار کے افتتاحی اجلاس میں کیا۔ انھوں نے اردو زبان کی توانائی اور تاریخی سرمایے کو نئی نسل کے لیے قیمتی اثاثہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اپنے اکابرین کی کوششوں کو یاد رکھنا روشن مستقبل کے لیے ضروری ہے۔ ویبنار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مشہور نقاد اور دانشور شمیم طارق صاحب نے کہا کہ جنگ آزادی کا بیشتر ادبی سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ اردو کے شعرا و ادبا نے کبھی برطانیہ کی غلامی قبول نہیں کی اور ابتدا سے ہی اس کی مخالفت میں سینہ سپر رہے۔ پروفیسر شیخ محمد عقیل (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی) نے اپنے صدارتی خطبے میں جنگ آزادی اور اردو کے رشتوں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو جنگ آزادی کی ترجمان رہی ہے۔ ہمارے شعرا و ادبا نے جنگ آزادی کی جدوجہد میں تخلیقی و عملی دونوں سطح پر حصہ لیا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر مشتاق احمد، رجسٹرار للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ نے کہا کہ یہ نہایت اہم موضوع ہے اور اس پر متواتر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل پروفیسر آفتاب احمد آفاقی صدر شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے جنگ آزادی میں اردو زبان و ادب کی خدمات اور اردو سے وابستہ ادیبوں، صحافیوں اور شعرا کی قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مشرف علی نے کی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر احسان حسن نے ادا کی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد مقالہ خوانی کے دو اجلاس منعقد ہوئے جن میں جنگ آزادی اور اردو ادب کی خدمات سے متعلق متعدد مقالے پیش کیے گئے۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر تعبیر کلام، ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر محمد زاہدالحق، ڈاکٹر فیروز عالم، ڈاکٹر امتیاز وحید، ڈاکٹر احسان حسن، ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے اپنے مقالات پیش کیے۔ صدارت پروفیسر محمد علی جوہر، پروفیسر آفتاب اشرف،، پروفیسر اشفاق احمد نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رشی کمار شرما اور شکریے کی رسم ڈاکٹر عبدالسمیع نے ادا کی۔ دوسرا اجلاس پروفیسر انور پاشا، پروفیسر شہزاد انجم، اور پروفیسر شہاب عنایت ملک کی صدارت میں شروع ہوا جس میں پروفیسر محمد کاظم، ڈاکٹر احمد امتیاز، ڈاکٹر شبانہ جاوید (کولکاتا) ڈاکٹر محمد اختر، ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر افضل مصباحی نے اپنے مقالے پیش کیے۔ نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے ادا کی۔ ویبنار کے آخر میں پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس ویبنار میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے طلبا، ریسرچ اسکالرز کثیر تعداد میں شامل ہوئے۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد آفاقی، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، 31 اگست 2021

مولانا محمد علی جوہر سے متعلق کتب کی نمائش

رامپور: حکومت ہند کی جانب سے ملک کی آزادی کے 75 سال مکمل ہونے پر 'آزادی کا امرت مہوتسو' کے ضمن میں رامپور رضا لائبریری کے دربار ہال میں عظیم مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر سے متعلق کتب کی نمائش لگائی گئی۔ نمائش کا افتتاح ڈاکٹر رضیہ پروین صدر شعبہ اردو این ایس انچارج گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج رامپور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر رضیہ پروین صدر شعبہ اردو گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج نے کہا کہ تحریک آزادی کے دور میں ایک تحریک ایسی ابھر کر آئی جس نے آزادی کی چنگاری کو شعلہ بنا دیا۔ ہندو اور مسلمانوں میں ایک نئے اتحاد کی شروعات ہوئی۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں آزادی کی تحریک و علی برادران اور خلافت کا تعاون حاصل ہوتے ہی نئے باب کا آغاز ہو گیا۔ آبادی بیگم المعروف بی اماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے لال، ہندوستان کی تحریک آزادی کی علامت بن گئے۔ مسٹر محمد علی جوہر جو کہ بعد میں مولانا محمد علی جوہر کے نام سے جانے گئے، اپنے سگے بھائی شوکت علی کے ساتھ اس کارواں میں شریک ہوئے جس کی قیادت باپو کر رہے تھے۔ ڈاکٹر رضیہ پروین نے رامپور سے مولانا محمد علی جوہر کے تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ آپ فرزند رامپور ہیں اور آپ کی والدہ بی اماں کا بھی جنگ آزادی میں اہم کردار رہا ہے۔ محمد علی جوہر کو رامپور کا پہلا گریجویٹ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس موقعے پر رامپور رضا لائبریری کے لائبریرین و افسر برائے اطلاعات ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے تقریب کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کا امرت مہوتسو ان لوگوں کی شکرگزاری کی ایک کوشش ہے جن کی جدوجہد و قربانیوں کے نتیجے میں آج ہم آزادی کی کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آزادی ہمیں اپنے بزرگوں کی ہمہ جہت جدوجہد اور جانوں کی قربانی کے بعد حاصل ہوئی ہے، ہمیں آزادی کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 ستمبر 2021

اردو ہندی کی مشترکہ صحافت ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی وراثت

پریاگ راج: اردو صحافت کے دو سو سال مکمل ہونے پر ادب گھر کریلی میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ایم ڈبلیو انصاری سابق ڈی جی پی چھتیس گڑھ شریک ہوئے جب کہ مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر صالحہ رشید صدر شعبۂ فارسی الہ آباد یونیورسٹی، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر اجے مالویہ اور حکیم ارشادالاسلام موجود رہے۔ اس موقعے پر مقررین نے کہا کہ آزادی سے متعلق نعرے اور آزادی کے متوالوں کو جوش دینا اردو صحافت کا ہی کام تھا۔ ایم ڈبلیو انصاری نے کہا کہ اردو صحافت اور ہندی صحافت مشترکہ وارثت رہی ہے۔ اردو صحافت کے فروغ میں بڑی تعداد میں غیر مسلموں نے بھی اپنا تعاون پیش کیا ہے۔ اجے مالویہ نے اپنی ریسرچ کا ایک اقتباس پڑھا۔ پروفیسر صالحہ رشید نے کہا کہ اردو ہندی کی مشترکہ صحافت ہماری گنگا جمنا کی تہذیب کی روایت رہی ہے۔ انھوں نے منشی نول کشور کا ذکر کیا اور بتایا کہ صحافت میں مولانا محمد علی جوہر کا کامریڈ، مولانا عبدالماجد دریابادی کا صدق، مولانا ابوالکلام آزاد کا

الہلال اور سرسید احمد خاں کا تہذیب الاخلاق بے مثال صحافت کے نمونے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر خورشید ایم ڈی نے ایک نظم پڑھ کر اپنے خیال کا اظہار کیا۔ نظامت فرمود الہ آبادی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2021

جگر کا پیغامِ محبت

مراد آباد: عالمی شہرت کے حامل اور مرادآباد کی ادبی شناخت جگر مرادآبادی کے یوم وفات کے موقعے پر حسب روایت جگر مرادآبادی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام یاد جگر کے تحت اکمل میموریل لائبریری دیوان کا بازار مرادآباد

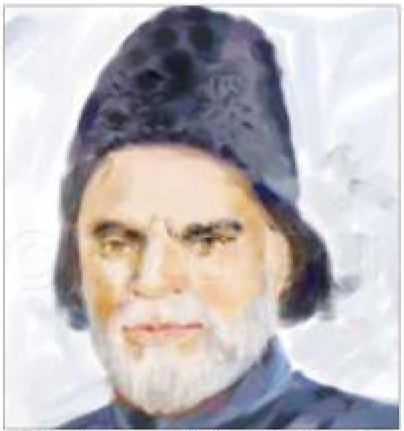

میں ایک مذاکرہ بعنوان 'جگر کا پیغامِ محبت' منعقد کیا گیا جس کی صدارت فاؤنڈیشن کے چیئرمین عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے کی اور نظامت کے فرائض فاؤنڈیشن کے سکریٹری ڈاکٹر محمد آصف حسین نے انجام دیے۔ ڈاکٹر محمد آصف حسین نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے شہر کو شہر جگر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جگر صرف ایک شاعر کا نام نہیں بلکہ ایک دور کی تاریخ کا عنوان ہے۔ مفتی دانش قادری نے کہا کہ وقت کی ضرورت ہے کہ جگر کے اس پیغام کو عام کیا جائے کہ ''ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں، میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔'' ڈاکٹر مجاہد فراز نے کہا کہ یاد جگر صرف ایک رسم نہیں ہونی چاہیے بلکہ یہ دن ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم جگر کے فلسفۂ حسن و عشق کو سمجھیں اور جگر نے زندگی میں عشق کا جو مقام متعین کیا ہے اس کے ساتھ آگے بڑھیں۔ ضیا ضمیر نے کہا کہ حالانکہ جگر روایتی غزل کے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کے یہاں جدید رنگ بھی نظر آتا ہے۔ فرحت علی خاں نے کہا کہ جگر نے بہر صورت پیار و محبت کا پیغام دیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں اپنے پرائے کا کوئی امتیاز نہیں رکھتے بلکہ ہر شخص سے محبت کے قائل ہیں۔ اسد مولائی نے کہا کہ جگر صاحب اس بات سے خوب اچھی طرح واقف تھے کہ ہر شخص سے محبت کرنا یقیناً مشکل امر ہے لیکن اس مشکل کو ہی آسان کرنا وہ سکھانا چاہتے تھے۔ سید محمد ہاشم قدوسی نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جگر کی عصری معنویت کو سمجھیں اور نوجوان نسل کو اس کی اہمیت و افادیت سے واقف کرائیں، یہ وقت کا تقاضا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 ستمبر 2021

لسانی سامراج اور لسانی شناخت: عالمی پس منظر

علی گڑھ: ''سمعی اشاروں خاص طور سے بولی اور لہجے کی بنیاد پر کسی فرد کی نسل یا قومیت کی شناخت کا رجحان، منفی رویہ اور امتیازی سلوک کا باعث بن سکتا ہے۔'' یہ بات نامور امریکی اسکالر اور ماہر لسانیات ڈاکٹر جان با (پروفیسر نفسیات، بشریات، تعلیم، انگریزی، لسانیات اور افریقی-امریکی مطالعات، واشنگٹن یونیورسٹی، سینٹ لوئی امریکہ) نے کہی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ لسانیات کے زیر اہتمام 'لسانی سامراج اور لسانی شناخت: عالمی پس منظر' کے موضوع پر ویب ٹاک پیش کر رہے تھے۔ کچھ زبانیں کیوں زیادہ یا کم استعمال کی جاتی ہیں، اس عمل میں نظریات اور مختلف نظام کیا کردار ادا کرتے ہیں اور زبان کے ماہرین کا اس میں کیا کردار ہوتا ہے، ان تمام امور پر پروفیسر با نے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا ''نوآبادیاتی تسلط کو آگے بڑھانے میں مقامی لوگوں پر کالونائزر کی زبان کا اہم کردار ہوتا ہے۔ کئی سامراجی نظاموں نے بچوں کو سامراجی زبان کی تعلیم دینے کے لیے مخصوص کوششیں کی ہیں اور تعلیم کے لیے اسے مجاز زبان قرار دیا۔ حاکم کی زبان بولنے والوں کے پاس طاقت تھی، جب کہ وہ لوگ جو صرف مقامی زبانیں بولتے تھے حاشیہ پر رہ گئے۔'' پروفیسر با نے اس بات پر زور دیا کہ نوآبادیات میں سامراجی حکومتوں اور ان کی ثقافت کی توسیع میں سامراج کی زبان نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے انگریزی کے 'عالمی زبان' بننے کے پیچھے کارفرما تصور اور مابعد نوآبادیاتی سماج و زبان پر اس کے اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ امریکہ، چین، جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں لسانی سامراج کی تاریخ پر بات کرتے ہوئے پروفیسر با نے کہا کہ لسانی سامراج بنیادی طور پر سیاسی اور معاشی مفادات کے ضمن میں آگے بڑھا، اور انگریزی زبان کی توسیع میں اس کی واضح مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جب پالیسیوں میں جان بوجھ کر نظریات کو شامل کیا گیا کہ اس کا فائدہ انگریزی بولنے والوں کو پہنچے، اور دوسری زبانیں بولنے والوں کو فائدہ نہ پہنچے، چنانچہ آج انگریزی کو عالمی بول چال کی زبان ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 ستمبر 2021

سرسید احمد خان کے کلامی اور فلسفیانہ نظریات

علی گڑھ: سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) نے 'سرسید احمد خاں کے کلامی اور فلسفیانہ نظریات' پر ایک ویبینار کا اہتمام کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے تقریب کی صدارت کی جب کہ ڈاکٹر سید شاہد مہدی، سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے سرسید اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والی تین کتابوں کا اجرا کیا۔ ان میں مولانا اسماعیل پانی پتی کی 'مقالات سرسید'، 'سرضیاء الدین احمد: لائف اینڈ ورکس' از محمد حارث بن منصور (سرسید فیلو، سرسید اکیڈمی) اور 'صاحبزادہ آفتاب احمد خاں' از مسٹر ظفر منہاج شامل ہیں۔ اپنے افتتاحی کلمات میں پروفیسر منصور نے کہا کہ سرسید اکیڈمی بہت فعال رہی ہے اور ریکارڈوں کو ڈیجیٹل کرنے پر کام کر رہی ہے۔ مونوگراف کے مصنفین کو مبارکباد دیتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا ''سرسید کے لبرل اور بین المذاہب مکالمے سے متعلق افکار کی نشر و اشاعت میں اے ایم یو کلیدی کردار ادا کر رہا ہے، سرسید دور اندیش مصلح تھے جنھوں نے مسلمانوں کو سائنسی مزاج اپنانے اور قرون وسطیٰ کی سوچ سے باہر نکلنے کی تلقین کی۔'' مہمان خصوصی ڈاکٹر سید شاہد مہدی نے کہا کہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے ہندوستانی معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے گراں قدر کام کیا۔ اس تحریک نے برصغیر کے لوگوں اور خاص طور پر مسلمانوں کی زندگیوں اور ادب پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ وقت کی ضرورت ہے کہ سرسید احمد خاں کی بازیافت ہو جنھوں نے مذہبی رواداری، آزادی اظہار اور دیگر لبرل اقدار کی ترویج کی۔ پروفیسر علی محمد نقوی نے 'مقالات سرسید' کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ سرسید اکیڈمی قدیم اور قیمتی دستاویزات کو ضروری ترمیم کے ساتھ سامنے لانے کے لیے مسلسل کام کر رہی ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، 22 ستمبر 2021

اردو شاعری میں وطن پرستی

رامپور: آکاش وانی رامپور میں آزادی کے امرت مہوتسو کے دوران 'اردو شاعری میں وطن پرستی' پر مباحثہ ہوا، جس

میں اردو ادب سے وابستہ شخصیات پروفیسر ممتاز عرشی، ڈاکٹر رضیہ پروین اور ڈاکٹر ارشد رضوی نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز آکاش وانی رامپور کی ڈائریکٹر محترمہ سندیپ کور نے کرتے ہوئے کہا کہ آکاش وانی رامپور کے ذریعے آزادی کا امرت مہوتسو پر پروگرام نشر کیے جارہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی کی تحریک میں کویوں اور شاعروں کا اہم رول رہا ہے۔ گورنمنٹ گرلز پی جی کالج شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر رضیہ پروین نے ہندی اور اردو کو ہندوستان میں 'انیکتا میں ایکتا' کا سفیر بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک ایسا گہوارہ ہے، جس میں سب کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت ہے۔ 'سرفروشی کی تمنا' اور 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' جیسے ترانے وطن پرستی کی اہم مثال ہیں۔ گورنمنٹ رضا پی جی کالج صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ارشد رضوی نے شاعری کی قدیم تاریخ کے حوالے سے بتایا کہ خدا پرستی، مذہب پرستی اور وطن پرستی تینوں آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ شاعروں کا وطن سے عشق ہی تھا، جس نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا کوئی ایسا شاعر نہیں ہے، جس نے وطن پر کوئی شعر نہ لکھا ہو۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 ستمبر 2021

ہندی اردو کا باہمی رشتہ

میرٹھ: زبانوں سے ہم زندگی، معاشرے اور اپنے ملک کو بہت خوشگوار بنا سکتے ہیں مگر ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم زبانوں کی معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں حالانکہ ہندوستانی زبانوں کی جو فطرت ہے وہ بڑی معصوم ہے۔" یہ الفاظ تھے عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی کے جو انتر اشٹریہ ساہتیہ کلا منچ، میرٹھ اور بزم اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے مشترکہ اہتمام میں منعقد شعبۂ اردو، سی سی ایس یو کے صدر اور نئی نسل کے معروف فکشن ناقد اور افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی کہانیوں کے نئے مجموعہ 'بہروپیا' (ہندی) کی رسم اجرا اور بعنوان 'ہندی اردو کا باہمی رشتہ' سمینار میں اظہار خیال کے دوران ادا کررہے تھے۔ استقبال ڈاکٹر شاداب علیم، صاحب کتاب کا تعارف ڈاکٹر آصف علی، کتاب پر تبصرہ چاندنی عباسی، شکریہ ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر الکا وشسٹھ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ تقریب کی صدارت معروف ادیب پروفیسر وید پرکاش بٹوک نے فرمائی۔ جب کہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر وائی وملا (نائب شیخ الجامعہ، سی سی ایس یو) اور مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر پی ایس یادو (پرنسپل ڈی، این کالج، میرٹھ) اور ڈاکٹر رام گوپال بھارتیہ (صدر، انتر اشٹریہ ساہتیہ کلا منچ، میرٹھ) شریک ہوئے۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر وائی وملا نے کہا کہ اردو اور ہندی ایک ہی علاقے اور عہد کی پیداوار اور دو سگی بہنوں کے مثل ہیں۔ ان کا یہ رشتہ خونی اور روحانی رشتہ ہے جسے کبھی منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے 'بہروپیا' کے تعلق سے کہا کہ یہ ہندی اور اردو کے آپسی رشتوں کی بہترین مثال ہے۔ اس میں پروفیسر اسلم نے سماج کے بہت سارے رنگ پیش کرکے ہمارے سامنے آئینہ رکھ دیا ہے۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک ہی ہیں بس لباس (رسم الخط) الگ ہے۔ اگر قواعد کی بات کی جائے تو تقریباً ایک ہی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 ستمبر 2021

بہار

اردو طلبہ وطالبات کے مابین تقریری مقابلہ

اورنگ آباد: اورنگ آباد کے ٹاؤن ہال (نگر بھون) میں اردو ڈائریکٹوریٹ پٹنہ محکمہ کابینہ، بہار سرکار پٹنہ کے مالی تعاون سے اور ضلع اردو زبان سیل اورنگ آباد اور ضلع انتظامیہ اورنگ آباد کی جانب سے اردو داں طلبہ کے درمیان تقریری مسابقے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح ضلع مجسٹریٹ اورنگ آباد سوربھ جوروال نے شمع فروزی کرکے کیا اور اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بھی ضلع مجسٹریٹ سوربھ جوروال موجود تھے جب کہ اس تقریب میں مہمان اعزازی کے طور پر ایس پی اورنگ آباد کانتیش کمار مشرا، ڈی ڈی سی اورنگ آباد انشل کمار، ایس ڈی اورنگ آباد ڈاکٹر پردیپ کمار، سینئر ڈپٹی کلکٹر اورنگ آباد، ڈاکٹر فاتح فیاض، سیل ٹیکس آفیسر محمد اسلم موجود تھے۔ اس تقریب کی نظامت یوسف جمیل یوسف کررہے تھے۔ ڈپٹی الیکشن آفیسر اورنگ آباد اور ضلع اردو زبان سیل کے انچارج افسر جاوید اقبال نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا اور کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور ہم اس زبان کے فروغ کے لیے نئی نسل کو اس زبان کے قریب لائیں تبھی جاکر اس زبان کا فروغ ممکن ہے۔ ہمیں یہ چاہیے کہ اردو کے اخبار، اردو کے رسائل اپنے گھروں میں خریدیں اور بچوں کو اردو پڑھائیں۔ ڈی ایم اورنگ آباد سوربھ جوروال نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو ایک نہایت میٹھی اور شیریں زبان ہے اور ہمیں چاہیے کہ اس زبان کو سیکھیں اور اسے فروغ دیں۔ ایس پی اورنگ آباد کانتیش کمار مشرا نے کہا کہ اردو اور ہندی دو سگی بہنیں ہیں اور زبانیں ہمیں طاقت دیتی ہیں۔ اس تقریب میں 36 طلبہ وطالبات نے حصہ لیا جن میں سے 24 کامیاب طلبہ وطالبات کو چیک، سند شرکت اور میڈل دیا گیا۔ اس مسابقہ کے لیے تمام اردو اسکول، کالج اور مدارس کو ضلع انتظامیہ کی طرف سے خط بھیجا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد کے مختلف کوچنگ سینٹروں کے طلبہ وطالبات نے بھی اس تقریری مسابقے میں حصہ لیا۔ اس تقریری مسابقے کے لیے میٹرک میں تعلیم کی اہمیت، شراب سبھی برائیوں کی جڑ اور جل جیون ہریالی، آئی اے کے لیے صفائی کی اہمیت، اردو زبان کی اہمیت اور جل جیون ہریالی اور بی اے کے لیے جہیز ایک سماجی لعنت، اردو غزل کی مقبولیت اور جل جیون ہریالی عنوانات دیے گئے تھے جس کے حوالے سے طلبہ وطالبات نے بے حد عمدہ تقریریں کیں جن کی لوگوں نے بے انتہا پذیرائی کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 ستمبر 2021

تلنگانہ

جنگ آزادی، گاندھی اور ہندی

حیدرآباد: دنیا کے تمام مذاہب عدم تشدد کا درس دیتے ہیں لیکن مہاتما گاندھی نے ہندوستانی ثقافت کے امتزاج کے ساتھ اسے آزادی کی جدوجہد میں انگریزوں کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے آزادی کا امرت مہوتسو کے تحت لیکچر سیریز کے ایک حصے کے طور پر 'سواتنتر سنگرام، گاندھی اور ہندی' کے موضوع پر منعقدہ لیکچر میں کیا۔ پروگرام کا اہتمام آزادی کا امرت مہوتسو کمیٹی، این ایس ایس اور شعبۂ ہندی، مانو نے مشترکہ طور پر عدم تشدد تقریبات کے موقعے پر کیا۔ پروفیسر عین الحسن نے موجودہ دور میں عدم تشدد کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ پروفیسر محمد فریاد، صدر نشین کمیٹی نے افتتاحی تقریر کی۔ ڈاکٹر کرن سنگھ اتوال، صدر شعبۂ ہندی نے اس موقعے پر اپنے لیکچر میں گاندھی جی کے ذریعے ہندی زبان کے فروغ، جدوجہد آزادی میں ہندی شاعری اور شاعروں کے کردار کا احاطہ کیا۔ ڈاکٹر اروند حتی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ کمپیوٹر سائنس و انفارمیشن ٹیکنالوجی نے شکریہ ادا کیا۔ قبل ازیں جشن آزادی کے حصے کے طور پر 'آزادی کی جدوجہد اور مہاتما گاندھی' پر طلبا کے لیے کوئز مقابلہ بھی منعقد کیا گیا۔ کوئز مقابلے میں 300 سے زائد

طلبہ نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر اروندھتی کوآرڈینیٹر تھیں۔ پروفیسر صدیقی محمود، رجسٹرار انچارج نے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کی آزادی کے لیے عوام کی جانب سے دی گئی قربانیوں کو یاد کیا۔ ڈاکٹر شیخ قمرالدین، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ مینجمنٹ اینڈ کامرس نے شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، پرو وائس چانسلر نے گاندھی جی کی زندگی اور ان کے اقدار پر اظہار خیال کیا اور کہا کہ ہر ایک کو ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر فلم 'گاندھی' کی نمائش بھی کی گئی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 اکتوبر 2021

ہندوایران کے دوممتاز مرثیہ نگار

حیدرآباد: سولہویں صدی کے ایرانی شاعر محتشم کاشانی اور انیسویں صدی کے ہندوستانی شاعر میر انیس سے اپنے اپنے ملک میں جو بھی واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین کے بارے میں جانتا ہے وہ ان دونوں سے بھی آشنائی رکھتا ہے۔ محتشم کاشانی اپنی سادگی وسلاست اور میر انیس اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی اور خانہ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران، ممبئی کے زیر اہتمام منعقدہ ویبینار میں کیا۔ بین الاقوامی ویبینار عنوان 'ہندوایران کے دوممتاز مرثیہ نگار شعرا میر انیس و محتشم کاشانی' یکم اکتوبر کو زوم پر منعقد کیا گیا۔ پروفیسر عین الحسن نے خاص طور سے ایران کے مشہور شاعر قاآنی کے مرثیہ کا ذکر کیا جو سوال و جواب پر مشتمل ہے اور فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر عزیز بانو صدر شعبۂ فارسی مانو نے بعنوان 'مرثیہ نگاری کا تاریخی پس منظر ہندوایران کی روشنی میں' مقالہ پیش کرتے ہوئے مرثیہ نگاری پر سیر حاصل بحث کی۔ ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ فارسی نے 'محتشم کاشانی ایک منفرد مرثیہ نگار' کے عنوان سے، پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم نے 'انیس کے مرثیوں میں منظر کشی' کی۔ سلیمان زارہ (ایران) نے محتشم کاشانی اور میر انیس کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کے عنوان سے، پروفیسر نرگس جابری نسب (ایران) نے ہندوان فارسی گوئی ومرثیہ ہای عاشورای کے عنوان سے اور پروفیسر اشتیاق احمد، پروفیسر شعبۂ فارسی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی نے نقش زن در مراثی میر انیس کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ابوطالب رضوی مشہور پروڈیوسر، ڈائرکٹر نے میر انیس کے چند مرثیوں کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کیا۔ آخر میں دکتر محسن عاشوری ڈائرکٹر خانہ فرہنگ جمہوریہ اسلامی ایران، ممبئی نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اردو یونیورسٹی، شعبہ فارسی اور خانہ فرہنگ کے اشتراک سے بہت جلد علمی، ادبی اور تحقیقی پروگراموں کو قطعیت دی جائے گی۔ نظامت پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی نے کی۔ ملک اور بیرون ملک کی کئی یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طالب علموں نے کثیر تعداد میں آن لائن شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 اکتوبر 2021

جموں و کشمیر

اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی

جموں کشمیر: 25 ستمبر 2021 کو انجمن فروغ اردو جموں و کشمیر کے صدر دفتر واقع ہولی ہوم اسکول چرار شریف، بڈگام بہ اشتراک پرائیویٹ اسکولز ایسوی ایشن جموں و کشمیر کی طرف سے دو روزہ ورکشاپ بعنوان 'اردو اساتذہ کی صلاحیت سازی' کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اس ورکشاپ میں ابتدائی سطح پر اردو درس وتدریس سے وابستہ اساتذہ نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت انجمن اردو کے روح رواں میر علی محمد شیدا نے کی۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد (ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان) بحیثیت مہمان ذی وقار اور صدر پروگرام کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ شیخ عقیل کے علاوہ میر علی محمد شیدا (سرپرست اعلی، انجمن فروغ اردو جموں وکشمیر)، ڈاکٹر الطاف انجم (نائب صدر)، ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری (نائب صدر انجمن، ضلع بڈگام)، ڈاکٹر محمد اعجاز اشرف (علاقائی ناظم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) اور جناب غلام نبی شاکر (سکریٹری پرائیویٹ اسکول جموں وکشمیر) کے علاوہ ضلع کے متعدد اساتذہ نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

اس ورکشاپ کی نظامت کے فرائض جناب عارف حسین نے انجام دیے۔ میر علی محمد شیدا نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر الطاف انجم نے انجمن کے اغراض و مقاصد سے متعلق شرکائے پروگرام کو روشناس کرایا۔ ڈاکٹر محمد اعجاز اشرف نے اپنے تاثراتی کلمات پیش کرکے انجمن کے منتظمین اور ارکان کو اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد پر مبارک باد پیش کی۔ غلام نبی شاکر نے اپنے تاثراتی کلمات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اس نوع کے پروگراموں کی موجودہ دور میں کس قدر اہمیت و معنویت ہے۔ پروفیسر شیخ محمد عقیل نے صدارتی خطبہ میں سماج میں ایک استاد کی حیثیت، اس کے فرائض اور ذمہ داریوں کے علاوہ اردو زبان وادب کو سائنسی وتکنیکی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ترقی کا انحصار اس بات پر قرار دیا کہ اسے بچوں کی صلاحیتوں، دلچسپیوں اور وقتی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس کے علاوہ انھوں نے انجمن کو ہر طرح کا ممکنہ تعاون فراہم کرنے کی یقین دہانی بھی کروائی۔ صدارتی خطبے کے بعد ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری نے تمام مہمانان اور دوسرے شرکائے پروگرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نشست کے اختتام کا اعلان کیا۔

اس دوروزہ ورکشاپ کے پہلے دن کی دوسری نشست (تکنیکی نشست) میں وادی کے باصلاحیت اور ماہر مقررین نے اردو زبان وادب کی تعلیم وتدریس، تحریرو تقریر اور اردو کی تدریس کے بنیادی اغراض ومقاصد کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تکنیکی نشست کی نظامت کے فرائض توصیف احمد ڈار نے انجام دیے۔ محترمہ مطہرہ حنیف نے 'اردو زبان کی مہارتیں' کے موضوع سے متعلق جامع اور پر اثر انداز میں گفتگو پیش کی۔ انھوں نے اساتذہ سے اپنا معیار بلند کرنے کی تلقین کی۔ آخر میں ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری نے 'اردو تدریس کے مقاصد' کے حوالے سے نہایت سادہ مگر موثر انداز میں روشنی ڈالی۔

پریس ریلیز: ظہور احمد گنائی، جموں وکشمیر، 25 ستمبر 2021

مہاراشٹر

میر اور میریات

اودگیر: شعبۂ اردو اور IQAC مہاراشٹرا اودے گیری کالج اودگیر (مہاراشٹرا) کے زیرِ اہتمام 30 اگست کو اردو کے عظیم شاعر میر تقی میر پر ایک روزہ قومی ویبینار بعنوان 'میر اور میریات' منعقد ہوا۔ پروفیسر توقیر احمد خاں سابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی اور پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین (جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) نے کلیدی خطبہ دیا۔ پروفیسر آر آر تمبولی (پرنسپل) نے استقبالیہ تقریر کی۔ بسوراج پاٹل ناگرالکر (صدر مہاراشٹرا ایجوکیشن سوسائٹی) نے اس ویبینار کے انعقاد پر شعبۂ اردو کو مبارکباد دی اور اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ پروفیسر حامد اشرف صدر شعبۂ اردو نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے کلیدی خطبے میں فرمایا '' ہم میر کو صرف غزل کے دائرے میں محدود کرتے ہیں اور ان کی شاعری کو ایک مخصوص عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں جب کہ میر نے کئی مثنویاں، مراثی، رباعیات مخمسات بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نثر پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے اپنے صدارتی خطاب میں خواجہ اکرام الدین کے خطبے کے نکات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میر تقی میر کی شاعری کے کئی پہلو ابھی نظروں سے اوجھل ہیں۔ میر کی مکمل تفہیم کے لیے ایسے ویبیناروں یا سیمیناروں کا سلسلہ شروع کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ویبینار کے منتظمین نے 'میر اور میریات' جیسے نہایت وسیع موضوع کا انتخاب کر کے اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد چار تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر حدیث انصاری (موہن لال سکھڈیا یونیورسٹی اودے پور) نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر راشد عزیز، ڈاکٹر محمد الحق، ڈاکٹر سید معین الدین حسینی، ڈاکٹر محبوب ثاقب اور ڈاکٹر نصرت فاطمہ نے مقالے پڑھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر راشد عزیز (سینٹرل یونیورسٹی کشمیر) نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سید فیروز علی، جاوید حسن، ڈاکٹر محمد سمیع الدین، ظفر الاسلام، ڈاکٹر فیضان حیدر، ڈاکٹر عذرا شیرین نے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محبوب ثاقب (شیواجی کالج اودگیر) نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر طاہرہ پروین، ڈاکٹر خالدہ بیگم، خیر الدین اعظم، صبیحہ خاتون، ڈاکٹر اختر سلطانہ نے مقالہ خوانی کی۔ چوتھا اجلاس ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ شکیل (سیوا سدن کالج برہان پور) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں ڈاکٹر خدیجہ تسنیم، فریدہ بیگم، ڈاکٹر مشتاق گنائی، ڈاکٹر سیدہ حبیب النسا، ڈاکٹر عائشہ پٹھان نے مقالے پیش کیے۔ مختلف ریاستوں سے شریک ان بیس مقالہ نگاروں نے میر تقی میر کی غزل گوئی، مرثیہ نگاری، مثنوی نگاری، میر کی فارسی شاعری، میر کی نثر نگاری، میر کی شخصیت، فن اور زندگی، میر کا مزاج، میر کی استادی، میر کی شاعرانہ عظمت، میر کا تصورِ عشق، نقدِ کلامِ میر جیسے متنوع موضوعات پر مقالے پیش کیے۔ پروفیسر عبدالرب نے اختتامی اجلاس کی صدارت کی۔ انھوں نے پانچوں اجلاسوں کا جامع انداز میں جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ اس ویبینار میں میر کی شاعری، نثر نگاری، نقدِ میر، میر کی زندگی، شخصیت، فن اور ان کے افکار و تصورات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انھوں نے تمام مقالہ نگاروں کو بھی مبارک باد دی۔ پروفیسر مقبول احمد مقبول نے نظامت کی اور شیخ انجم روحین کے شکریے پر اس ویبینار کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: پروفیسر مقبول احمد مقبول، شعبۂ اردو مہاراشٹرا اودے گیری کالج اودگیر (مہاراشٹرا) 3 ستمبر 2021

اعزاز و اکرام

عبدالرزاق گرناہ کو نوبل انعام برائے ادب

اسٹاک ہوم: تنزانیہ کے مشہور ناول نگار عبدالرزاق گرناہ کو 2021 کا نوبل انعام برائے ادب دیا جائے گا۔ گرناہ نے اپنے ناولوں میں استعماریت کے اثرات اور مہاجرین پناہ گزینوں

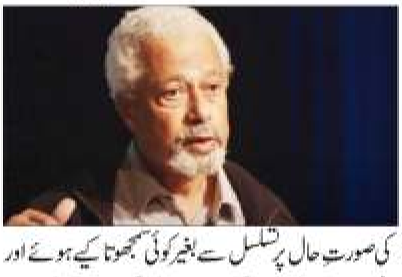

کی صورتِ حال پر تسلسل سے بغیر کوئی سمجھوتا کیے ہوئے اور جوش و جذبے کے ساتھ لکھا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ نوبل ایوارڈ برائے ادب اب تک 118 لوگوں کو مل چکا ہے جن میں 16 خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ ایوارڈ ایک گولڈ میڈل اور دس ملین سوئڈش کراؤنز (1.14 ملین امریکی ڈالر) پر مشتمل ہوتا ہے۔

73 سالہ ناول نگار گرناہ کی پیدائش 20 دسمبر 1948 میں افریقہ کے مشرقی ملک تنزانیہ کے زنجبار میں ہوئی، 1960 کی دہائی کے اواخر میں وہ بطور پناہ گزیں مہاجر برطانیہ آ گئے اور انھوں نے کرائسٹ چرچ کالج کینٹر بری سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے یونیورسٹی آف کینٹ سے Criteria in the Criticism of West African Fiction کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ یونیورسٹی آف کینٹ میں وہ انگلش اور پوسٹ کولونیل لٹریچر کے پروفیسر رہے۔ ان کے تقریباً دس ناول اور بہت سے افسانے، تنقیدی مضامین اور نان فکشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے اہم ناولوں میں

Memory of Departure (1987) , Pilgrims Way (1988) , Dottie (1990) , Paradise (1994) , Admiring Silence (1996) , By the Sea (2001) , Desertion (2005) , The Last Gift (2011) , Gravel Heart (2017) , Afterlives (2020)

شامل ہیں۔ ان میں سے Memory of Departure کا ترجمہ 'بادِ مفارقت' کے عنوان سے مشہور مترجم سید سعید نقوی نے کیا ہے۔ 1994 میں شائع ہونے والے ان کے ناول 'Paradise' کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے بکر پرائز اور وٹ بریڈ پرائز کے لیے شارٹ لسٹ کیا گیا تھا۔ نوبل کمیٹی کے چیئرمین برائے ادب اینڈرس اولسن نے انھیں مابعد استعمار عہد کا ممتاز ادیب و تخلیق کار قرار دیا ہے۔ یہ ایوارڈ عبدالرزاق کو 10 دسمبر کو تقسیم ایوارڈ تقریب میں تفویض کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ایک عرصے بعد کسی افریقی النسل ادیب کو یہ ایوارڈ دیا گیا ہے، ان سے پہلے افریقی النسل تخلیق کار وول سوئنکا کو 1986 میں نوبل ایوارڈ دیا گیا تھا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام اور دیگر ذرائع، 7 اکتوبر 2021

حسین الحق

نئی دہلی: اردو کے ممتاز فکشن نگار پروفیسر حسین الحق کو ان کے ناول 'اماوس میں خواب' کے لیے ساہتیہ اکادمی کا پروقار ادبی ایوارڈ 2020 سے سرفراز کیا گیا۔ دہلی کے کمانی آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں 24 ہندستانی

زبانوں کے ادیبوں کو اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار نے انعام سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ طلائی تمغہ اور

ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔ ساہتیہ اکادمی کا یہ ادبی ایوارڈ ہر سال حکومت ہند کے ذریعہ تسلیم شدہ 24 ہندستانی زبانوں میں بہترین تخلیق کے لیے دیا جاتا ہے۔

تقریب کی صدارت کرتے ہوئے اکادمی کے صدر چندر شیکھر کمبار نے کہا کہ جب یہ ایوارڈ دیا جا رہا ہے تو ہم سب ہر زبان کے بہترین تصنیف کاروں کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ ہندستان کی کثیرلسانی اور کثیر ثقافتی ہنرمندی کا نمونہ ہے۔ یہ سبھی ادیب اپنی اپنی زبانوں کے گوہر ہیں جو اپنی مقامی اور عالمی منظرنامے کو ہمارے سامنے اپنی تخلیق کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ اس موقع پر مہمانِ خصوصی اکادمی کے سابق صدر اور فیلو پروفیسر وشوناتھ پرساد تیواری نے کہا ہے کہ قدرت میں ہمیں سب کچھ نوازا ہے اس میں سے ایک حسیت جو ہمیں خود کو دوسروں سے جوڑتا ہے۔ ادیبوں کو دوسروں سے جڑ کر ان کے دکھ سکھ کی کیفیت کو اپنے تصانیف میں پیش کرنا ہوتا ہے جو ایشور کی بے پناہ دین ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب پوری دنیا تشدد سے دوچار ہو رہی ہے تب ادیب عدم تشدد کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر اکادمی کے نائب صدر مادھو کوشک نے سبھی ایوارڈ یافتگان، ان کے چاہنے والوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ ایوارڈ ایسے ادیبوں کا ہے جو عام انسان کے دکھ درد کو اپنا درد مانتی ہے۔

پریس ریلیز: محمد موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، 18 ستمبر 2021

صبیحہ انور

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہوئی جس میں 24 ہندستانی زبانوں کے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ

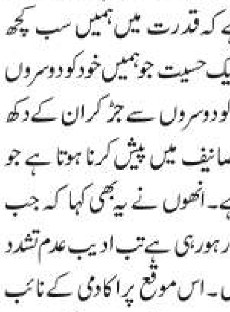

2020 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں ترجمہ کے لیے ممتاز مترجم صبیحہ انور کو ان کے بہترین ترجمہ 'فدائے لکھنؤ' کے لیے منتخب کیا گیا جو پروین طلحہ کی انگریزی افسانوی مجموعہ "Fida-e Lucknow : Tales of the city and its people" کا انگریزی سے اردو ترجمہ ہے۔ صبیحہ انور کی تراجم کے علاوہ دو تنقیدی کتابیں، دو افسانوی مجموعے اور ایک سفرنامہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آج رویندر بھون، نئی دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر چندر شیکھر کمبار کی صدارت میں ایگزیکیٹو بورڈ نے 24 ہندستانی زبانوں کے لیے ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2020 کو منظوری دی۔

اردو ایوارڈ کا فیصلہ جیوری کی میٹنگ میں ہوا جس کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر شین کاف نظام نے کی اور جیوری ممبران میں پروفیسر شافع قدوائی، ڈاکٹر احمد صغیر اور ڈاکٹر راجیش ریڈی شامل تھے۔

ساہتیہ اکادمی ہر سال 24 زبانوں کے مترجمین کو ایوارڈ کے لیے منتخب کرتی ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے نقد اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ اس سال کے ایوارڈ کے لیے 1 جنوری 2014 سے 31 دسمبر 2018 کے دوران شائع تراجم زیرغور آئیں۔ یہ انعامات سال رواں کے دوران ساہتیہ اکادمی کی ایک پُر وقار تقریب میں دیے جائیں گے۔

پریس ریلیز: محمد موسیٰ رضا، ساہتیہ اکادمی، 18 ستمبر 2021

ملی کونسل سولاپور کی جانب سے مثالی ٹیچر ایوارڈ تقسیم

مثالی ٹیچر ایوارڈ

سولاپور: ملی کونسل، سولاپور کی جانب سے یوم اساتذہ کے موقع پر قابل اساتذہ کو دیانند کالج کے پرنسپل ڈاکٹر وجئے کمار ابالے کے ہاتھوں سے اور مفتی سید امجد علی قاضی، صدر ملی کونسل سولاپور کی صدارت میں سوشل کالج کے ڈاکٹر محمد شفیع چوبدار، B.Q.K گرلز جونیئر کالج کی کوشلیا دیشمکھ، سرسید احمد خان جونیر کالج کی مسرت شیخ، کوچن ہائی سکول کے شرینواس چیئرمین اور میونسپل بوائز اسکول نمبر1 کے شفیق احمد خان کو آئیڈیل ٹیچر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ملی کونسل کے نائب صدر فیض انعامدار نے یوم اساتذہ کی اہمیت بتائی اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ مہاراشٹر ملی کونسل کے جنرل سکریٹری نظام الدین شیخ صاحب نے ملی کونسل کے اغراض و مقاصد اور اس کی کارگزاریوں کے بارے میں تفصیلی معلومات دیں۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر وجئے کمار ابالے نے کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں اگر اساتذہ ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے طلبا کے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کریں تو ہندوستان حقیقی ترقی کرے گا۔ اپنے صدارتی خطاب میں مفتی امجد علی قاضی صاحب نے کہا کہ انسان چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وہ استاد کے سامنے شاگرد کے طور پر ہی جانا جاتا ہے۔ اگر تعلیم کو نتیجہ خیز بنانا ہے تو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ضروری ہے۔ اس موقعے پر خادمانِ اردو فورم کے صدر وقار احمد شیخ، پرنسپل سینہ انگڑگی، ارجمند اویسیکر، صبیحہ پیرزادہ، رفیق خان، امتیاز شیخ، نذیر منشی، محمود نواز، اقبال باغبان، ڈاکٹر اتنورکر اور اساتذہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔

پریس ریلیز: باغبان محمد اقبال، سولاپور، مہاراشٹر، 9 ستمبر 2021

ڈاکٹر انور سعید

دیوبند: جامعہ طبیہ دیوبند کے سکریٹری ڈاکٹر انور سعید کو آیوش انٹرنیشنل میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے ان کی طبی خدمات کے اعتراف میں مشہور و معروف بین الاقوامی آیوش رتن ایوارڈ 2021 سے نوازا گیا ہے۔ آیوش انٹرنیشنل میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے اس سال مختلف طبی حلقوں میں کام کرنے کے لیے جن لوگوں کو ایوارڈ سے نوازا گیا ہے ان میں ڈاکٹر انور سعید (ممبر بورڈ آف انڈین میڈیسن اور سابق ممبر سی سی آئی ایم)، ڈاکٹر بدرالدجی خاں، ڈاکٹر سلمان (فہمینا ہاسپٹل لکھنؤ)، ڈاکٹر شکیل بدایونی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شمالی ہند اور خصوصاً مغربی اترپردیش میں ڈاکٹر انور سعید کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، طبی تعلیم کا معاملہ ہو یا طبی طریقہ علاج کی ترویج و ترقی کا میدان ہو، ڈاکٹر انور سعید ہمیشہ ہر جگہ رہنمایانہ شان کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں، اپنی زندگی کے گذشتہ تقریباً تیس سال انھوں نے طب یونانی کی بیش بہا خدمات میں صرف کیے ہیں۔ اسی ضمن میں سنٹرل کاؤنسل آف انڈین میڈیسن کی رکنیت سے لے کر بورڈ آف انڈین میڈیسن کی رکنیت چیئرمین شپ ہو یا طبی تنظیموں اور اداروں کی سربراہی ہو وہ ہمیشہ خلوص دل اور نیک نیتی سے طب یونانی کے فروغ کے لیے مسلسل آواز بھی اٹھاتے رہے ہیں اور عملی کام بھی کرتے رہے ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 28 ستمبر 2021

پسپیت مکھرجی

کلکتہ: ایک سال قبل ہی ترجمہ ادب کے لیے بنگلہ اکادمی ایوارڈ سے سرفراز ہونے والے پسپیت مکھرجی کو بنگالی زبان میں غالب کے خطوط کا ترجمہ کرنے پر ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ دینے کا اعلان کیا۔ ساہتیہ اکادمی نے انھیں غالب کے خطوط کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کرنے پر غالب ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔ سیوری کے رہنے والے پسپیت مکھرجی نے گزشتہ چالیس سالوں سے اردو ادب کے مترجم کے طور پر اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ پسپیت مکھرجی نے تقریباً ڈھائی سو اردو کہانیوں کا بنگالی میں ترجمہ کیا ہے۔ پشپیت مکھرجی نے نہ صرف اردو کتابوں کا ترجمہ کیا ہے بلکہ غزلیں اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب اور سعادت حسن منٹو پر کئی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ بنگلہ زبان میں غالب کو متعارف کرانے پر انھیں بنگال کا غالب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے غالب کے 31 خطوط کا ترجمہ کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے منتخب ہونے پر انھوں نے کہا کہ محنت کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لیے یہ ایوارڈ ملنا خوشی کی بات ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے باوجود انھوں نے اپنی کوششوں سے اردو میں مہارت حاصل کی۔ انھوں نے بنگال کے لوگوں میں اردو زبان کی مٹھاس پھیلانے کے لیے انتھک محنت کی ہے۔ پسپیت مکھرجی کی ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد تقریباً 20 ہے۔ اس کے علاوہ، انھوں نے مزید 20 کتابیں شائع کی ہیں جن میں اصل مضامین اور کہانیوں کے مجموعے شامل ہیں۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 20 ستمبر 2021

راج بھاشا ایوارڈ

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو مرکزی حکومت کی ٹاؤن آفیشیل لینگویج عمل آوری کمیٹی (سی او ایل آئی سی) (سنٹرل گورنمنٹ آفس 1)، حیدرآباد کی جانب سے قومی زبان ہندی کے فروغ اور استعمال پر تیسرا انعام دیا گیا۔ 30 ستمبر کو نیشنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف ڈرمٹالوجی اینڈ یونانی میڈیسن، حیدرآباد میں منعقدہ اجلاس میں جناب کے پی شرما، ڈپٹی ڈائرکٹر ساؤتھ زون آفس، بنگلور، محکمہ سرکاری زبان، وزارت داخلہ، حکومت ہند نے یونیورسٹی کو ایوارڈ عطا کیا جسے یونیورسٹی کی ہندی آفیسر ڈاکٹر شگفتہ پروین نے حاصل کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر شگفتہ پروین نے ہندی سیل کے اسٹاف کے ہمراہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن سے ملاقات کی۔ پروفیسر عین الحسن اور پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ، پرووائس چانسلر نے اس کامیابی پر یونیورسٹی کے ہندی سیل کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر صدیقی محمد محمود، رجسٹرار انچارج نے اس ایوارڈ کو مانو کے لیے اعزاز قرار دیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2 اکتوبر 2021

پروفیسر مجیب الرحمٰن

نئی دھلی: سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز کے سابق چیئر پرسن اور متحدہ عرب امارات کے عربی روزنامہ 'الرویۃ' کے مستقل کالم نگار پروفیسر مجیب الرحمٰن کو عربی ادبیات میں ان کی غیر معمولی خدمات کے اعتراف میں مجلّہ 'النہضہ' کیرالہ نے 'نیشنل اکسیلینس ایوارڈ' سے سرفراز کیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل ہی پروفیسر موصوف کو صدر جمہوریہ 'مہارشی بدرائن ویاس سمان' سے نوازا جاچکا ہے۔ آپ کے اشہب قلم سے درجنوں تصانیف منظر عام پر آکر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں، ان میں حال ہی میں قرۃ العین حیدر کے معرکۃ الآرا ناول 'آگ کا دریا' کا عربی ترجمہ 'نہر النار' بطور خاص قابل ذکر ہے۔ آپ پچاس ریسرچ پیپر کے علاوہ سو سے زائد صحافتی مضامین سپرد قرطاس کر چکے ہیں جو 'الحیاۃ' عربی روزنامہ اور متحدہ عرب امارات کے عربی روزنامہ 'الرویۃ' میں شائع ہو چکے ہیں۔ لندن میں واقع عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن کے دہلی چیپٹر کے صدر ہیں۔ آپ کی علمی فتوحات کا سلسلہ جاری ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اکتوبر 2021

رسم اجرا

موسیٰ کلیم: شخص اور شاعر

سیوان: شہر کے احمد جمال پاشا نگر میں شری سائیں اسپتال کے کانفرنس ہال میں جمہوریت پسند مصنفین کا دسواں اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت معروف شاعر قمر سیوانی نے کی۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر بہار جلیس کے سکریٹری جناب ونیتا بھ جی نے شرکت کی۔ اجلاس کی ابتدا سے قبل مہلک بیماری کورونا کی زد میں آکر راہیِ ملکِ عدم ہوئے، قلم کاروں کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ادب کی موجودہ صورت حال پر ڈاکٹر اُپیندر یادو، جُگل کشور دوبے، ڈاکٹر ارشاد احمد، علی امام روشن اور ارون کمار سنگھ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارشاد احمد کی کتاب موسیٰ کلیم: شخص اور شاعری کا اجرا قمر سیوانی اور ونیتا بھ نے اجتماعی طور پر کیا۔ ڈاکٹر ارشاد احمد نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ موسیٰ کلیم جامع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے اردو، ہندی اور بھوجپوری تینوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔ آپ نے تقریباً چالیس ڈرامے اور درجنوں کہانیاں لکھی ہیں۔ آپ کے متعدد ڈراموں کو چھپرہ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کے بڑے بھائی بابو مہندر پرشاد نے اسٹیج کرایا۔ آپ نے ہندی فلموں کے ڈائیلاگ اور کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ آپ کو بیسٹ اسٹوری رائٹر کا انعام بھی ملا۔ ہمالیہ کی گود میں، ہریالی اور راستہ، بن پھول اور باپو نے کہا تھا، جیسی کامیاب فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے ایک ترانہ لکھا جو چھپرہ کے قدیم اسکول برج کشور کنڈر گارٹن کے طلبہ صبح صبح گاتے ہیں۔ موسیٰ کلیم نے بابو مہندر پرشاد کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ایک قصیدہ لکھا تھا؟ ہر سال جشن یوم مہندر کی ابتدا اسی قصیدے سے ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مذکورہ بالا ساری باتوں کی تفصیل موجود ہے۔ آپ کی ایک سو ایک غزلوں کا انتخاب بھی شامل کتاب ہے۔ ڈاکٹر کے۔ احتشام، ڈاکٹر التفات امجدی، علی امام روشن کے علاوہ تمام شرکا نے ڈاکٹر ارشاد احمد کی اس تحقیقی کاوش پر مبارکباد دی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد، سیوان بہار، 1 ستمبر 2021

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی سات کتابوں کا اجرا

دیوبند: محمود ہال میں مشہور ادیب و شہ سوارِ قلم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی سات نئی کتابوں کا اجرا موقر علما و دانشوران کے ہاتھوں عمل میں آیا، جن کتابوں کا اجرا عمل میں آیا ان میں سیرت آقائے نامدار واقعات کے آئینے

میں، امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری: زندگی کے چند روشن اوراق، رئیس القلم مولانا سید ازہر شاہ قیصر: زندگی کے چند روشن اوراق، فخر المحد ثین مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری: زندگی کے چند روشن اوراق، علمائے دیوبند کا اختصاصی پہلو، وہ قومیں جن پر عذاب آیا، کیا ہوئے یہ لوگ شامل ہیں۔ پروگرام کی صدارت دارالعلوم دوقف دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی نے کی۔ مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کی یہ تقریب اردو ادب کے لیے ایک بڑا دن ہے۔ گیسوئے اردو کو سنوارنے کے لیے اخیر کے پچاس برسوں میں جو چند بڑے مشاطہ اٹھے، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر ان میں سے ایک ہیں۔ وہ پچھلے پچاس برسوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور دامن ادب کو فقید المثال جواہر و لآلی سے بھرتے جا رہے ہیں۔ خاکہ نگاری پر وہ اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن دوسرے موضوعات پر بھی قلم برداشتہ لکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ معروف عالم دین اور ماہنامہ ترجمان کے مدیر اعلیٰ مولانا ندیم الواجدی نے کہا کہ میں مولانا نسیم اختر شاہ قیصر سے کم و بیش 50 سال سے واقف ہوں، ان سے میرے مراسم بڑے گہرے ہیں۔ جہاں تک ان کی قلمی کاوشوں کی بات ہے تو اس کا شاید ہی کوئی منکر ہوگا کہ وہ اس وقت اردو دنیا میں انمٹ نقوش چھوڑنے کے حوالے سے ایک شناخت رکھتے ہیں۔ رکن رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ قاری ابوالحسن اعظمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ لکھنا اور مسلسل لکھنا یہ اللہ کا فضل ہے، پھر لکھنے میں زبان و بیان کی شوکت، فکر و خیال کی رفعت، اسلوب ادا کی جاذبیت کا فن بھی پوری توانائی کے ساتھ شامل ہو یہ کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے اس دور میں اس فن کا بڑا حصہ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کو ملا ہے۔ مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے آنے والے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ احقر کی حقیر سی دعوت پر آپ کی تشریف آوری میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ مقررین نے میرے سلسلے میں جو کچھ بھی کہا ہے، ان کا حسن ظن ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسن ظن پر اتار دے۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں سامعین موجود رہے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 12 اکتوبر 2021

یوتھ پاور ان انڈیا

نئی دہلی: دہلی کی معروف سماجی تنظیم الحکمہ فاؤنڈیشن کے ذریعے مرتب کردہ ایک بہت ہی اہم کتاب یوتھ ان انڈیا: اپارچنٹی اینڈ چیلنجز (Youth Power in India: Opportunities and Challenges) کا اجرا پشوپتی کمار پارس مرکزی وزیر برائے فوڈ پروسیسنگ انڈسٹریز، گورنمنٹ آف انڈیا، نئی دہلی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کتاب میں مختلف یونیورسٹیز سے وابستہ پروفیسرز، محققین اور سماجی زندگی سے جڑے 20 دانشوروں کے مقالے پیش ہیں۔ کتاب کے بارے میں کتاب کے ایڈیٹر ڈاکٹر دلیپ کمار سینئر ایگزیکٹو، پروجیکٹس، این سی اے ای آر اور الحکمہ فاؤنڈیشن کے ایگزیکٹو ممبر نے بتایا کہ اس کتاب میں ملک کی اقتصادی ترقی کی موجودہ صورت حال، ترقی میں حائل مشکلات اور ان کا حل بھی پیش کیا گیا ہے نیز نوجوانوں کے مسائل جیسے بے روزگاری، نشہ خوری، جرائم، آرام طلبی اور خواتین کے استحصال وغیرہ کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی طرف گورنمنٹ اور دوسرے اداروں کی طرف سے شائع رپورٹس اور اعداد و شمار کی روشنی میں جائزہ اور مستقبل کا منظر نامہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد چیئرمین الحکمہ فاؤنڈیشن نے فاؤنڈیشن کے بارے میں جانکاری دی اور بتایا کہ فاؤنڈیشن تعلیم، صحت، اخلاقی قدروں، قیام امن اور عام فلاح و بہبود کے لیے 1990 سے لگاتار سرگرم عمل ہے۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے مرکزی وزیر پشوپتی کمار پارس نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ فاؤنڈیشن نے ایک اہم موضوع پر کتاب لاکر نوجوانوں کے متعدد مسائل اور ان کے حل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس موقعے پر اس کتاب کے دوسرے ایڈیٹر سید شعیب احمد بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر اے کے جھا، ڈاکٹر کیلاش مشرا اور ڈاکٹر ارون دتی نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی۔ اس موقعے پر فاؤنڈیشن کے سکریٹری ثاقب یاسین نے وزیر محترم کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 ستمبر 2021

1857 کی کرانتی اور اردو پترکاریتا

نئی دہلی: اردو صحافیوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں ناقابل فراموش قربانیاں دی ہیں اور اولین شہید صحافی مولوی محمد باقر ہندوستان کی آزادی کی جنگ کا جلی عنوان ہیں، جن کی قربانی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ ان خیالات کا اظہار پریس کلب آف انڈیا میں جنگ آزادی کے اولین شہید صحافی مولوی محمد باقر کے 164 ویں یوم شہادت کے موقعے پر سرکردہ صحافیوں نے کیا۔ اس موقعے پر سینئر اردو صحافی معصوم مراد آبادی کی اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857 پر ہندی کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس کتاب میں مولوی محمد باقر اور دیگر اردو صحافیوں کی قربانیوں کی ولولہ انگیز داستان بیان کی گئی ہے۔ سینئر ہندی صحافی اروند کمار سنگھ نے اس موقعے پر کہا کہ ملک کے نامور صحافی معصوم مراد آبادی نے 1857 کے انقلاب میں اردو صحافت کے کردار پر بہترین کتاب لکھ کر ہندوستان کے مورخین کو نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستان کے پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر پر خصوصی مواد پیش کیا ہے۔ بی بی سی کے سابق صحافی قربان علی نے کہا کہ مولوی محمد باقر نے 1857 کی جنگ آزادی میں قلم سے تلوار کا کام لیا اور ان کے 'دہلی اردو اخبار' نے آزادی کے متوالوں میں جوش و خروش پیدا کیا۔

معصوم مراد آبادی کی کتاب اس موضوع پر بہترین دستاویز کہی جا سکتی ہے۔ پریس کونسل آف انڈیا کے رکن جے شنکر گپتا نے اس موقعے پر کہا کہ ہم صحافیوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ایک اردو صحافی نے ملک کے لیے عظیم بلیدان دیا۔ ہم انھیں بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ نیوز اینکر اور سینئر صحافی ارملیش نے کہا کہ مولوی محمد باقر پہلی جنگ آزادی کے عظیم ہیرو ہیں اور ان پر دیگر زبانوں میں بھی کام ہونا چاہیے۔ معصوم مراد آبادی نے ہندی میں کتاب لکھ کر ہم سب کو راہ دکھائی ہے۔ دہلی یونین آف جرنلسٹس کے جنرل سکریٹری ایس کے پانڈے نے کہا کہ معصوم مراد آبادی کی کتاب انقلاب 1857 میں اردو صحافیوں کی قربانیوں کی ولولہ انگیز داستان ہے، جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

روز نامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 19 ستمبر 2021

سرسید احمد خان: ریزن، ریلجن اینڈ نیشن

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے پروفیسر ایم شافع قدوائی کی انگریزی کتاب 'سرسید احمد خان: ریزن، ریلجن اینڈ نیشن' کا اجرا عمل میں آیا جسے کلنگا ادبی ایوارڈ برائے اقلیت/خواتین/دلت وقبائلی ادب 2021 سے نوازا گیا ہے۔ روٹلیج سے شائع ہونے والی یہ کتاب سیاسیات، نوآبادیاتی مطالعات، تاریخ، اسلامی علوم، مذہبی علوم اور جنوب ایشیائی مطالعات کے شعبوں میں محققین کو رہنمائی کے لیے حقائق کی بازیافت کرنے والے تجزیے اور خیالات سے آگاہ کرتی ہے۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر منصور نے کہا کہ یہ کتاب اے ایم یو کے بانی سرسید احمد خان کی زندگی اور ہندوستان میں جمہوری شعور کے ارتقا میں ان کی گراں قدر خدمات کا نہایت جامع اور واضح انداز میں احاطہ کرتی ہے۔'' روزنامہ'انقلاب' دہلی، 17 ستمبر 2021

آئینۂ ادراک

مراد آباد: ریاست کے مراد آباد ایم ایچ ڈگری کالج کے آڈیٹوریم میں کلیان سمیتی کے زیر اہتمام سید محمد اشرف نازک سنبھلی کا مجموعۂ غزل 'آئینۂ ادراک' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ پروگرام کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے پروفیسر سید کلیم اصغر نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر محمد عابد حیدر اور اجرا بدست اتر پردیش اردو اکادمی کی سابق چیئرمین ترنم عقیل عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ترنم عقیل نے کہا کہ اردو ایک ادبی اور شائستہ زبان ہے۔ اردو میں کتابیں تو بہت لکھی جاتی ہیں لیکن اردو کی کتابوں کو پڑھنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ اردو کو فروغ دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اردو دانشوروں کے ذریعے اردو بیداری پروگرام چلائے جائیں۔ روزنامہ'صحافت' دہلی، 16 ستمبر 2021

منتخب انگریزی گرامر اور منتخب انگریزی لغات

دیوبند: دیوبند کے محلّہ خانقاہ میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش لینگویج کے زیر اہتمام نامور قلمکار خورشید انور قاسمی کی دو اہم کتابوں 'منتخب انگریزی گرامر' اور 'منتخب انگریزی لغات' کا اجرا علما کے بدست عمل میں آیا۔ تقریب میں جامعہ قاسمیہ دارالتعلیم والصنعہ دیوبند کے مہتمم مولانا ابراہیم قاسمی، معروف روحانی معالج الحاج شاہ عالم قاسمی اور مولانا انیس الرحمٰن قاسمی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی، پروگرام کی صدارت مولانا شاہ عالم گورکھپوری نے

غوث خان کی کتاب 'آئینۂ زندگی' کا اجرا

اور نظامت کے فرائض انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر خورشید انور قاسمی نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی کلمات میں مولانا شاہ عالم گورکھپوری نے کہا کہ خورشید انور قاسمی کی دو اہم کتابوں 'منتخب انگریزی گرامر' اور 'منتخب انگریزی لغات' سے انگریزی زبان سیکھنے والوں کو بہت فائدہ پہنچے گا کیونکہ انگریزی پوری دنیا میں مواصلات کے لیے ضروری ہے۔ روزنامہ'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 ستمبر 2021

الماس (خصوصی نمبر)

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق استاذ حدیث، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے سابق ایڈیٹر، تیس سے زائد کتابوں کے مصنف مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قاسمی کی حیات وخدمات پر مشتمل ماہنامہ 'الماس' ممبئی کے خصوصی نمبر کی تقریب رسم اجرا مولانا اعظمی کے آبائی وطن کی جگدیش پور اعظم گڑھ میں منعقد ہوئی، نظامت کے فرائض الماس کے نائب مدیر مولانا حفظ الرحمٰن اعظمی نے انجام دیے، قاری اسعد اعظمی کی تلاوت سے تقریب کا آغاز ہوا، بارگاہ رسالت میں خراج تحسین مفتی شرف الدین اعظمی اور مولانا بلال قاسمی نے پیش کیا، مولانا عبدالرب قاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خدا کا فضل ہے کہ مولانا کے آبائی گاؤں جگدیش پور میں یہ علمی ادبی تقریب منعقد ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ فن حدیث واسماء رجال میں اس وقت بلا مبالغہ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اعظمی ایک منفرد مقام رکھتے تھے، تدریس میں ان کی عظمت کی گواہی دینے کے لیے ان کے ہزاروں تلامذہ ہیں، اردو ادب میں مولانا کا ایک بلند مقام تھا، مولانا وسیم شیروانی نے کہا کہ اعظم گڑھ کے سلسلے میں سہیل اعظمی نے جو کہا تھا ''اس خطہ اعظم گڑھ پہ مگر فیضان تجلی ہو یکسر جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیر تاباں ہوتا ہے'' مولانا نے اپنی بے تکان محنتوں اور علمی تحقیقات کے ذریعے صادق کر دکھایا اور چھوٹوں کو یہ بتا دیا کہ کچھ پانا چاہتے ہو تو منزلیں بڑھ کر تمہارا استقبال کرنے کے لیے تیار ہیں، معروف قلمکار مولانا ضیاء الحق خیرآبادی نے خصوصی نمبر پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ مفتی شرف الدین اعظمی، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا خورشید اعظمی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ محض تین لوگوں کی جہد مسلسل سے یہ اہم کارنامہ منظر عام پر آیا۔ مدیر الماس مفتی شرف الدین عظیم قاسمی نے تمام مہمانان کرام کا استقبال اور شکریہ ادا کیا۔ صدر تقریب مولانا عبدالرشید مظاہری صاحب کے صدارتی کلمات اور دعا کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ واضح ہو کہ اس تقریب میں مولانا پر خصوصی نمبر کے علاوہ مفتی عبیداللہ شمیم صاحب کی تصنیف 'دیار مشرق کے درخشندہ ستارے'، مفتی شرف الدین صاحب کی تصنیف 'تنویر مہ و نجم' اور ماہنامہ 'الماس' اگست کے شمارے کا بھی اجرا ہوا۔ روزنامہ'میرا وطن' دہلی، 11 ستمبر 2021

آئینۂ زندگی

کڈپہ: 26 ستمبر 2021 بروز اتوار شاہی دربار بینکٹ ہال، کڈپہ میں کاروان اردو کی جانب سے ایک بزم سجائی گئی، جس میں جناب غوث خان کی پانچویں تصنیف آئینۂ زندگی کا اجرا عمل میں آیا، اس تقریب کی صدارت جناب حسینی باشاہ شہمیری نے کی مہمانان خصوصی کی حیثیت سے جناب ایس کے نصیرالدین، جناب سعید خان سعید اور مہمانان اعزازی ڈاکٹر ستار ساحر، ڈاکٹر محی الدین امجد رہے۔ نظامت کے فرائض سردار ساحل نے ادا کیے، ان تمام حضرات نے غوث خان اور ان کی کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ستار ساحر نے اہل کڈپہ اور اردو ادب کی خدمت کے حوالے سے بہت سی باتیں کہیں اور سامعین کے علم میں اضافہ کیا اس کے بعد رسم اجرا کی کارروائی انجام دی گئی۔ پریس ریلیز: ظہیر دانش، کڈپہ، 28 ستمبر 2021

بلغ میاں انصاری کی انوکھی کہانی

رانچی: انجمن بقائے ادب رانچی کے انجمن اسلامیہ رحمانیہ مسافر خانہ کے ہال میں چھتیس گڑھ کے سابق ڈائرکٹر جنرل آف پولیس محمد وزیر انصاری کی کتاب 'بلغ میاں انصاری کی انوکھی کہانی' کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت اور نظامت انجمن کے جنرل سکریٹری ناصر افسر نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر مولانا آزاد کالج کے سابق پرنسپل محمد شمس الحق نے شرکت کی۔ کتاب کے

مصنف محمد وزیر انصاری نے اپنے خطاب میں بتایا کہ بطخ میاں انصاری نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی زندگی بچائی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ملک کی آزادی سے پہلے، چمپارن تحریک کے دوران، برطانوی افسر اروِن نے گاندھی جی کے قتل کا مکمل منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کے تحت، گاندھی جی کو کھانے کی دعوت دے کر اور ان کے کھانے میں زہر ملا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کرنا تھا۔ برطانوی افسر نے اپنے باورچی بطخ میاں کو گاندھی کے دودھ میں زہر دینے کو کہا تھا۔ اگر بطخ میاں اروِن کے ارادے سے اتفاق کر لیتے تو آج ہمارے ملک کی تاریخ کیا ہوتی؟ انھوں نے کہا کہ بھارت میں گاندھی جی کو قتل کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جو کہ بطخ میاں کے ذریعے ناکام ہوئی۔ اس کے لیے بطخ میاں کو جیل بھی جانا پڑا۔ بعد میں بطخ میاں کو چھوڑ دیا گیا، لیکن آج سو سال بعد بھی ان کا خاندان غربت کی زندگی گزار رہا ہے۔ آج یہ سب یاد دلانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی بار بطخ میاں پر مضامین کی ایک تالیف، 'بطخ میاں انصاری کی انوکھی کہانی' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ امرت مہوتسو کے اس سال میں، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس طرح کے گمنام ہیروز کو سامنے لایا جائے۔ دیگر مقررین میں منظور احمد انصاری، رام ناتھ سنگھ، ڈاکٹر احمد سجاد، محمد قاسم انصاری، کامیشور پرساد سریواستو وغیرہ شامل تھے۔ انجمن کی نائب صدر ڈاکٹر سریندر کور نیلم نے اظہار تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 23 ستمبر 2021

تبرک

سیتاپور: نعت گوئی ایک مشکل صنف سخن ہونے کے ساتھ ہی بہت ہی اہمیت اور فضیلت بھرا فن ہے۔ ہر انسان کے مقدر میں نعت گوئی کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ ایک غزل گو کے لیے نعت کہنا اور زیادہ مشکل کام ہے لیکن اس مشکل کام کو آسان بنانے میں نمایاں کارکردگی انجام دی ہے محفوظ رحمانی نے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار یہاں بزم اردو سیتاپور کی جانب سے منعقدہ رسم اجرا کی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر مخمور کاکوروی نے کیا۔ احمد وصی نے کہا کہ محفوظ رحمانی کا نعتیہ مجموعہ 'تبرک' ان کی عقیدت کی عکاسی کرتا ہوا ایک بہترین شعری عمل ہے۔ بزم اردو سیتاپور کے صدر مست حفیظ رحمانی نے کہا کہ نعت گوئی فضل الٰہی ہے۔ محفوظ رحمانی کا نعتیہ مجموعہ ایسے وقت میں منظر عام پر آیا ہے۔ جب عالم اسلامی میں بے پرواہی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ایسے میں اس طرح کا کلام ہماری رہنمائی کرے گا۔ اس سے قبل بزم اردو سیتاپور اور دبستان اہل قلم کی جانب سے محفوظ رحمانی کو اعزاز دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 27 ستمبر 2021

نوید سحر

سولاپور: بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن سولاپور کے زیر اہتمام اور انجمن علم و ادب اور ساؤتھ ایشین کلچرل سوسائٹی آف شکاگو، اردو زبان فاؤنڈیشن بیڑ کے اشتراک سے ہاشمی نسرین سحر کے شعری مجموعے 'نوید سحر' کی آن لائن رسم رونمائی عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار و ادیب ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مشہور شاعرہ و ادیبہ غوثیہ سلطانہ نوری نے صدارت کی۔ بطور مہمان ریسرچ اسکالر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ عطاء اللہ بن داؤد مکی، صحافی و افسانہ نگار رعنا کوثر نیویارک، سلمیٰ صنم، ڈاکٹر عبدالوکیل ہاشمی شریک تھے۔ جناب عطاء اللہ مکی نے کہا کہ ہاشمی نسرین کی شاعری انسان کو رب عز و جل کی طرف متوجہ کراتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی نے موصوفہ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ ہاشمی نسرین سحر کی شاعری میں فکری پیغام شامل ہے وہ انسانیت کے لیے تحفہ ہے۔ اسے بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ صدر جلسہ و مشاعرہ غوثیہ سلطانہ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ ہاشمی نسرین کی غزلوں میں قاری کو تازگی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں عصری بصیرت ہے۔ اس موقعے پر مولانا انصار احمد مئو، ندیم مرزا بیڑ، سلیم انصاری جبل پور، ارشد صدیقی بیڑ، غلام ثاقب بیڑ نے نوید سحر پر تبصرے پیش کیے۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، سولاپور، 26 ستمبر 2021

ممکنات

جموں و کشمیر: انجمن فروغ اردو جموں و کشمیر کی مجلس منتظمہ کا ایک غیر معمولی اجلاس اس کے صدر دفتر واقع ہولی ہوم اسکول چرار شریف، بڈگام میں منعقد کیا گیا جس میں جموں و کشمیر میں اردو زبان کو درپیش مسائل پر سنجیدہ بحث کی گئی۔ شرکائے مجلس نے پُر زور انداز میں اسکولی سطح پر اُردو زبان کے تدریسی نظام کو درست کرنے کے لیے اس سے وابستہ اُردو اساتذہ کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو فروغ دینے پر اصرار کیا تا کہ ہماری نئی نسل دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں بھی مہارت حاصل کر سکے۔ اس نشست میں غلام نبی اوفر بحیثیت مہمانِ ذی وقار موجود رہے ان کے علاوہ انجمن کے سرپرستِ اعلیٰ میر علی محمد شیدا صدرِ مجلس کی حیثیت سے شامل رہے۔ ان کے علاوہ وادیٔ کشمیر کے طول و عرض سے تعلق رکھنے والے اساتذہ صاحبان، ریسرچ اسکالرس اور محبانِ اردو نے شرکت کر کے اس ادبی نشست کو وقار عطا کیا۔ اُن میں ڈاکٹر الطاف انجم (نظامتِ فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر کوثر رسول (شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر نصرت جبین (شعبۂ اُردو، سینٹرل یونیورسٹی کشمیر)، ڈاکٹر مشتاق حیدر (شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی)، ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری (محکمۂ اعلیٰ تعلیم حکومت جموں کشمیر)، ڈاکٹر شاہ فیصل (ڈگری کالج، عید گاہ سرینگر)، ڈاکٹر ریاض توحیدی (محکمہ اسکولی تعلیم حکومت جموں کشمیر)، ڈاکٹر فیض احمد فیاض (ڈگری کالج، ہندوارہ)، ڈاکٹر ظفر عبداللہ (شعبۂ اُردو، سنٹرل یونیورسٹی کشمیر)، محمد عارف (ہولی ہوم اسکول چرار شریف) کے علاوہ ریسرچ اسکالرز غلام نبی کمار، عرفان رشید ڈار، سجاد رشید ڈار، محمد شفیع بٹ، گلزار احمد ڈار اور ظہور احمد گنائی بھی شامل رہے۔

اس اجلاس کے دوسرے حصہ میں ڈاکٹر کوثر رسول صاحبہ کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب 'ممکنات' کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ یہ کتاب ڈاکٹر کوثر رسول صاحبہ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر مشتاق حیدر نے پُر مغز تبصرہ بھی پیش کیا گیا جسے سبھی حاضرینِ مجلس نے بہت پسند کیا۔ اس کتاب اور تبصرہ پر حاضرین نے مذاکرہ قائم کیا جس نے ایک صحت مند ادبی ماحول کی تشکیل کی۔ ڈاکٹر الطاف انجم نے نشست کے اختتام پر تمام شرکاء و سامعین کے ساتھ ساتھ مہمانوں، اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز اور منتظمین کا فرداً فرداً انجمن کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر، کشمیر یونیورسٹی، جموں و کشمیر، 29 اگست 2021

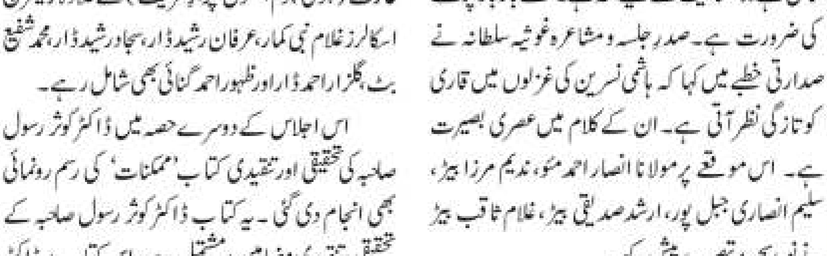

خراج عقیدت

حکیم عبدالحمید

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمید کے ایک سو تیرہویں یوم پیدائش کے موقعے پر غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر جی آر کنول نے کہا کہ غالب حکیم عبدالحمید کے پسندیدہ شاعر تھے، لیکن ان کی پوری زندگی اقبال سے متاثر نظر آتی ہے۔ وہ ہروقت باعمل رہتے تھے، ہروقت کچھ نیا کام کرنے کی فکر کرتے تھے۔ انھوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں ان کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انھیں پدم بھوشن اور ابن سینا ایوارڈ بھی ملا تھا، حکیم صاحب غریب پرور تھے۔ انھیں خدا کے بندوں سے پیار تھا۔ وہ یقیں محکم عمل پیہم والے انسان تھے۔ اس موقعے پر مشہور صحافی وویک شکلا نے حکیم عبدالحمید کی تعلیمی خدمات پر لیکچر دیا۔ انھوں نے اپنے لیکچر میں کہا کہ حکیم صاحب تعلیم کی روشنی پھیلاتے رہے۔ انھیں بیسویں صدی کی دہلی کی سب سے بلند شخصیت مانا جاسکتا ہے۔ وہ زندگی بھر تعلیمی ادارے کھولتے رہے تاکہ ملک اور سماج علم کی روشنی سے جگمگاتا رہے۔ انھوں نے پرانی دہلی میں رابعہ گرلس پبلک اسکول کھولا۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کی مثال تھے۔ ہر سال اپنے گھر پر عید ملن اور ہولی ملن کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب نے اردو کے فروغ کے لیے مرزا غالب کے مزار کے پاس غالب اکیڈمی قائم کی۔ اس موقعے پر سید محمد نظامی نے کہا کہ حکیم صاحب ولی تھے، بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، والدہ نے ان کی پرورش کی تھی۔ ان کی شخصیت شجر سایہ دار تھی۔ اس موقعے پر عقیل احمد نے کہا کہ حکیم صاحب گاندھی جی سے بہت متاثر تھے۔ وہ ہندوستانی یعنی آسان ہندی اور آسان اردو زبان کے حامی تھے۔ جلسے میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ حکیم عبدالحمید دہلی کے لجنڈ تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 ستمبر 2021

اکبرالہ آبادی

پریاگ راج: یہ سال اکبرالہ آبادی کی وفات کا 100 واں سال ہے، وہیں ان کی پیدائش کا 175 واں سال ہے۔ ایسے موقعے پر لسان العصر اکبرالہ آبادی کو یاد کرنا ضروری تھا۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری میں اپنے وقت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ ایسے وقت میں جب ملک میں انگریزں کا دور تھا اور پورا ملک ان کی گرفت میں تھا۔ ایسے میں اکبرالہ آبادی نے بے خوف ہوکر شاعری کے ذریعے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ہندوستانی اکیڈمی میں ادبی تنظیم 'گفتگو' کے زیر اہتمام منعقد پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے جسٹس اشوک کمار نے کیا۔ بطور مہمان خصوصی اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ اکبرالہ آبادی کی شاعری میں الہ آباد کی مخصوص شناخت پوشیدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اکبرالہ آبادی کو ٹھیک سے پڑھنا چاہیے۔ اس موقعے پر 7 لوگوں کو شان الہ آباد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جن میں افتخار احمد پپو، سردار جوگیندر سنگھ، نیل کانت، راجندر کمار تیواری عرف دکان جی، اتل یدونشی، ڈاکٹر ارتیا دکشت، ڈاکٹر سونیا سنگھ شامل ہیں۔ ساتھ ہی امتیاز احمد غازی کی ادارت میں صدی کے مشہور شاعر وجے لکشمی وبھا کی کتاب 'ہم ہیں ملک کے پہرے دار' اور جیا موہن کی کتاب 'روٹھا بسنت' کا اجرا بھی کیا گیا۔ تنظیم گفتگو کے صدر امتیاز احمد غازی نے کہا کہ اکبرالہ آبادی کی شاعری کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ ان کی غزلوں کو عظیم نغمہ نگاروں نے اپنی خوبصورت آواز میں ڈھالا ہے۔ ڈاکٹر طاہرہ پروین نے کہا کہ اکبر کے دور میں دو تہذیبوں میں ٹکراؤ پیدا ہو رہا تھا۔ انگریزیت اور ہندوستانی تہذیب کا ٹکراؤ تھا جس کی وجہ سے اکبر نے اس موضوع پر کافی شاعری کی ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہد نے کہا کہ اکبر کی شاعری ہمارے لیے ایک نظیر ہے کہ وقت کے ساتھ کیسی شاعری کی جاتی ہے۔ حکیم رشادالاسلام نے اس موقعے پر اکبرالہ آبادی سے معنون ایک خط جاری کیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر اسلم الہ آبادی نے کی اور نظامت کے فرائض من موہن سنگھ تنہا نے انجام دیے۔ اہم شرکا میں نریش مہارانی، پربھاشنکر شرما، ارچنا جیسوال، عشق سلطان پوری، ڈاکٹر نیلما مشرا، سیواجی یادو، وجے پرتاپ سنگھ، ڈاکٹر راکیش کمار طوفان الہ آبادی، افسر جمال، شیو پوجن سنگھ، نجے ساگر کے علاوہ متعدد شعرا نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر............ بتاریخ............ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

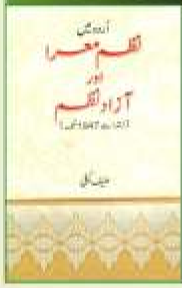

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

طب القانون وعلم السموم

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 666

قیمت: 295 روپے

اچھی صحت کا راز

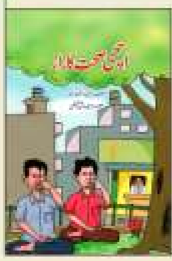

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

کلیاتِ ذوق

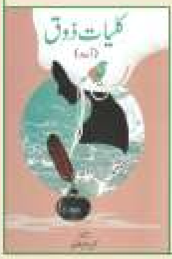

مرتبہ: تنویر احمد علوی

پانچویں طباعت: 2021

صفحات: 456

قیمت: 240 روپے

کلیات امور طبیعیہ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اسکرپٹ رائٹنگ عملی ہدایت نامہ

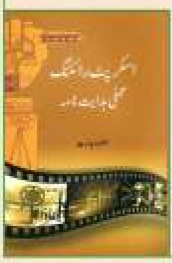

مصنف: اصغر وجاہت

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, नवम्बर-२०२१,वर्ष:२३, अंक:११
URDU DUNIYA Monthly, November-2021, Vol.23, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکرانگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6